اپنے موضوع کے اعتبار سے انوکھی کتاب
آیاتِ متعارضہ
اور
اُن کا حل
قرآن کریم کی مقدس آیات کے درمیان ظاہری تعارض کے بہترین حل کا مدلل مجموعہ
تعارض کے تفصیلی جوابات
رفع تعارض کے سلسلے میں آیات کی تفسیر
رفع تعارض کے درمیان مختلف قرأتوں کی وضاحت
مشکل مقامات کا آسان اور تسلی بخش حل
معترضین کے اعتراضات کے مدلل اور مسکت جوابات
ایک ایسی کتاب جو ہر طالب علم اور مدرس کی ضرورت
تعارض کی اجمالی وضاحت
تالیف
حضرت مولانا محمد انور صاحب گنگوہی
خادم حدیث وتفسیر جامعہ اشرف العلوم گنگوہ
زمزم پبلشرز

اپنے موضوع کے اعتبار سے انوکھی کتاب

قرآن کریم کی متعارض آیات [illegible]

کتاب کی نمایاں خصوصیات

- تعارض کے تفصیلی جوابات
- رفعِ تعارض کے سلسلہ میں آیت کی تفسیر
- رفعِ تعارض کے درمیان مختلف اقوال کی وضاحت
- مشکل مقامات کا آسان اور تسلی بخش حل
- مستشرقین کے اعتراضات کے مدلل اور مسکت جوابات
- ایک ایسی کتاب جو ہر طالب علم اور مدرس کی ضرورت

تالیف:

حضرت مولانا محمد انور صاحب گنگوہی

[illegible]

زمزم پبلشرز

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ	پارہ
	۳۴۹	(۳)

عرضِ ناشر

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی وہ عظیم کتاب ہے جو اللہ رب العزت نے اپنے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی ہر مسلمان پر اللہ کے بندہ اور نبی کے امتی ہونے کی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ اس کتاب کی تلاوت کرے اور ان آیات کے ذریعے اللہ رب العزت جو کچھ اس میں فرمارہے ہیں اس کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

قرآن کریم کی تفسیر کے مطالعہ کے وقت بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کی ایک آیت کا مفہوم دوسری کے معارض ہے جس کے حل کے لئے بڑی بڑی تفاسیر کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی ہے جو ہر آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ حضرت مولانا محمد انور صاحب گنگوہی مظاہری (استاذ حدیث و تفسیر اشرف العلوم گنگوہ) نے اس اہم ضرورت کو محسوس کرکے معترضین و بے دینی قوتوں کو دندان شکن جواب دینے کے لئے کلام پاک کی ان تمام ظاہری تضاد وشک وشبہ میں ڈالنے والی آیتوں کو ۱۱۵ مضامین بعنوانات کے تحت جمع کرکے مستند تفاسیر وکتب سے ان معترضین کو اس کا جواب کردیا ہے حتی کہ اب ایک معمولی طالب علم بھی اس کتاب کی بدولت ہر معترض کو دندان شکن جواب دے سکتا ہے۔ جو اس سے قبل بڑے بڑے علماء کے لئے بھی مشکل و باعث تشویش تھا۔ ہماری معلومات کی حد تک اس موضوع پر اردو میں الحمدللہ یہ پہلی کتاب ہے جو اس تفصیل کے ساتھ ہے۔ پاکستان میں پہلی بار زمزم پبلشرز کراچی اعلیٰ وجدید کمپوزنگ کے ساتھ شائع کررہے ہیں۔

امید ہے کہ اہل علم اس کتاب کی قدر و ہمت افزائی فرمائیں گے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ اپنی دعاؤں میں مؤلف، ناشر و معاون کو یاد رکھیں۔

زمزم پبلشرز کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

التصدیر

الحمد للہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین، امابعد:

خدائے عزوجل کا بے انتہا شکر و احسان ہے کہ اس نے قرآن مقدس کی ایک صغیر مگر مبارک خدمت کا موقع عنایت فرمایا۔ یہ ناچیز اقل و بنیم قلیل العلم و العمل ناکارہ و عبد ضعیف اس لائق کہاں تھا کہ اس خدمت کے لئے خامہ فرسائی کرتا، یہ تو فقط میرے مولائے واہب التوفیق کا کرم ہے، ورنہ

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل
نسیم صبح تیری مہربانی

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ قرآن کریم خداوند قدوس کا ایک ایسا قیم مستقیم کلام ہے جو ہر قسم کے اختلاف و اختلال، تعارض و تناقض سے کلیۃً منزہ و مقدس ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۜ قَيِّمًا﴾ (سورۃ الکہف، ۱۸: ۱)

ترجمہ: "وہ خدا مستحق ہر حمد ہے جس نے اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایسی کتاب نازل فرمائی جس میں کسی قسم کی کجی نہیں ہے۔"

نہ اس میں تعارض و اختلاف ہے، نہ تناقض و اضطراب ہے بلکہ حق تعالیٰ نے اس کو قیم و مستقیم بنایا ہے۔

درحقیقت تعارض و تناقض تو اس شخص کے کلام میں ممکن ہے جس پر نسیان طاری

ہوتا ہو، جس کا علم ناقص و ناتمام ہو، جس کو یہ خبر نہ رہے کہ میں نے اس سے قبل کیا کہا تھا اور اب کیا کہہ رہا ہوں اور آئندہ مجھے کیا کہنا ہے، جس کے فکر و دماغ پر الجھنیں سوار ہوں، امور مختلط اس کے ذہن و قلب میں گشت کرتے رہتے ہوں ایسے شخص کی گفتگو میں تعارض و تناقض ہونا ایک لازمی امر ہے، بخلاف ذات خداوند قدوس کے کہ وہ تو نسیان و ذہول اور جملہ عیوب و نقائص سے مطلقاً منزہ و مبرا ہے، وہ تو عالم الغیب والشہادۃ ہے، جس کی صفت و شان: يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ہو، جس کو ماضی و حال اور استقبال کی پوری پوری خبر ہو، بھلا اس کے کلام میں تعارض و اختلال ہو سکتا ہے؟ یہ ایک امر ناممکن اور محال ہے۔

ہاں! جن آیات میں تعارض معلوم ہوتا ہے یہ صرف ظاہر نظر کی بات ہے، ہماری عقول و افکار کی کوتاہی ہے۔ ورنہ نظر عمیق کے بعد یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ کسی آیت کا کسی آیت سے کوئی تعارض نہیں ہے۔

حق تعالیٰ جزائے خیر دے ہمارے ان محققین، مفسرین حضرات کو جنہوں نے نقول صحیحہ اور عقول سلیمہ کی روشنی میں آیات متعارضہ میں تطبیقات بیان فرمائی ہیں اور ایسی ایسی توجیہات ذکر فرمائیں کہ جن کے بعد کوئی آیت کسی آیت کے معارض نہیں رہتی، البتہ یہ توجیہات و تطبیقات کتب تفسیر میں اپنے اپنے مقام پر کہیں اشارۃً و اجمالاً، کہیں قدرے توضیح و صراحت کے ساتھ متفرق و منتشر موجود ہیں، بعض مقامات پر بہت مختصر سی عبارت سے دفع تعارض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس سے ذہن جلدی سے اس طرف منتقل نہیں ہوتا کہ تعارض کی نوعیت کیا تھی اور وہ دفع کس طرح ہوا۔

بندہ کی نظر سے کوئی کتاب یا رسالہ اس قسم کا نہیں گزرا جس میں تمام آیات متعارضہ کے تعارض کی تشریحات اور اس کے دفعیہ کے لئے جملہ توجیہات و تطبیقات کو یکجا جمع کیا گیا ہو، اس لئے ارادہ ہوا کہ ایک مختصر سا رسالہ ایسا تالیف کیا جائے جس

میں آیاتِ متعارضہ کو جمع کر کے ان کے مابین تعارض کی تشریح کی جائے، پھر اس تعارض کے وہ تمام جوابات جو کتب تفسیر میں اشارۃً یا صراحۃً متفرق و منتشر طور پر موجود ہیں ان کو آسان عبارت میں توضیح و تفصیل کے ساتھ، بحوالہ کتب جمع کر دیا جائے تاکہ علم تفسیر خصوصاً ترجمہ قرآن پاک، جلالین شریف وغیرہ پڑھنے پڑھانے والے طلبہ و مدرسین حضرات کے لئے سہولت و آسانی ہو جائے۔ الحق تعالیٰ شانہ نے فضل وکرم سے اس ارادہ کو تقویت بخشی، خدا کا نام لے کر اور اس ذات حق سے چالیس دن میں تکمیل کر دینے کی دعا کر کے ۲۹ ربیع الآخر ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۸ نومبر ۱۹۹۰ء پنجشنبہ کے روز اس کام کو شروع کیا، حق سبحانہ کا فضل شامل حال رہا کہ تدریسی و دفتری مشغولیت کے باوجود چالیس روز میں ۸ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۹۹۰ء بروز پنجشنبہ بعد نماز ظہر اس رسالہ کی تالیف سے فراغت میسر آگئی۔ فللّٰہ الحمد والمنۃ۔

این سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

دعا ہے کہ حق تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے، خطایا و زلات کو معاف کرے، مطالعہ کنندگان کے لئے نافع و مفید بنا کر بندہ کے لئے اس کو ذریعہ نجات اور توشہ آخرت بنائے۔ آمین، یا رب العالمین۔

احقر العباد
(حضرت مولانا) محمد انور گنگوہی عفا اللہ عنہ
استاذ الحدیث والتفسیر اشرف العلوم گنگوہ
ضلع۔ سہارنپور یوپی انڈیا

ملاحظات

❶ سب سے پہلے آیاتِ متعارضہ کو نمبر وار ذکر کیا گیا ہے، پھر چونکہ آیات میں تعارض ہوجانے کی صورت میں ان کے مضامین مختلف ہوجاتے ہیں اس لئے ایک مضمون کی جملہ آیات کو ایک طرف ذکر کرکے اس طرح کی" ✦ "علامت لگا دی گئی ہے، اس کے بعد دوسرے مضمون کی جملہ آیات لکھی گئی ہیں، مثلاً: بارش آسمان سے ہوتی ہے یا بادلوں سے، اس بارے میں آیات متعارض ہیں، پس اولاً قرآن میں جہاں جہاں بھی نزولِ ماء من السماء، کے مضمون کی آیات ہیں ان سب کو یکجا جمع کیا گیا، اس کے بعد" ✦ "علامت لگا کر وہ تمام آیات ذکر کی گئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بارش بادلوں سے ہوتی ہے اور اگر تین قسم کے مضامین کی آیات ہیں تو دوسرے مضمون کی آیت کے بعد وہی علامت مذکورہ لگا کر تیسرے مضمون کی آیات کو ذکر کیا گیا ہے۔

❷ ہر آیت کے ساتھ پارہ نمبر، رکوع نمبر، سورت کا نام اور تفسیر جلالین پڑھنے، پڑھانے والوں کی سہولت کی خاطر ہر آیت کے ساتھ جلالین شریف کا صفحہ نمبر بھی درج کیا گیا ہے۔

❸ چونکہ بسا اوقات آیات میں تعارض مخفی ہوتا ہے اس لئے آیات کے ذکر کے بعد تشریحِ تعارض کا عنوان دیکر سمجھایا گیا ہے کہ ان آیات میں تعارض کس طرح ہے؟

❹ اس کے بعد دفعِ تعارض کے عنوان کے ذیل میں اس تعارض کے جوابات دیئے گئے ہیں، یعنی وہ توجیہات وتطبیقات بیان کی گئی ہیں جن سے تعارض مرتفع ہوجاتا ہے اور بہت سے مقامات پر روایاتِ صحیحہ سے توجیہات کی تائیدات پیش

کی گئی ہیں، تقریباً ہر جواب کے آخر میں ان کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے جن سے
وہ جواب ماخوذ یا مستنبط ہے۔

❺ تعارض کے جوابات کو نمبر وار ذکر کیا گیا ہے، ان کے نمبرات سیاہ رنگ میں سفید اس طرح "❶" ڈالے گئے ہیں، البتہ ایک ہی جواب کے ذیل میں اگر متعدد تاویلات آگئی ہیں تو ان کے نمبرات سیاہ رنگ کے بجائے سادہ انداز میں اس طرح "①" ڈال دیے گئے ہیں تاکہ امتیاز باقی رہے۔

❻ رسالہ ہذا میں آیات کا ترجمہ اور تفسیر بیان کرنے کا مستقل اہتمام و التزام نہیں کیا گیا ہے کیونکہ یہ چیز ہمارے موضوعِ بحث سے خارج ہے، البتہ بہت سے مقامات پر دفعِ تعارض کے ذیل میں آیات کی اچھی خاصی تفسیر سامنے آگئی ہے۔

❼ شروع میں ایک فہرست دی گئی ہے جس میں آیاتِ متعارضہ کے مضامین کے عنوانات مع صفحات ذکر کیے گئے ہیں اور ہر تعارض کے کتنے جوابات دیے گئے ہیں اس تعداد کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

❽ یہ تیسرے ایڈیشن میں ہے، دوسرے ایڈیشن میں جو ضمیمہ کا فاضل مصنف نے اضافہ کیا تھا وہ اب اصل کتاب کے ساتھ ملحق کر دیا گیا ہے، اور ضمیمہ سے قبل مصنف علام نے جو عربی عبارت لکھی تھی وہ اب کتاب کے آخر میں شامل ہے۔ اور کل ۹۸۵۱ غلطیوں کے اعتراض کا جواب اسی میں شامل ہے۔

از مؤلف عفا اللہ عنہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنِ مقدس کن لوگوں کے لئے ہدایت ہے؟

پارہ ۱، ۲۱، ۱۱، ۲

آیات

(۱) ﴿ الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴾۔

(پ۱، ر۱، سورۂ بقرہ، جلالین ص:۳)

(۲) ﴿ الٓمّٓ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِیْنَ ﴾ ✦

(پارہ ۲۱، رکوع ۱۰، سورۂ لقمان، جلالین ص:۳۴۵)

(۳) ﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴾ (پارہ ۱۱، رکوع ۱۱، سورۂ یونس، جلالین ص:۱۷۵) ✦

(۴) ﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾۔

(پارہ ۲، رکوع ۷، سورۂ بقرہ، جلالین ص:۲۶)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ۱ و ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پاک صرف خواص مومنین یعنی اہل تقویٰ اور نیک لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور آیت نمبر ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ عام مومنین کے لئے ہدایت و رحمت ہے اور آیت نمبر ۴ میں ارشاد ہے "هُدًى لِّلنَّاسِ" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے مومن ہو یا کافر، متقی و صالح ہو یا فاسق و فاجر، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

① درحقیقت قرآن پاک چشمۂ ہدایت تو تمام ہی انسانوں کے لئے ہے جو بھی اس کو دیکھے اور پڑھے، اس کے مضامین ومعانی میں غور وتدبر کرے، وہ ہدایت پا سکتا ہے مگر پہلی تین آیات میں جو متقین، محسنین اور مؤمنین کی تخصیص کردی گئی، وہ ایک تو اس وجہ سے کہ اس شمعِ ہدایت سے فیض یافتہ ہونے والے اور اس نورِ ہدایت سے روشنی حاصل کرنے والے یہی حضرات ہیں، اگرچہ استفادہ میں فرقِ مراتب ہے کہ اعلیٰ تقویٰ اور نیک لوگوں نے اعلیٰ درجہ کا استفادہ کیا ہے اور عوام مؤمنین کا استفادہ ان سے کم درجہ کا ہے مگر نفسِ استفادہ میں سب مشترک ہیں، دوسرے ان حضرات کی شرافت وکرامت کی وجہ سے کہ حق تعالیٰ نے ان کو ایمان وتقویٰ اور نیکی کی دولت سے مشرف فرمایا، یہ عزت وسعادت ان کو بخشی، پس ان کی مدح سرائی کرتے ہوئے فرمایا هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ، هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ، هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ، ورنہ تو اس قرآن مقدس کا ہدایت ہونا ہر شخص کے حق میں عام ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (تفسیر ابو السعود، تفسیر کبیر، خازن وغیرہ)

② ہدایت کے دو معنی ہیں: اول۔ اراءۃ الطریق (صرف راستہ دکھلا دینا خواہ مقصود تک رسائی ہو یا نہ ہو) دوم۔ ایصال الی المطلوب (مقصود تک پہنچا دینا) قرآن کریم میں دونوں صفتیں موجود ہیں، صفتِ اراءۃ الطریق تو ہر شخص کے حق میں عام ہے، قرآن نے حق وباطل کا راستہ سب کے سامنے صاف صاف واضح کر دیا ہے، اسی کو فرمایا "هُدًى لِّلنَّاسِ" مگر صفتِ ایصال الی المطلوب حضرات مؤمنین، محسنین ومتقین کے حق میں مخصوص ہے، یہ حضرات قرآن پاک کی تعلیمات کو اختیار کر کے مقصدِ اصلی تک پہنچ گئے، اسی کو فرمایا گیا هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ، هُدًى لِّلْمُحْسِنِيْنَ، هُدًى لِّلْمُؤْمِنِيْنَ پس آیت ۱ و ۲ و ۳ میں ہدایت بمعنی ایصال الی المطلوب ہے اور آیت ۴ میں بمعنی اراءۃ الطریق ہے۔ فلا تعارض۔ (تفسیر کبیر)

بارش آسمان سے ہوتی ہے یا بادلوں سے؟

پارہ نمبر: ۱، ۲، ۷، ۸، ۱۱، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸،
۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۳۰

آیات

(۱) ﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾ (پارہ ۱، رکوع ۳، سورۃ البقرہ، جلالین ص ۶)

(۲) ﴿وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾
(پارہ ۲، رکوع ۴، سورۃ البقرہ، جلالین ص ۲۳)

(۳) ﴿وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ﴾
(پارہ ۷، رکوع ۱۸، سورۃ الانعام، جلالین ص ۱۲۱)

(۴) ﴿اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ﴾
(پارہ ۱۱، رکوع ۸، سورۃ یونس، جلالین ص ۱۷۲)

(۵) ﴿اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِیَةٌۢ بِقَدَرِهَا﴾
(پارہ ۱۳، رکوع ۸، سورۃ الرعد، جلالین ص ۲۰۲)

(۶) ﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾
(پارہ ۱۳، رکوع ۱۷، سورۃ ابراہیم، جلالین ص ۲۰۹)

(۷) ﴿وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ﴾
(پارہ ۱۴، رکوع ۲، سورۃ الحجر، جلالین ص ۲۱۲)

(۸) ﴿وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾
(پارہ ۱۴، رکوع ۱۴، سورۃ النحل، جلالین ص ۲۲۱)

(۹) ﴿وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ﴾

(پارہ ۱۵ رکوع ۱۸ سورۂ کہف جلالین ص: ۲۴۲)

(۱۰) ﴿وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّن نَّبَاتٍ شَتَّىٰ﴾

(پارہ ۱۶ رکوع ۱۱ سورۂ طٰہٰ جلالین ص ۲۶۳)

(۱۱) ﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَتُصْبِحُ الْأَرْضُ مُخْضَرَّةً﴾

(پارہ ۱۷ رکوع ۱۵ سورۂ حج جلالین ص: ۲۸۵)

(۱۲) ﴿وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ﴾ (پارہ ۱۸ رکوع ۱ سورۂ مؤمنون جلالین ص: ۲۸۷)

(۱۳) ﴿وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا﴾ (پارہ ۱۹ رکوع ۳ سورۂ فرقان جلالین ص ۳۰۷)

(۱۴) ﴿أَمَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنزَلَ لَكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً﴾

(پارہ ۲۰ رکوع ۱ سورۂ نمل جلالین ص: ۳۲۲)

(۱۵) ﴿وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّن نَّزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ﴾

(پارہ ۲۱ رکوع ۲ سورۂ عنکبوت جلالین ص ۳۳۰)

(۱۶) ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً﴾

(پارہ ۲۱ رکوع ۶ سورۂ روم جلالین ص: ۳۴۲)

(۱۷) ﴿وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ﴾

(پارہ ۲۱ رکوع ۱۰ سورۂ لقمان جلالین ص: ۳۴۶)

(۱۸) ﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ﴾

(پارہ ۲۲ رکوع ۱۶ سورۂ فاطر جلالین ص: ۳۶۲)

(۱۹) ﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ﴾

(پارہ ۲۳ رکوع ۱۲ سورۂ زمر جلالین ص ۳۸۷)

(۲۰) ﴿وَالَّذِي نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَنشَرْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا﴾

(پارہ ۲۵ رکوع ۷ سورۂ زخرف جلالین ص: ۴۰۶)

(۲۱) ﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ﴾

(پارہ: ۲۶ رکوع: ۱۵ سورۂ ق جلالین ص: ۴۲۹)

(۲۲) ﴿حَتّٰىٓ اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ﴾

(پارہ: ۸ رکوع: ۱۳ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۳۳)

(۲۳) ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ﴾ (پارہ: ۱۸ رکوع: ۱۳ سورۂ نور جلالین ص: ۳۰۰)

(۲۴) ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ﴾

(پارہ: ۲۱ رکوع: ۸ سورۂ روم جلالین ص: ۳۴۳)

(۲۵) ﴿ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۱۵ سورۂ واقعہ جلالین ص: ۴۴۸)

(۲۶) ﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا﴾

(پارہ: ۳۰ رکوع: ۱ سورۂ نبا جلالین ص: ۴۸۷)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۲۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ بارش آسمان سے ہوتی ہے اور آیت ۲۲ تا ۲۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ بارش بادلوں سے ہوتی ہے، چنانچہ آیت ۲۲، ۲۳، ۲۴ میں تو سحاب کی تصریح ہے اور يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فرمایا گیا ہے کہ بارش بادلوں کے درمیان سے نکلتی ہے اور آیت نمبر ۲۵ و ۲۶ میں مُزْن اور مُعْصِرَات کا لفظ آیا ہے۔ مزن کے معنی پانی سے بھرا ہوا سفید بادل، اور معصرات ان بادلوں کو کہا جاتا ہے جن کے برسنے کا وقت قریب آ گیا ہو، ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ بارش بادلوں سے ہوتی ہے، پس پہلی اکیس آیات اور اخیر کی ان پانچ آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ پہلی آیات میں سماء سے مراد سحاب ہے، ہر اس شیٔ کو جو جہت علو میں ہوتی ہے سماء سے تعبیر کر دیا جاتا ہے جیسے مکان کی چھت وغیرہ، کہا جاتا ہے "کُلُّ مَا عَلَاکَ فَهُوَ سَمَاءٌ" ہر وہ شیٔ، جو تیرے اوپر ہے وہ آسمان ہے، پس چونکہ سحاب بھی جہت علو میں ہوتا ہے اس لئے اس کو سماء سے تعبیر کر کے "اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً" کہہ دیا گیا، ورنہ در حقیقت بارش بادلوں ہی سے ہوتی ہے اس لئے ان آیات میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

❷ بارش تو بادلوں ہی سے ہوتی ہے مگر اس کا سبب تاثیرات سماویہ ہیں چنانچہ سورج جو کہ آسمان میں ہے اس کی شعاعیں سمندروں پر پڑتی ہیں جن کی حرارت سے پانی بخارات (بھاپ) بن کر اٹھتا ہے، پھر یہ بخارات ہوا کے طبقہ ثالثہ میں پہنچ کر جمع ہو جاتے ہیں اور جب زیادہ بوجھل ہو جاتے ہیں تو قطرات بن کر برسنے لگتے ہیں، پس جب تک وہ بخارات جمع رہتے ہیں ان کو بادل کہا جاتا ہے اور جب برسنے لگتے ہیں تو بارش کہتے ہیں تو چونکہ بادلوں سے بارش برسنے کا سبب آسمانی تاثیرات ہیں اس لئے مجازاً آسمان کی طرف نسبت کر دی گئی، پس پہلی آیات مجاز پر اور اخیر کی آیات حقیقت پر محمول ہیں۔ فاندفع التعارض۔ (روح المعانی)

❸ بارش آسمان سے ہوتی ہے اور بادل درمیان میں واسطہ ہیں، اولاً پانی آسمان سے بادلوں پر نازل ہوتا ہے، پھر بادل کے سوراخوں میں سے چھن چھن کر زمین پر برستا ہے، حق تعالیٰ نے بادلوں کو بارش کے لئے چھلنی بنا دیا ہے لہٰذا ان آیات میں کوئی تعارض نہیں، اس توجیہ کی تائید حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشاد سے ہوتی ہے لَوْلَا السَّحَابُ حِيْنَ يَنْزِلُ الْمَطَرُ مِنَ السَّمَاءِ لَأَفْسَدَ مَا يَقَعُ عَلَيْهِ مِنَ

الْاَرْضِ" کہ جس وقت آسمان سے بارش برستی ہے مگر درمیان میں بادل نہ ہوتے تو پانی زمین کے جس مقام پر بھی گرتا اس کو تباہ کر دیتا۔ یعنی آسمان سے پانی موٹی دھار بن کر نہایت تیزی کے ساتھ گرتا ہے مگر بادل اس کو روک لیتے ہیں، پھر وہ بادل کے سوراخوں سے چھن چھن کر ہلکی رفتار کے ساتھ قطرات بن کر اور باریک باریک دھار بن بن کر برستا ہے، اگر بادل نہ ہوتے اور پانی موٹی دھار بن کر پوری تیزی کے ساتھ براہ راست زمینوں اور مکانوں وغیرہ پر گرتا تو سب چیزوں کو ہلاک و تباہ کر ڈالتا، یہ تو حق تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے درمیان میں بادلوں کو واسطہ بنا دیا ہے۔ (صاوی)

اہلِ عرب کو قرآن کی کتنی سورتوں کا مثل پیش کرنے کا چیلنج کیا گیا تھا؟

پارہ نمبر: ۱، ۱۱، ۱۲، ۱۵، ۲۷

آیات

① ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾
(پارہ ۱، رکوع ۳، سورۃ البقرۃ، جلالین ص ۶)

② ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ﴾
(پارہ ۱۱، رکوع ۹، سورۃ یونس، جلالین ص ۱۷۴)

③ ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ﴾
(پارہ ۱۲، رکوع ۲، سورۃ ہود، جلالین ص ۱۸۰)

④ ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ﴾ (پارہ ۱۵، رکوع ۱۰، سورۃ بنی اسرائیل، جلالین ص ۲۳۸)

⑤ ﴿فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ﴾
(پارہ ۲۷، رکوع ۳، سورۃ الطور، جلالین ص ۴۳۴)

تشریحِ تعارض

ان آیات میں حق تعالیٰ شانہ نے فصاحت و بلاغت پر ناز کرنے والے مشرکین عرب بلکہ دنیا کے تمام انسانوں کو خطاب کرتے ہوئے چیلنج کیا ہے کہ اگر تمہیں اس قرآن مقدس کے منجانب اللہ ہونے میں شک ہے اور تمہارا گمان یہ ہے کہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنی طرف سے بنا کر پیش کر دیا ہے تو تم بھی تو بڑے فصیح و بلیغ مانے جاتے ہو ذرا قرآن جیسا کوئی کلام پیش کر کے دکھا دو اور تم تنہا نہیں بلکہ

جتنے مددگاروں کو تم بلا سکتے ہو بلا لو اور سب مل کر قرآن پاک کا مثل پیش کر کے دکھادو، مگر یاد رکھو اگر ساری دنیا کے انسان و جنات مل کر بھی قرآن کا مثل پیش کرنا چاہیں تو ہرگز نہیں کر سکتے۔

لیکن ان آیات میں سے آیت نمبر ا و ۲ میں تو ایک سورت کے متعلق چیلنج ہے کہ قرآن جیسی ایک سورت ہی بنا کر دکھادو، تم ایک سورت بھی نہیں بنا سکتے، اور آیت نمبر ۳ میں ہے کہ قرآن جیسی دس سورتیں پیش کر دو اور آیت نمبر ۴ و ۵ میں بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْآنِ اور بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ کہہ کر پورے قرآن کے متعلق چیلنج کیا گیا ہے پانچویں آیت میں حدیث سے مراد قرآن ہی ہے، مطلب یہ ہے "فَلْيَأْتُوا بِقُرْآنٍ مِّثْلِهِ" کہ قرآن جیسا پیش کر کے دکھادو۔ یا حدیث کے معنی مطلق بات، کہ قرآن جیسی کوئی ایک بات مثلاً ایک چھوٹی سی آیت یا ایک چھوٹا سا جملہ پیش کر دو۔ بہر حال ان آیات میں قرآن کا مثل پیش کرنے کی مقدار کے بارے میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

1 حق تعالیٰ شانہ نے اولاً تو پورے قرآن کا مثل پیش کرنے کا چیلنج کیا، جب لوگ اس سے عاجز رہ گئے اور مثل پیش نہ کر سکے تو فرمایا اچھا اگر تم پورے قرآن کا مثل پیش نہیں کر سکتے تو قرآن جیسی دس سورتیں بنا کر لاؤ، پھر جب لوگ اس سے بھی عاجز رہے تو قرآن کی شانِ اعجاز کو اور زیادہ واضح کرتے ہوئے فرمایا "فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ" کہ اگر دس سورتیں نہیں بنا سکتے تو کم از کم ایک ہی سورت کا مثل پیش کر کے دکھادو، اور سورت کو معرف باللام لانے کے بجائے نکرہ لا کر اس طرف اشارہ کیا کہ قرآن کی کسی بھی سورت کا یعنی چھوٹی سے چھوٹی سورت کا مثل پیش کر کے دکھادو، مگر تم قرآن جیسی ایک چھوٹی سی سورت بھی نہیں بنا سکتے اور اگر فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ

میں حدیث سے مراد مطلق ایک آیت یا ایک جملہ ہو تو شانِ اعجازِ قرآنی کی مزید در مزید توضیح کرتے ہوئے چیلنج ہوگا کہ اگر ایک چھوٹی سی سورت پیش نہیں کر سکتے تو چلو اچھا کم از کم قرآن جیسی ایک چھوٹی سی آیت یا ایک چھوٹا سا جملہ ہی بنا کر دکھا دو، مگر تم سے ایک چھوٹی سی آیت بھی نہیں بن سکتی، پس جان لو کہ یہ کسی بشر کا کلام نہیں بلکہ خدائے عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ کا کلام ہے۔

یہ جو ترتیب بیان کی گئی ہے کہ پہلے پورے قرآن کے متعلق، پھر دس سورتوں کے متعلق، پھر ایک سورت کے متعلق چیلنج کیا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ترتیب تلاوت کے اعتبار سے اگرچہ پہلے سورۂ بقرہ، پھر سورۂ یونس، پھر سورۂ ہود، پھر اسراء ہے مگر ترتیب نزول اس کے برعکس ہے، اولاً سورۂ اسراء نازل ہوئی جس میں "بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ" کہا گیا، پھر سورۂ ہود کا نزول ہوا جس میں "فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ" فرمایا، پھر سورۂ یونس اور سورۂ بقرہ نازل ہوئیں جن میں "فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ" فرمایا گیا کیونکہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اولاً ایک سورت کا مثل پیش کرنے کے لئے کہا گیا ہو جب اس سے عاجز ہوگئے تو دس سورتیں بنانے کے لئے فرمایا ہو کیونکہ جو شخص ایک سورت بنانے سے عاجز ہو جائے وہ دس سورتیں بنانے سے بدرجۂ اولیٰ عاجز ہوگا پھر اس کو یہ کہنا کہ "جب تو ایک سورت نہیں بنا سکتا تو دس سورتیں بنا کر پیش کر دے" بے معنی ہوگا۔

جواب کا حاصل یہ نکلا کہ یہ اختلاف زمان پر محمول ہے، متعدد و متعارض چیلنج ایک ہی زمانہ میں نہیں کئے گئے۔ بلکہ مختلف زمانوں میں یکے بعد دیگرے کئے گئے اور جب دو متعارض چیزوں کا زمانہ جدا جدا ہو تو تعارض نہیں رہتا، یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی شخص اپنی تصنیف کے بارے میں چیلنج کرے کہ کوئی اس جیسی کتاب تصنیف کر کے دکھا دے اگر پوری کتاب نہیں لکھ سکتا تو اس جیسی آدھی کتاب لکھ دے، اگر یہ بھی نہیں تو کم از کم ثلث یا ربع یا کم از کم اس کتاب کے کسی ایک مسئلہ کا مثل پیش کر کے دکھا دے اور ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ کوئی تعارض نہیں۔ (صاوی، روح المعانی، تفسیر کبیر)

❷ دوسرا جواب یہ ہے کہ اختلاف زمانی ہی پر محمول ہے مگر صورت اولیٰ کے برعکس ہے۔ چنانچہ ابن عطیہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اولاً ایک سورت پیش کرنے کا چیلنج فرمایا، پھر دس سورتیں پیش کرنے کا، امام مبرد رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی یہی مروی ہے اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ سورۂ یونس جس طرح تلاوت میں سورۂ ہود پر مقدم ہے اسی طرح نزول کے اعتبار سے بھی مقدم ہے۔ علامہ ابن الضریس رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی فضائل القرآن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی نقل کیا ہے، مگر اس پر اشکال ہوتا ہے کہ ایک سورت کے چیلنج کے بعد دس سورتوں کا چیلنج کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ **فَأْتُوا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ** کا مطلب "**فأتوا بسورة من مثله في البلاغة والاشتمال على ما اشتمل عليه من الاخبار عن المغيبات والاحكام و اخوانها**" ہے اور "**فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ**" کا مطلب "**بعشر سُوَرٍ مِّثْلِهٖ في النظم فقط**" ہے یعنی اولاً تو یہ کہا گیا کہ ایک ایسی سورت بناؤ جو الفاظ و معانی، فصاحت و بلاغت میں قرآن کے مثل ہو، نیز جس طرح قرآن غیب کی خبروں، احکام، مواعظ، وعد و وعید وغیرہ پر مشتمل ہے اسی طرح تمہاری بنائی ہوئی سورت بھی ان مذکورہ امور پر مشتمل ہونی چاہئے مگر جب لوگ ان شرائط کے ساتھ سورت پیش کرنے سے عاجز رہ گئے تو فرمایا اچھا اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو دس سورتیں ایسی پیش کردو جو صرف الفاظ میں قرآن کے مثل ہوں اگرچہ ان میں وہ تمام امور مذکورہ نہ ہوں جن پر قرآن مشتمل ہے مگر تم یہ بھی نہیں کر سکتے۔ (روح المعانی)

اس دوسرے جواب میں سورۂ اسراء کی آیت "**قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ**" سے اور سورۂ طور کی آیت "**فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِهٖۤ**" سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا، غالباً اس وجہ سے کہ **بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ** مطلق ہے جو **بِسُوْرَةٍ** اور **بِعَشْرِ سُوَرٍ** دونوں کو شامل ہے، اسی طرح حدیث سے مراد بھی مطلق قرآن ہے جو ایک سورت اور دس سورتوں دونوں کو شامل ہے۔ فافہم۔

تخلیقِ سماوات مقدم ہے یا تخلیقِ ارض؟

پارہ نمبر: ۱، ۲۴، ۳۰

آیات

(۱) ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾

(پارہ ۱ رکوع ۳ سورۂ بقرہ جلالین ص ۷)

(۲) ﴿قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ اِلٰى قَوْلِهٖ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ﴾

(پارہ ۲۴ رکوع ۱۶ سورۂ حم سجدہ جلالین ص ۳۹۷)

(۳) ﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰىهَا اِلٰى قَوْلِهٖ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا﴾ (پارہ ۳۰ رکوع ۴ سورۂ نازعات جلالین ص ۴۸۹)

شرحِ تعارض

آیت نمبر ۱، ۲ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اولاً زمین کو پیدا کیا، اس کے بعد آسمان بنایا اور آیت نمبر ۳ اس کے برعکس پر دلالت کرتی ہے کہ تخلیقِ سما مقدم ہے تخلیقِ ارض پر کیونکہ اس میں ارشاد ہے ”وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا“ کہ زمین کو آسمان کے بنانے کے بعد بچھایا، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دفعیہ کے تین طریقے ہیں:

① تقدیم خلق ارض والی آیات کو اصل قرار دیکر تقدیم سموات والی آیت میں تاویل کی جائے۔

② تقدیم خلق سماوات والی آیات کو اصل قرار دے کر تقدیم ارض والی آیات میں تاویل کی جائے۔

③ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ایسی توجیہ اختیار کی جائے جس سے دونوں قسم کی آیات اصل پر رہیں اور تعارض ختم ہو جائے، ان طرق مذکورہ کے پیش نظر اس تعارض کے بظاہر چار جواب ہیں مگر پہلے دو جوابوں کے تحت مذکورہ تاویلات کو مستقل جواب شمار کر کے آٹھ ہو جائیں گے۔

❶ تقدیم خلق ارض والی آیات اصل اور اپنے ظاہر پر محمول ہیں، یعنی حق تعالیٰ نے اولاً ارض و مافیہا (جبال، اشجار، انہار وغیرہ) کو پیدا فرمایا، اس کے بعد آسمانوں کی تخلیق فرمائی جیسا کہ پہلی دو آیتوں سے معلوم ہو رہا ہے، روایتِ مرفوعہ صحیحہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

﴿عن ابن عباس رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ ان الیهود اتت النبی صلی اللّٰہ تعالٰی علیه وآله وسلم، فسألته عن خلق السموات والارض، فقال علیه السلام: خلق اللّٰہ تعالٰی الارض یوم الاحد والاثنین، وخلق الجبال وما فیهن من المنافع یوم الثلثاء، وخلق یوم الاربعاء الشجر والماء و المدائن والعمران والخراب فهذه اربعة فقال تعالٰی: ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین و تجعلون له اندادا ذالك رب العالمین وجعل فیها رواسی وبارك فیها وقدر فیها اقواتها فی اربعة ایام سواءً للسائلین، وخلق یوم الخمیس السماء، وخلق یوم الجمعة النجوم و الشمس والقمر و الملائکة﴾

(اخرجه ابن جریر طبری وغیرہ، روح المعانی ج ۲۴ ص ۱۰۵)

ترجمہ: ”حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ یہود نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش کے متعلق دریافت کیا تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یکشنبہ اور دوشنبہ کے دن زمین کو پیدا فرمایا اور پہاڑوں کو اور جو ان میں منافع رکھے ہیں ان سب کو سہ شنبہ کے روز پیدا کیا اور چہار شنبہ کے دن درختوں، پانی، شہروں، آبادیوں اور کھنڈرات کو پیدا فرمایا، یہی یہ چار دن ہو گئے۔ اسی کو حق تعالیٰ نے فرمایا ”کیا تم لوگ ایسے خدا کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو روز میں پیدا کر دیا اور تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو، یہی سارے جہاں کا رب ہے اور اسی نے زمین میں پہاڑ بنا دیئے اور اس میں فائدہ کی چیزیں رکھ دیں اور اس میں اس کی غذائیں تجویز کر دیں چار دن میں، پورے ہیں پوچھنے والوں کے لئے“ اور پنجشنبہ کے روز آسمانوں کو پیدا کیا اور جمعہ کے دن ستارے، سورج، چاند اور فرشتے پیدا کئے۔“

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ تخلیق ارض مقدم ہے تخلیق سماوات پر، اسی طرح ایک اور مرفوع روایت ہے:

﴿انه خلق الارض في يوم الاحد والاثنين، وخلق الجبال و الاكام في يوم الثلاثاء، والاشجار في الاربعاء، وخلق السماء في الخميس و الجمعة﴾ (رواہ ابن کثیر مرفوعا، حاشیہ جلالین ص: ۳۹۹)

ترجمہ: ”کہ اللہ نے یکشنبہ اور دوشنبہ کے روز زمین کو پیدا کیا اور سہ شنبہ کے دن پہاڑوں اور ٹیلوں کو بنایا اور چہار شنبہ کے دن درختوں کو اور پنجشنبہ اور جمعہ کے دن آسمانوں کو پیدا کیا۔“

نیز عقلاً بھی یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ زمین بنیاد کی

حیثیت رکھتی ہے اور آسمان چھت کے درجہ میں ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے: "و جعلنا السمآء سقفا محفوظا" اور بنیاد پہلے قائم کی جاتی ہے، بعد میں چھت ڈالی جاتی ہے، لہٰذا تخلیق ارض مقدم ہے تخلیق سماوات پر۔ اکثر مفسرین رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

رہی سورۂ نازعات کی آیت "والارض بعد ذلک دحہا" سو اس میں دو طرح سے تاویل کی گئی ہے:

① الارض سے پہلی تدبر یا تذکر یا اذکر فعل محذوف ہے اور بعد ذلک اس فعل محذوف کا ظرف ہے اور دحہا جملہ مستانفہ ہے اور آیت شریفہ سے یہ بتانا مقصود ہی نہیں کہ زمین کی تخلیق آسمان کی تخلیق کے بعد ہوئی بلکہ اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا اور یاد دلانا مقصود ہے، مطلب یہ ہے کہ جب آپ کو سماوی نعمتوں کی معلومات ہوگئی تو اس کے بعد نعم ارضیہ کو یاد کیجئے، ان میں تدبر و تفکر کیجئے کہ حق تعالیٰ نے زمین کو بچھایا، اس میں سمندروں، دریاؤں اور نہروں کو جاری کیا، اس سے چشمے نکالے اور اس سے نباتات اور اشجار کو نکالا اور اس پر پہاڑ جما دیئے۔

② بعد، مع کے معنی میں ہے، ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے "بعد ذلک" کی تفسیر "مع ذلک" کے ساتھ نقل کی ہے، آیت شریفہ کا مطلب یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ نے کیسی کیسی نعمتیں عطا فرمائی ہیں کہ آسمان بنایا، اس کی چھت کو بلند کیا، اس کو درست کیا، اس کی رات کو تاریک بنایا، اس کے دن کو ظاہر کیا اور صرف یہی نعمتیں نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اور بھی نعمتیں عطا فرمائیں کہ زمین کو بچھایا، اس میں سے پانی اور نباتات کو نکالا، اس پر پہاڑ پیدا کئے، یہ سب چیزیں حق تعالیٰ نے تمہارے اور تمہارے چوپاؤں کے نفع کے لئے پیدا فرمائیں ہیں، پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں تخلیق ارض کے تاخر کو بیان کرنا مقصود ہی نہیں ہے، ان دونوں تاویلات کے بعد آیات میں کوئی تعارض نہیں رہتا۔

۲ تقدیم خلق سماوات والی آیت اصل دراپنے ظاہر پر محمول ہے، یعنی حق تعالیٰ نے اولاً آسمان کو پیدا کیا، اس کے بعد زمین کو پیدا کیا جیسا کہ آیت نمبر ۳ "والارض بعد ذٰلک دحٰھا" سے معلوم ہوتا ہے۔ امام واحدی نے البسیط میں حضرت مقاتل رحمہ اللہ تعالیٰ سے یہی نقل کیا ہے۔ محققین میں سے بہت سے حضرات نے اسی کو اختیار کیا ہے، اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ اکثر ان آیات میں جن میں آسمان و زمین کا ذکر آیا ہے، سماوات کو ارض پر مقدم کیا گیا ہے جیسے "اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ"، "لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ"، "اَلَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ"، "اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" وغیرہ، جب اکثر آیات میں ذکر سماوات مقدم ہے ذکر ارض پر تو معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق سماوات بھی مقدم ہے تخلیق ارض پر، دوسری دلیل یہ ہے کہ حکمت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اشرف کو غیر اشرف پر مقدم کیا جائے اور آسمان ذاتاً وصفتاً دونوں اعتبار سے اشرف ہے، آسمان مقدار میں بھی زمین سے بڑا ہے اور مکان سے بھی اعلیٰ وارفع ہے پس اشرف یعنی آسمان کی تخلیق کا غیر اشرف یعنی زمین کی تخلیق پر مقدم ہونا مطابق مقتضائے حکمت ہے۔ رہی آیت نمبر ۱، و ۲ سو ان میں چار طرح سے تاویل کی گئی ہے:

(۱) ثُمَّ استوی میں لفظ ثم واو کے معنی میں ہے جو مطلق جمعیت کے لئے آتی ہے، مقصود آسمان و زمین دونوں کی نفس تخلیق کو بیان کرنا ہے، تقدیم و تاخیر کے اعتبار سے ترتیب بیان کرنا مقصود نہیں ہے، پس کوئی تعارض نہیں رہا۔

(۲) لفظ ثُمَّ اگر چہ ترتیب مع التراخی کے لئے آتا ہے لیکن تراخی کی دو قسمیں ہیں، تراخی فی الزمان اور تراخی فی الرتبہ، ثُمَّ کا استعمال حقیقۃً تو تراخی فی الزمان کے لئے ہوتا ہے لیکن کبھی کبھار مجازاً تراخی فی الرتبہ کے لئے بھی استعمال کر لیا جاتا ہے، یہاں پر یہ مجازاً تراخی فی الرتبہ کے لئے استعمال ہوا ہے جس سے آسمان کے

بُعدِ رتبی کو بیان کرنا مقصود ہے کہ آسمان کا مرتبہ زمین سے بعید اور اونچا ہے، بعدِ زمانی اور تاخرِ زمانی کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے جیسا کہ آیت شریفہ "فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" میں لفظ ثُمّ تراخی فی المرتبہ کے لئے مستعمل ہے، کہ اس انسان کافر نے گھاٹی کو پار کیوں نہیں کیا اور آپ کو معلوم ہے کہ گھاٹی کیا چیز ہے؟ وہ کسی کی گردن کا غلامی سے چھڑا دینا ہے، یا فاقہ کے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو کھانا کھلانا، یا کسی خاک نشین محتاج کو کھانا کھلانا (یعنی ان احکامِ الٰہیہ مذکورہ کو بجالانا چاہئے تھا) پھر ان لوگوں میں سے ہوجاتا ہے جو ایمان لائے الخ۔

اگر یہاں ثُمّ کو تراخی فی الزمان کے لئے مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ پہلے ان اعمال مذکورہ کو کرنا چاہیے تھا، اس کے بعد ایمان لانا چاہئے تھا، حالانکہ ایمان تو اعمال پر مقدم ہے، اس لئے ثُمّ یہاں مجازاً تراخی فی الرتبہ کے لئے ہے، جس سے ایمان کے بُعدِ مرتبت اور عظمِ شان کو بتلانا مقصود ہے کہ ایمان کا مرتبہ اعمال سے برتر و اعلیٰ ہے، پہلے ایمان لانا چاہئے اس کے بعد اعمال مذکورہ کا پابند ہوجانا چاہئے، بس ایسے ہی ثم استوى الى السماء میں سمجھ لیا جائے کہ آسمان کے بُعدِ رتبی کو بیان کرنا مقصود ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

(۳) تیسری تاویل یہ ہے کہ لفظ خلق ایجاد و تکوین کے معنی میں نہیں ہے بلکہ مجازاً تقدیر اور قضاء کے معنی میں مستعمل ہے، مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ارض و مافیہا کے پیدا کرنے کا فیصلہ فرما دیا کہ عنقریب ارض و مافیہا کو پیدا کردیں گے، ابھی پیدا نہیں فرمایا اس کے بعد آسمانوں کو پیدا کردیا، آسمانوں کے بعد ارض و مافیہا کو جن کے پیدا کرنے کا پہلے فیصلہ فرما چکے تھے پیدا کردیا، اس کو فرمایا "والارض بعد ذلك دحها" اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آیت شریفہ "اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ" میں خلق بمعنی قدّر و قضیٰ مستعمل ہوا

ہے یہاں اگر خلق کو ایجاد و تکوین کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا پھر کہا ''کن'' پس وہ پیدا ہو گئے اور ظاہر ہے کہ یہ مطلب درست نہیں ہے اس لئے کہ پیدا کر دینے کے بعد پھر لفظ ''کن'' سے خطاب کرنا بے سود و بے معنی ہے اس لئے یہاں خلق، قدر اور قضی کے معنی میں ہے، اس صورت میں مطلب بالکل درست ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کرنے کا فیصلہ فرمایا، پھر کہا ''کن'' پیدا ہو جاؤ تو پس وہ پیدا ہو گئے۔

(۴) چوتھی تاویل یہ ہے کہ خلق سے پہلے ارادہ محذوف ہے یعنی ''ھُوَ الَّذِیْ اَرَادَ اَنْ یَّخْلُقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا''۔ ''قُلْ اَئِنَّکُمْ لَتَکْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ اَرَادَ خَلْقَ الْاَرْضِ فِیْ یَوْمَیْنِ'' جیسا کہ ''اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ'' میں ''اِذَا اَرَدْتُّمُ الْقِیَامَ اِلَی الصَّلٰوۃِ'' مراد ہے اور ''فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ'' میں ''اِذَا اَرَدْتَّ الْقِرَاءَۃَ'' مراد ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے آسمان سے قبل زمین کی تخلیق نہیں فرمائی بلکہ تخلیق کا ارادہ فرمایا کہ عنقریب ارض وما فیہا کو پیدا کریں گے، پھر آسمانوں کو پیدا کر دینے کے بعد زمین کے تخلیق کے ارادہ کی تکمیل فرمادی یعنی ارض وما فیہا کو پیدا کر دیا جس کو آیت ثالث میں فرمایا ''وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِکَ دَحٰھَا'' فَانْدَفَعَ التَّعَارُضُ۔ یہ تاویل تیسری تاویل کے قریب قریب ہی ہے۔

(۳) تعارض کا تیسرا جواب یہ ہے کہ دونوں قسم کی آیتوں کو اپنے اصلی اور ظاہر پر رکھتے ہوئے ایسی توجیہ کی جائے کہ تعارض دور ہو جائے، سو وہ توجیہ یہ ہے کہ ہر جسم کا ایک مادہ ہوتا ہے اور ایک صورت و شکل ہوتی ہے، مادہ کے اعتبار سے تو خلق ارض مقدم ہے خلق سماوات پر، جیسا کہ پہلی دو آیتوں میں ہے اور صورت و شکل کے اعتبار سے تخلیق سماوات مقدم ہے تخلیق ارض پر، جیسا کہ آیت نمبر ۳ میں ہے، حاصل اس کا یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے اول زمین کے مادہ کو پیدا کیا جو ایک ڈھیلے[1] کی شکل میں تھا جیسا کہ

(۱) پتھر کا یا اور ایک بڑی تودہ ہے جس کو کسی مٹی ملی ہو وہ چھپے ہیں اور اس کو عربی میں کہا جاتا ہے۔

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، اس کے بعد آسمان کا مادہ بنایا جو دخان کی شکل میں تھا جیسا کہ آیت ۲ میں مصرح ہے "ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ" پھر آسمان کی موجودہ صورت بنائی اور اس کے سات طبقات بنا دیئے، اس کے بعد زمین کے مادہ کو دراز کر کے اس کو موجودہ شکل وصورت عطا فرما دی اور اس کو بچھا کر اس کے اوپر جبال واشجار وانہار وغیرہ پیدا فرما دیئے، پس آیت نمبر ۱، ۲ کا مطلب یہ ہوگا کہ پہلے زمین کا مادہ پیدا کیا، پھر آسمان کا مادہ بنایا اور آیت ۳ کا مطلب یہ ہوگا کہ پہلے آسمان کی صورت بنائی، پھر زمین کی صورت وشکل بنائی، اس توجیہ کے بعد ان آیات میں کوئی تعارض نہیں رہتا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں اسی کو اختیار کیا ہے، اس توجیہ کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے ہوتی ہے۔

﴿عن سعيد بن جبير قال: جاء رجل الى ابن عباس رضي الله تعالى عنه فقال: رأيت اشياء تختلف علي في القرآن، قال: هات ما اختلف عليك من ذلك، فقال: اسمع الله قول: ائنكم لتكفرون بالذي خلق الارض (حتى بلغ) طائعين. فبدأ بخلق الارض في هذه الاية قبل خلق السماء، ثم قال سبحانه في الآية الاخرى: ام السماء بناها، ثم قال: والارض بعد ذلك دحها، فبدأ جل شانه بخلق السماء قبل خلق الارض فقال ابن عباس رضي الله تعالى عنه: اما خلق الارض في يومين فان الارض خُلِقت قبل السماء، وكانت السماء دخانا، فسواهن سبع سموات في يومين بعد خلق الارض، واما قوله تعالى: والارض بعد ذلك دحها، يقول: جعل فيها جبلا، وجعل فيها نهرا، وجعل فيها شجرا، وجعل فيها بحورا﴾

(رواہ ابن ابی حاتم باسناد صحیح، روح المعانی ج ۲۴ ص ۱۰۵)

"سعید بن جبیر رحمہ اللہ تعالیٰ سے مروی ہے فرمایا کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ مجھے کچھ چیزیں قرآن میں متعارض نظر آتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تمہارے کونسی چیز تم کو متعارض معلوم ہوتی ہے۔ میں نے عرض کیا میں سنتا ہوں اللہ عزوجل فرماتے ہیں (ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض یہاں تک کہ اس نے آیت کو طائعین تک پڑھا) اس آیت میں حق تعالیٰ نے آسمان کی تخلیق سے قبل زمین کی تخلیق کو بیان فرمایا۔ پھر حق تعالیٰ نے دوسری آیت میں ارشاد فرمایا (أَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا اس کے بعد فرمایا وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا) اس میں حق تعالیٰ شانہ نے تخلیق ارض سے پہلے تخلیق سماء کو بیان کیا۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا بہرحال خلق الارض فی یومین تو اس کا مطلب تو یہ ہے کہ زمین آسمان سے پہلے پیدا کی گئی اور آسمان ایک دھواں تھا تو زمین کو پیدا کرنے کے بعد (یعنی زمین کا مادہ اور اس کے بعد آسمان کا مادہ یعنی دخان پیدا کرنے کے بعد) اس کو دو دن میں سات آسمان بنائے، اور بہرحال حق تعالیٰ کا ارشاد: وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین میں پہاڑ بنائے، نہریں بنائیں، درخت بنائے، سمندر بنائے۔"

علامہ خفاجی رحمہ اللہ تعالیٰ اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ "اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا" یہ دحاھا سے بدل یا عطف بیان ہے جس سے دحاھا کی تفسیر اور اس سے مراد کو بیان کرنا مقصود ہے، پس اس آیت میں زمین کو آسمان سے مؤخر کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ زمین ذات کے اعتبار سے آسمان سے

موخر ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مافی الارض کے پیدا کرنے کے اعتبار سے زمین متاخر ہے، زمین کی تکمیل گویا بعد میں ہوئی، زمین میں مافی الارض کو پیدا کر کے اس قابل بنایا گیا کہ اس سے انتفاع اور تمتع کیا جائے ورنہ زمین کی نفس ذات کا وجود آسمان سے پہلے ہو چکا تھا۔

لیکن اس پر اشکال یہ ہو سکتا ہے کہ اس توجیہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین کا بچھانا اور اس پر جبال و اشجار و انہار کا پیدا کرنا آسمان کے بعد ہوا اور آیت نمبر ۱، ۲ اور روایت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اوپر گذر چکی ہے اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جبال و اشجار اور انہار کی تخلیق آسمان سے پہلے ہوئی، آیت نمبر ا میں تو فرمایا "خَلَقَ لَكُمْ مَافِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ" جس سے صاف ظاہر ہے کہ جمیع مافی للارض (جبال، اشجار وانہار وغیرہ) کی تخلیق آسمان سے قبل ہوئی اور ان سب چیزوں کی تخلیق زمین کے بچھائے بغیر ممکن ہے، پس معلوم ہوا کہ زمین کا بچھانا بھی آسمان سے قبل ہوا اور آیت نمبر ۲ میں ہے "خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَبَارَكَ فِيْهَا الخ" اس کے بعد فرمایا: "ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ" اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق جبال وغیرہ تخلیق آسمان پر مقدم ہے اور روایت سابقہ میں ہے کہ پہاڑوں کو سہ شنبہ کے دن، درختوں اور نہروں کو چہار شنبہ کے روز اور آسمانوں کو پنج شنبہ کے دن پیدا فرمایا۔ اس میں بھی صاف تصریح ہے کہ خلق جبال وغیرہ مقدم ہے خلق سماء پر، پس یہ توجیہ مذکورہ آیات و روایت کے خلاف ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیات و روایت میں۔ جَمِيْعُ مَافِي الْأَرْضِ (جبال، واشجار وانہار) کے پیدا کرنے سے مراد ان کے اصول اور مادوں کو پیدا کرنا ہے کہ حق تعالیٰ نے زمین کا مادہ پیدا کرنے کے بعد جَمِيْعُ مَافِي الْأَرْضِ کے مادوں کو بھی پیدا کر دیا مگر ان کی تکمیل آسمان کی تخلیق کے بعد فرمائی اور جَمِيْعُ مَافِي الْأَرْضِ کے صرف مادوں کی تخلیق زمین کے بچھائے بغیر بھی ممکن ہے، لہٰذا زمین کا بچھانا آسمان

سے قبل لازم نہیں آئے گا۔

حاصل یہ نکلا کہ اولاً زمین کا مادہ پیدا کیا، پھر مافی الارض (جبال، اشجار و انہار وغیرہ) کا مادہ بنایا، اس کے بعد آسمان کا مادہ پیدا کیا، پھر آسمان کی صورت بنائی اور سات آسمان بنادیے اس کے بعد زمین کی صورت بنائی، اس کو بچھا کر اس پر جبال، اشجار و انہار کی صورتیں پیدا فرما کر زمین کی تکمیل کردی اور اس کو قابلِ انتفاع بنادیا، اب تخلیق کی ترتیب یوں ہوگی:

خلق أولاً مادة الارض، ثم جعل مادة مافي الارض من الرواسي والاشجار والانهار وغيرها، ثم خلق مادة السماء التي هي دخان، ثم خلق صور السموٰت، فَبَنٰهَا، وَرَفَعَ سَمْكَهَا، فَسَوّٰهَا، وَبَعْدَ ذٰلِكَ دَحَى الارض وَبَسَطَهَا وَمَدَّهَا، وَخَلَقَ فِيْهَا الْجِبَالَ وَالْاَنْهَارَ وَالْاَشْجَارَ وَغَيْرَهَا۔

فحصل التوفيق بين الآيات بل بين الروايات ايضا، واندفع التعارض فالحمد لله على ذلك. (هذه الاجوبة الثلاثة والتاويلات المذكورة تحتها ماخوذة من تفسير الخازن والتفسير الكبير و بيان القرآن و روح المعاني وغيرها)

④ تعارض کا چوتھا جواب بعض محققین رحمہم اللہ نے توجیہ مذکور کے برعکس صورت اختیار کرکے دیا ہے کہ مادہ کے اعتبار سے آسمان کی تخلیق مقدم ہے اور صورت کے اعتبار سے تخلیقِ ارض مقدم ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اولاً آسمان کا مادہ بنایا، پھر زمین کا مادہ پیدا کیا، اس کے بعد زمین کی صورت و شکل بنائی، پھر آسمان کی صورت بنائی۔[1] (تفسیر روح المعانی پ ۳۰)

(۱) یہ بظاہر تو چار جوابات ہوئے لیکن جواب اول کے تحت دو جواب ہیں اور جواب ثانی کے تحت چار تاویلات جو ذکر کی گئی ہیں اگر ان کو مستقل جوابات شمار کیے جائیں تو پچھلے دو جواب چھ جواب بن جاتے ہیں اور کل ملا کر آٹھ جوابات ہو جائیں گے کما لا یخفی۔

کفار کو جہنم سے کسی وقت نکالا جائے گا یا نہیں؟

پارۂ لمبیٖن: ۱، ۲، ۳، ۴، ۶، ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۷، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۸، ۲۹، ۳۰

آیات

① ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (پارہ: ۱ رکوع: ۴ سورۂ بقرہ وجلالین ص: ۸)

② ﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (پارہ: ۱ رکوع: ۹ سورۂ بقرہ وجلالین ص: ۱۳)

③ ﴿وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ﴾ (پارہ: ۲ رکوع: ۴ سورۂ بقرہ وجلالین ص: ۲۳)

④ ﴿وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ﴾

(پارہ: ۲ رکوع: ۱۱ سورۂ بقرہ وجلالین ص: ۳۲)

⑤ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ﴾

(پارہ: ۳ رکوع: ۲ سورۂ بقرہ وجلالین ص: ۴۰)

⑥ ﴿وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ﴾

(پارہ: ۳ رکوع: ۶ سورۂ بقرہ وجلالین ص: ۴۳)

⑦ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ اِلٰى قَوْلِهٖ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ﴾ (پارہ: ۴ رکوع: ۳ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۵۸)

⑧ ﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا﴾

(پارہ: ۴ رکوع: ۱۳ سورۂ نساء جلالین ص: ۷۲)

(۹) ﴿يُرِيدُونَ أَن يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ﴾ (پارہ:۶ رکوع:۱۰ سورۃ مائدہ جلالین ص ۹۹)

(۱۰) ﴿لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أَنفُسُهُمْ أَن سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ﴾ (پارہ:۶ رکوع:۱۵ سورۃ مائدہ جلالین ص:۱۰۵)

(۱۱) ﴿وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (پارہ:۸ رکوع:۱۱ سورۃ اعراف جلالین ص:۱۳۲)

(۱۲) ﴿أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّهُ مَن يُحَادِدِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَأَنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا﴾

(پارہ ۱۰ رکوع:۱۳ سورۃ توبہ جلالین ص۔۱۶۲)

(۱۳) ﴿وَعَدَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا﴾

(پارہ ۱۰ رکوع ۱۵ سورۃ توبہ جلالین ص ۱۶۳)

(۱۴) ﴿وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ إِلَى قَوْلِهِ. أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (پارہ:۱۱ رکوع ۸ سورۃ یونس جلالین ص:۱۷۳)

(۱۵) ﴿فَادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ﴾

(پارہ ۱۴ رکوع ۱۰ سورۃ نحل جلالین ص:۲۱۸)

(۱۶) ﴿لَوْ كَانَ هَٰؤُلَاءِ آلِهَةً مَّا وَرَدُوهَا وَكُلٌّ فِيهَا خَالِدُونَ﴾

(پارہ:۱۷ رکوع:۷ سورۃ انبیاء جلالین ص ۲۷۷)

(۱۷) ﴿إِنَّ اللَّهَ لَعَنَ الْكَافِرِينَ وَأَعَدَّ لَهُمْ سَعِيرًا خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾

(پارہ:۲۲ رکوع:۵ سورۃ احزاب جلالین ص ۳۵۸)

(۱۸) ﴿قِيلَ ادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ﴾

(پارہ ۲۴ رکوع ۵ سورۃ زمر جلالین ص ۳۸۰)

(۱۹) ﴿ادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ﴾

(پارہ:۲۴ رکوع:۱۳ سورۃ مومن (غافر) جلالین ص ۳۹۹)

(۳۰) ﴿ ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ﴾
(پارہ:۲۴ رکوع:۱۸ سورۂ حم سجدہ جلالین ص:۳۹۹)

(۳۱) ﴿ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ ﴾ (پارہ:۲۸ رکوع:۳ سورۂ مجادلہ جلالین ص:۴۵۳)

(۳۲) ﴿ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ﴾
(پارہ:۲۸ رکوع:۵ سورۂ حشر جلالین ص:۴۵۶)

(۳۳) ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ (پارہ:۲۸ رکوع:۱۵ سورۂ تغابن جلالین ص:۴۶۳)

(۳۴) ﴿ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴾
(پارہ:۲۹ رکوع:۱۲ سورۂ جن جلالین ص:۴۷۷)

(۳۵) ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ﴾ (پارہ:۳۰ رکوع:۲۳ سورۂ بینہ جلالین ص:۵۰۳) ✦

(۳۶) ﴿ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴾ (پارہ:۲۳ رکوع:۶ سورۂ صٰفٰت جلالین ص:۳۷۶)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۳۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، ان کو جہنم سے نکالا نہیں جائے گا، چنانچہ ان میں سے اکثر آیات میں تو خلود کی تصریح ہے اور آیت نمبر ۳ و ۹ میں ہے "وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ"، "يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنْهَا" کہ کفار جہنم سے نکلنا چاہیں گے مگر وہ نکل نہیں پائیں گے اور اخیر کی آیت نمبر ۳۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کو ماءِ حمیم پلانے کے لئے جہنم سے باہر نکالا جائے گا، پھر جہنم میں لوٹا دیا جائے گا کیونکہ اس آیت سے اوپر کی آیات میں شجرۂ زقوم کا ذکر کرنے کے بعد حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَإِنَّهُمْ لَآكِلُونَ مِنْهَا فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِنْ حَمِيمٍ۔ "سو یہ لوگ شجرۂ زقوم سے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے، پھر ان کو اس پر کھولتا ہوا گرم پانی (پیپ اور لہو میں) ملا کر دیا جائے گا۔" اس کے بعد ارشاد فرمایا: ثُمَّ إِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَإِلَى الْجَحِيمِ۔ پھر ان کو جہنم کی طرف لوٹنا ہوگا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ماءِ حمیم پلانے کے لئے ان کو جہنم سے نکالا جائے گا، پھر جہنم کی طرف لوٹا دیا جائے گا، پس یہ آیت پہلی تینوں آیات کے بظاہر معارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

1. ماءِ حمیم پلانے کے لئے ان کو جہنم سے بالکل نہیں نکالا جائے گا بلکہ جہنم تو چونکہ ایک وسیع و عریض جگہ ہے، اس میں اہلِ جہنم کے لئے مختلف درجات و طبقات ہیں، ہر شخص اپنے اپنے مستقر اور ٹھکانے پر ہوگا، ان کو ان کے مستقر سے نکال کر جہنم کے اندر ہی اندر کسی دوسری جگہ لے جایا جائے گا جہاں ماءِ حمیم کا انتظام ہوگا، وہاں سے ماءِ حمیم پی کر وہ پھر اپنے مستقر کی طرف لوٹ جائیں گے، پس ماءِ حمیم جہنم سے باہر نہیں ہے اور اس کو پینے کے لئے جہنم سے نکلنا لازم نہیں آتا، اور رجوع الی الجحیم سے مراد رجوع الی درکات الجحیم ومستقراتہم ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے، جمہور حضرات اسی کے قائل ہیں۔ (روح المعانی ملخصاً)
2. بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ماءِ حمیم جہنم سے باہر ہے مگر یہ ماءِ حمیم کا پلایا جانا جہنم میں داخلہ سے پہلے ہوگا، ان کو ابتداءً شجرۂ زقوم کھلا کر اور اس پر ماءِ حمیم پلا کر پھر جہنم میں داخل کر دیا جائے گا، اس کے بعد وہ کبھی جہنم سے نہیں نکلیں گے، ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں، مگر یہ توجیہ خلافِ ظاہر ہے۔ (روح المعانی)

آخرت میں کسی شخص کو کسی سے نفع پہنچے گا یا نہیں؟

پارۂ نمبر: ۱، ۱۳، ۲۱، ۲۴، ۲۵، ۲۷، ۳۰

آیات

① ﴿ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا ﴾

(پارہ:۱ رکوع:۹ سورۂ بقرہ جلالین ص:۹)

② ﴿ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا ﴾

(پارہ:۱ رکوع:۱۵ سورۂ بقرہ جلالین ص:۱۸)

③ ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِىْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْئًا ﴾ (پارہ:۲۱ رکوع:۱۳ سورۂ لقمان جلالین ص:۳۴۸)

④ ﴿ يَوْمَ لَا يُغْنِىْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴾

(پارہ:۲۵ رکوع:۱۵ سورۂ دخان جلالین ص:۴۱۲)

⑤ ﴿ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴾ (پارہ:۲۷ رکوع:۷ سورۂ نجم جلالین ص:۴۳۹)

⑥ ﴿ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا، وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴾

✦ (پارہ:۳۰ رکوع:۷ سورۂ انفطار جلالین ص:۴۹۳)

⑦ ﴿ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ﴾

(پارہ:۱۳ رکوع:۹ سورۂ رعد جلالین ص:۲۰۳)

⑧ ﴿ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِىْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ﴾ (پارہ:۲۴ رکوع:۶ سورۂ غافر (مؤمن) جلالین ص:۳۹۱)

⑨ ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾

(پارہ:۲۷ رکوع:۳ سورۂ طور جلالین ص:۴۳۵)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں کوئی شخص کسی شخص کے کام نہ آئے گا، کسی کو کسی سے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا، نہ باپ سے بیٹے کو کوئی نفع پہنچے گا نہ بیٹے سے باپ کو، آیت نمبر ۴ میں ہے کہ کوئی دوست کسی دوست کو نفع نہیں پہنچائے گا آیت نمبر ۵ سے بھی یہی بات مفہوم ہوتی ہے کہ انسان کے اس کی سعی کام آئے گی، کسی دوسرے کی سعی اور عمل سے انسان کو نفع نہیں پہنچے گا، اسی طرح آیت نمبر ۶ میں ہے کہ اس دن کوئی نفس کسی نفس کے لئے نفع کا مالک نہیں ہوگا، غرض کہ ان پانچوں آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے روز کوئی کسی کے کام نہ آئے گا، کسی سے کسی کو نفع نہیں پہنچے گا اور آیت نمبر ۷، ۸ و ۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت میں سے جو لوگ درجات عالیہ پر فائز ہوں گے ان سے ان کے خاندان کے افراد مثلاً: آباء واجداد، ازواج وذریات کو نفع پہنچے گا کیونکہ آیت نمبر ۷ و ۸ میں ارشاد ہے کہ حضرات مؤمنین، صالحین، کاملین کے لئے جنت کے درجات عالیہ ہیں جن میں ان حضرات کے ساتھ ساتھ ان کے آباء واجداد، ازواج وذریات میں سے جو مؤمن ہوں گے وہ بھی انہیں درجات عالیہ میں داخل ہوں گے، اگرچہ ان لوگوں کے اعمال اس درجہ کے نہیں ہوں گے کہ درجات عالیہ کے مستحق ہوتے مگر حضرات کاملین کے اعزاز واکرام اور تعظیم شان کی خاطر ان کے آباء واجداد، ازواج وذریات کو بھی ان کے درجات پر پہنچا دیا جائے گا، تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں اور ان کے سرور وعیش میں اضافہ ہو، چنانچہ روایت میں اس آیت کی تفسیر یہی وارد ہوئی ہے۔

﴿عن ابن جبیر رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ قال: یدخل الرجل الجنۃ، فیقول: این امی؟ این ولدی؟ این زوجتی؟ فیقال: لم یعملوا مثل عملک، یقول: کنت اعمل لی ولھم ثم قرأ الآیۃ......﴾

(رواہ ابن ابی حاتم وابن شیخ، روح المعانی ج ۲۷ ص ۳۳)

ترجمہ: "ابن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آدمی جنت میں داخل ہوگا تو کہے گا میری ماں کہاں ہے؟ میرا بیٹا کہاں ہے؟ میری بیوی کہاں ہے؟ اس سے کہا جائے گا کہ ان لوگوں نے تجھ جیسے اعمال نہیں کئے تھے۔ وہ کہے گا میں نے جو عمل کئے تھے وہ اپنے لئے بھی کئے تھے اور ان کے لئے بھی۔ پھر حضرت ابن جبیر نے یہ آیت پڑھی۔ "جنت عدن یدخلونها ومن صلح. الخ."

دوسری آیت نمبر ۹ میں تو صاف تصریح ہے "الحقنابهم ذریتهم" کہ ان کی ذریت کو ہم انکے ساتھ لاحق کردیں گے ان کے درجے پر پہنچادیں گے۔ اس آیت کی تفسیر بھی روایات میں یہی وارد ہوئی ہے۔

عن ابن عباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال: ان اللّٰہ لیرفع ذریۃ المؤمن معہ فی درجتہ فی الجنۃ، وان کانوا دونہ فی العمل لتقر بہم عینہ، ثم قرأ الآیۃ. اخرجہ سعید بن منصور وھناد و ابن جریر و ابن المنذر و ابن ابی حاتم والبیہقی فی سننہ.

(روح المعانی ج ۲۷ ص ۳۲)

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت میں مومن کی ذریت کو اس کے ساتھ اس کے درجہ میں پہنچا دیں گے اگرچہ عمل کے اعتبار سے وہ اس سے ادنیٰ ہوں گے تاکہ ان کی وجہ سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوجائیں، پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ آیت (وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ) تلاوت فرمائی۔"

ایک اور مرفوع روایت ہے:

عن ابن عباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ انہ قال: ان النبی صلی

اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم قال: اذا دخل الرجل الجنۃ سأل عن ابویہ و زوجتہ وولدہ، فیقال لہ: انھم لم یبلغوا درجتک وعملک. فیقول: یارب قد عملت لی ولھم. فیؤمر بالحاقھم بہ ﴾ (رواہ ابن مردویہ والطبرانی، روح المعانی، ج۱۳، ص ۱۳۲)

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب آدمی جنت میں داخل ہوگا تو اپنے والدین اور بیوی بچوں کے بارے میں سوال کرے گا (کہ وہ کہاں ہیں؟) تو اس سے کہا جائے گا کہ وہ لوگ تیرے درجے اور تیرے عمل کو نہیں پہنچے (یعنی انہوں نے تجھ جیسے اعمال نہیں کئے کہ تیرے درجے پر ان کو پہنچایا جائے، وہ درجات سفلی میں موجود ہیں) وہ شخص کہے گا یا رب میں نے اپنے لئے بھی اعمال کئے تھے اور ان کے لئے بھی تو ان کو اس کے ساتھ ملحق کر دینے کا حکم دیا جائے گا (کہ اس کے والدین اور بیوی بچوں کو بھی اس کے درجات عالیہ میں پہنچا دیا جائے)

صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ ظاہر اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ الحاق سے مراد یہ نہیں ہے کہ کبھی کبھی زیارت وغیرہ کے لئے ان لوگوں کو اس شخص کے درجات عالیہ پر لے جایا جائے گا بلکہ مستقل سکونت عطا کرنا مراد ہے۔ بہرحال ان تینوں آیتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان سے نفع پہنچے گا اور پہلی دو آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا اور کسی کو کسی سے نفع نہیں پہنچے گا، یوں ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ آیت نمبر ۱ "لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ

شَیْئًا۔" میں نفس اولیٰ سے مراد مؤمن، اور نفس ثانیہ سے مراد کافر ہے، مطلب یہ ہے کہ کوئی مؤمن کسی کافر کو نفع نہیں پہنچائے گا، یعنی اگر کسی مؤمن کا کوئی رشتہ دار یا دوست کافر ہوگا تو اس کافر کو اس مؤمن کے اعزاز واکرام میں بخشا نہیں جائے گا اسی طرح آیت نمبر ۳ "لَایَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِہٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ ھُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِہٖ شَیْئًا۔" کا مطلب یہ ہے کہ "لَایَجْزِیْ وَالِدٌ مُؤمِنٌ عَنْ وَّلَدِہِ الْکَافِرِ وَلَا مَوْلُوْدٌ مُؤمِنٌ ھُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِہِ الْکَافِرِ" کہ کوئی مؤمن باپ اپنے بیٹے کافر کے اور کوئی مؤمن بیٹا اپنے کافر باپ کے کام نہ آئے گا، ایسے ہی آیت نمبر ۴ کا مطلب یہ ہے کہ "لَایُغْنِیْ مَوْلًی مُؤمِنٌ عَنْ مَوْلًی کَافِرٍ شَیْئًا" اسی طرح آیت نمبر ۵ میں سعی سے مراد سعی ایمانی ہے، یعنی ہر انسان کو اپنے ایمان سے فائدہ ہوگا دوسرے کا ایمان کارآمد نہیں ہوگا، پس کسی مؤمن کے ایمان سے کافر کو نفع نہ پہنچے گا۔

اسی طرح آیت نمبر ۶ میں نفس ثانیہ سے مراد نفس کافرہ ہے جیسا کہ حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ کوئی شخص کسی کافر کے لئے کسی نفع کا مالک نہیں ہوگا، اور اخیر کی تین آیتوں میں جو ایک شخص کا دوسرے کے لئے نافع ہونا مذکور ہے وہ مؤمنین کے بارے میں ہے کہ ایک مؤمن سے دوسرے مؤمن کو نفع پہنچے گا کیونکہ جنت کا مستحق تو صاحب ایمان ہی ہوتا ہے، البتہ ایک شخص اپنے عمل صالح اور تقویٰ و طہارت کی وجہ سے اپنے اعزہ واقارب کے لئے ترقی درجات کا سبب بن جائے گا، آیت نمبر ۷، ۸ میں "وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِھِمْ" کہا گیا ہے، "مَنْ صَلَحَ" کی تفسیر حضرت ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے "من آمن" کے ساتھ کی ہے، یہی تفسیر حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اور آیت نمبر ۹ میں "وَاتَّبَعَتْھُمْ ذُرِّیَّتُھُمْ بِاِیْمَانٍ" میں ایمان کی قید مصرح ہے، خلاصہ یہ ہوا کہ مؤمن مؤمن کو تو نفع پہنچائے گا مگر کافر کو مؤمن سے کوئی نفع نہیں پہنچے گا۔ فلا تعارض۔

(روح المعانی، مظہری، جمل)

قیامت کے دن کسی کی شفاعت قبول ہوگی یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱، ۱۶، ۱۷، ۲۲، ۲۵، ۲۷

آیات

① ﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾

(پارہ: ۱ رکوع: ۶ سورۂ بقرۃ جلالین ص: ۹)

② ﴿وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾

(پارہ: ۱ رکوع: ۱۵ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۱۸) ✦

③ ﴿لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا﴾

(پارہ: ۱۶ رکوع: ۹ سورۂ مریم جلالین ص: ۲۶۰)

④ ﴿وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ﴾

(پارہ: ۱۷ رکوع: ۲ سورۂ انبیاء جلالین ص: ۲۷۱)

⑤ ﴿وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ﴾

(پارہ: ۲۲ رکوع: ۳ سورۂ سبا جلالین ص: ۳۶۱)

⑥ ﴿وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ (پارہ: ۲۵ رکوع: ۱۳ سورۂ زخرف جلالین ص: ۴۱۰)

⑦ ﴿وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۶ سورۂ نجم جلالین ص: ۴۳۸)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱، ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کی طرف سے کوئی شفاعت کسی کے

حق میں قبول نہیں کی جائے گی اور کسی کی شفاعت سے کسی کو نفع نہیں پہنچے گا، معتزلہ اسی کے قائل ہیں، وہ شفاعت بمعنی رفع عذاب کا انکار کرتے ہیں، اور اخیر کی پانچ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہوں گے جن کو حق تعالیٰ شفاعت کرنے کی اجازت دے دیں گے اور ان کی شفاعت قبول کی جائے گی جیسا کہ اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے، چنانچہ تیسری آیت میں ارشاد ہے کہ لوگ شفاعت کے مالک نہیں ہوں گے مگر وہ شخص جو اللہ سے اجازت حاصل کرے گا۔ عہد کی ایک تفسیر اذن (اجازت) کے ساتھ بھی منقول ہے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں اسی کو اختیار کیا ہے اور ظاہر ہے کہ جب اللہ سے اجازت لے کر آدمی شفاعت کرے گا تو اس کی شفاعت کو حق تعالیٰ قبول بھی فرمائیں گے کیونکہ اجازت دینا قبول کرنے ہی کے لئے ہوگا، ورنہ اجازت دینے سے کیا فائدہ؟ نتیجہ یہ نکلا کہ حق تعالیٰ ان لوگوں کی شفاعت قبول فرمائیں گے، اسی طرح آیت نمبر ۴ میں ارشاد ہے کہ ملائکہ نہیں شفاعت کریں گے مگر اس شخص کی جس کی شفاعت کئے جانے سے حق تعالیٰ راضی ہوں گے اور جس کی شفاعت کئے جانے سے حق تعالیٰ راضی ہوں اس کے حق میں شفاعت قبول بھی ہوگی کیونکہ رضا، قبولیت کی علامت ہے، بہرحال اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ ملائکہ کی شفاعت ان لوگوں کے حق میں قبول ہوگی۔ رہی آیت نمبر ۵ سو اس میں تو صاف تصریح ہے کہ نفع نہیں دے گی شفاعت مگر اس شخص کو جس کے لئے اللہ شفاعت کی اجازت دے دیں گے اور شفاعت کا نافع ہونا قبولیت پر موقوف ہے، معلوم ہوا کہ شفاعت قبول کی جائے گی۔

اسی طرح آیت نمبر ۶ میں "اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ" فرمایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق کی گواہی دینے والے اہل علم حضرات شفاعت کرنے کے مالک ہوں گے اور مالکِ شفاعت ہونے کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ ان کی شفاعت مقبول و نافع ہوگی۔ اور آیت نمبر ۷ میں ہے کہ جن کے لئے حق تعالیٰ شفاعت کی

اجازت دے دیں گے اور ان سے راضی ہو چکیں گے ان کے حق میں ملائکہ کی شفاعت نافع ہوگی، خلاصہ یہ ہوا کہ اخیر کی پانچ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے حق میں انسانوں اور فرشتوں کی شفاعت قبول ہوگی اور آیت ۱،۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی کوئی شفاعت قبول نہیں ہوگی، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ اختلافِ اشخاص پر محمول ہے، آیت نمبر ۱،۲ کفار کے حق میں ہیں کہ کوئی مؤمن اگر کسی کافر کی شفاعت کرنا چاہے گا تو اس کی شفاعت قبول نہیں ہوگی اور آیت کا مطلب ہے "لاتقبل من النفس المؤمنة شفاعة فی حق الکافرة" اور اخیر کی پانچ آیات مؤمنین کے حق میں ہیں کہ حضرات انبیاء، ملائکہ اور مؤمنین صالحین، گنہگار مؤمنین کی شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت قبول ہوگی اور اختلافِ اشخاص کے بعد کوئی تعارض نہیں رہتا۔ (صاوی، مدارک وغیرہ)

❷ اختلافِ زمان پر محمول ہے، یعنی بعض اوقات میں تو کسی کی کوئی شفاعت قبول نہیں ہوگی اور یہ وہ وقت ہوگا جب تک کہ شفاعت کی اجازت نہیں ملی ہوگی اور دوسرے بعض اوقات میں جب کہ حق تعالیٰ کی طرف سے اجازت مل جائے گی شفاعت قبول کی جائے گی، پس آیت نمبر ۱،۲ قبل الاذن پر اور آیات اخیرہ بعد الاذن پر محمول ہیں اور تمام آیات مؤمنین کے ساتھ مخصوص ہیں، اس لئے کہ کفار کے لئے تو شفاعت کسی وقت بھی نافع نہیں ہوگی، اجازت جو ملے گی یہ صرف مؤمنین کے حق میں ملے گی، بہرحال اختلافِ زمان کے بعد تعارض نہیں رہتا۔ (تفسیر روح المعانی)

قیامت کے روز کفار کے لئے کوئی شفاعت کرنے والا ہوگا یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱، ۱۹، ۲۴، ۲۹

آیات

① ﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾

(پارہ: ۱، رکوع: ۶ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۹)

② ﴿وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهُ عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ﴾

(پارہ: ۱، رکوع: ۱۵ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۱۸)

③ ﴿مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ﴾

(پارہ: ۲۴، رکوع: ۷ سورۂ مؤمن (غافر) جلالین ص: ۳۹۲)

④ ﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ﴾ (پارہ: ۲۹، رکوع: ۱۶ سورۂ مدثر جلالین ص: ۴۸۹)

⑤ ﴿فَمَا لَنَا مِنْ شٰفِعِيْنَ﴾ (پارہ: ۱۹، رکوع: ۶ سورۂ شعراء جلالین ص: ۳۱۳)

تشریح تعارض

پہلی چار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے لئے شفاعت کرنے والے تو ہوں گے مگر ان کی شفاعت مقبول و نافع نہیں ہوگی کیونکہ آیت نمبر ۱، ۲ میں حرف نفی مطلق شفاعت پر داخل نہیں ہے یعنی یہ نہیں کہا گیا "لَيْسَتْ لَهُمْ شَفَاعَةٌ" کہ کفار کے لئے بالکل شفاعت ہی نہیں ہوگی بلکہ حرف نفی شفاعت مقیدہ بالقبول یا بالنفع پر داخل ہے، شفاعت مقید، اور قبولیت (نفع) قید ہے اور قاعدہ ہے کہ جب نفی مقید بالقید پر داخل ہو تو نفی صرف قید کی ہوتی ہے مقید کی نہیں ہوتی، مقید ثابت رہتا ہے جیسے کہا

جائے گا جیسے "عندی ثوب البسہ" اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرے پاس کپڑا تو ہے مگر پہننے کا کپڑا نہیں ہے، نفی البسہ کی ہے جو کہ ثوب کے لئے قید ہے۔ ایسے ہی یہاں پر نفی قبولیت و نفع کی ہوگی، نہ کہ مطلق شفاعت کی، جس کا مطلب یہ نکلے گا کہ کفار کے لئے شفاعت تو ہوگی مگر مقبول و نافع نہیں ہوگی، اسی طرح تیسری آیت میں ارشاد ہے کہ ظالمین کے لئے کوئی مخلص دوست اور ایسا کوئی شفیع نہیں ہوگا جس کی بات مانی جائے یعنی اس کی شفاعت قبول کی جائے، اس کا مطلب بھی قاعدہ مذکورہ کے مطابق یہی ہوگا کہ ظالمین کے لئے شفیع تو ہوگا مگر اس کی شفاعت مانی نہیں جائے گی، ایسے ہی آیت نمبر ۳ میں ہے کہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کفار کو نفع نہیں دے گی۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شافعین تو ہوں گے مگر ان کی شفاعت کفار کے لئے نافع نہیں ہوگی۔ بہرحال چاروں آیات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے لئے شافعین تو ہوں گے مگر ان کی شفاعت مقبول و نافع نہیں ہوگی، اور آیت نمبر ۵ میں کفار کا مقولہ ذکر کیا گیا ہے کہ ہمارے لئے کوئی شفاعت کرنے والا ہی نہیں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے لئے کوئی شفاعت کرنے والا ہی نہیں ہوگا، پس یہ آیت پہلی چار آیات کے بظاہر معارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

1. بسا اوقات نفی قید اور مقید دونوں کی مقصود ہوتی ہے جیسے: "خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا" میں "عَمَدٍ" مقید، "تَرَوْنَهَا" قید ہے اور اس آیت کی تفسیر میں جہاں اور دیگر احتمالات ہیں وہاں ایک احتمال صاحب روح المعانی نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ موصوف صفت دونوں کی نفی مقصود ہے کہ آسمانوں کے لئے ستون ہی نہیں ہیں، اسی لئے وہ نظر بھی نہیں آتے۔ صرف قید کی نفی مقصود نہیں ہے کہ ستون تو ہیں مگر نظر

نہیں آتے اس لئے کہ آسمانوں کے لئے ستونوں کا نہ ہونا ہی حق تعالیٰ شانہ کی قدرت کاملہ پر زیادہ دلالت کرنے والی چیز ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے اتنے طویل و عریض اور عظیم و ثقیل آسمانوں کو بغیر ستونوں کے قائم کردیا ہے۔ پس اسی طرح پہلی چار آیات میں قید اور مقید دونوں کی نفی مقصود ہے یعنی کفار کے لئے کوئی شفاعت کرنے والا ہی نہیں ہوگا اور چونکہ قبولیت و نفع، شفاعت پر مرتب ہے جب شفاعت نہیں تو قبولیت اور نفع کا کوئی سوال ہی نہیں۔ پس ان تمام آیات کا مفہوم متحد ہوگیا کہ کفار کے لئے کوئی شفاعت کرنے والا ہی نہیں ہوگا، لہٰذا دفع التعارض۔

(جمل وغیرہ)

❷ واقعہ یہی ہے کہ کفار کے لئے کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا جیسا کہ آیت نمبر ۵ میں کہا گیا ہے اور پہلی چار آیات میں علیٰ سبیل الفرض کلام کیا گیا ہے کہ اگر بالفرض کفار کے لئے کوئی شفاعت کرنے لگے تو اس کی شفاعت مقبول و نافع نہیں ہوگی بلکہ اگر سارے انسان و جنات مل کر بھی کسی کافر کی شفاعت کرنے لگیں تب بھی قبول نہیں ہوگی۔ پس پہلی چار آیات میں کلام علیٰ سبیل الفرض اور آیت نمبر ۵ میں علیٰ سبیل الواقع کیا گیا ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (تفسیر روح المعانی)

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کوہِ طور پر کتنے دن کے لئے بلایا گیا تھا؟

پارہ نمبر: ۱، ۹

آیات

① ﴿وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً﴾ (پارہ ۱ رکوع ۶ سورۂ بقرہ جلالین ص ۹)

② ﴿وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً﴾ (پارہ ۹ رکوع ۷ سورۂ اعراف جلالین ص ۱۴۰)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں تو فرمایا کہ ہم نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا کہ آپ کوہِ طور پر چالیس دن کے لئے تشریف لے آئیے، ہم آپ کو توراۃ عطا فرمائیں گے اور دوسری آیت میں ہے کہ تیس راتوں کا وعدہ کیا، پھر دس راتوں کا مزید اضافہ کر کے چالیس راتیں مکمل فرما دیں، پس دونوں میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں صرف اجمال و تفصیل کا فرق ہے کوئی تعارض نہیں ہے، اصل وعدہ تیس راتوں کا تھا کہ آپ کوہِ طور پر تشریف لائیں اور ایک مہینہ عبادت میں گزاریں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک ماہ حق تعالیٰ کی عبادت میں گزارا اور مسلسل روزے رکھے، درمیان میں افطار نہیں کیا، پس کو صوم

وصال کہتے ہیں، تیسویں دن افطار کر لیا، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ نے افطار کر کے حالتِ صوم کی اس رائحہ کو دور کر دیا جو ہم کو مشک سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے اس لئے آپ دس روزے اور رکھئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دس روزے مزید رکھے اس طرح کل ملا کر چالیس دن ہو گئے، یہ اربعین کی تفصیل ہوئی جس کو آیت ثانیہ میں ذکر کیا گیا ہے، اسی کو آیت اولیٰ میں دونوں عددوں کو جمع کر کے اجمالاً حاصل اور نتیجہ کو بیان کرتے ہوئے فرما دیا: وَوٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً اور کسی چیز کو اجمال کے بعد تفصیلاً ذکر کرنے، یا تفصیل کے بعد اجمالاً ذکر کرنے میں کوئی تعارض نہیں۔

(جمل، خازن، مدارک، بیان القرآن)

مرتکبِ کبیرہ مخلد فی النار ہے یا نہیں؟

پارۂ نمبر: ۱، ۴، ۵، ۱۰، ۲۹، ۳۰

آیات

① ﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (پ۱، رکوع ۹، سورۃ بقرہ، جلالین ص ۱۳)

② ﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا﴾ (پارہ ۴، رکوع ۱۳، سورۃ نساء، جلالین ص ۷۲)

③ ﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا﴾ (پارہ ۵، رکوع ۱۰، سورۃ نساء، جلالین ص ۸۳)

④ ﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا﴾ (پارہ ۲۹، رکوع ۱۲، سورۃ جن، جلالین ص ۴۷۷) ◆

⑤ ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ (پارہ ۱۰، رکوع ۱۵، سورۃ توبہ، جلالین ص ۱۶۲)

⑥ ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ (پارہ ۳۰، رکوع ۲۳، سورۃ زلزال، جلالین ص ۵۰۵)

تشریحِ تعارض

پہلی چار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب مؤمن ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا کیونکہ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرنا، اس کے حدود سے تجاوز کرنا، کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کرنا یہ سب معاصی کبیرہ ہیں اور ان کے مرتکب کو ان آیات میں مخلد فی النار بتایا گیا ہے[1] اور آیت نمبر ۵ و ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) معتزلہ کا یہی مسلک ہے اور یہ آیات ان کا مستدل ہے۔

صاحبِ ایمان جنت میں ضرور داخل ہوگا اگرچہ وہ فاسق و فاجر کیوں نہ ہو۔[1] حق تعالیٰ اس کے گناہوں کی سزا دینا چاہیں گے تو ایک عرصہ تک جہنم میں سزا دے کر پھر اس کے ایمان کی وجہ سے اس کو جہنم سے نکال کر جنت میں پہنچا دیں گے، کیونکہ آیت نمبر ۵ میں ہے کہ حق تعالیٰ نے ایمان والوں سے جنت کا وعدہ کر لیا ہے اور آیت نمبر ۶ میں ہے جو ذرہ برابر بھی خیر کرے گا اس کا ثواب دیکھے گا اور نفسِ ایمان بھی خیر ہے اگرچہ پوری زندگی معاصی میں گزری ہو مگر نفسِ ایمان اس کے پاس موجود ہونے کی وجہ سے کبھی نہ کبھی اس کو جہنم سے نکال کر جنت میں بھیجا جائے گا اور ایمان کی جزا اس کو ملے گی۔ ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن اگر مرتکبِ کبیرہ ہو وہ مخلد فی النار نہیں ہے بلکہ جنت میں ضرور جائے گا اور آیت نمبر ۱۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتکبِ کبیرہ مخلد فی النار ہے۔ پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

1. حقیقت تو وہی ہے جو آیت نمبر ۵ و ۶ میں ہے کہ صاحبِ ایمان جنت میں ضرور داخل ہوگا اگرچہ وہ مرتکبِ کبیرہ ہو، روایتِ صحیحہ میں بھی اس کی تصریح وارد ہوئی ہے:

عن ابی ذر رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ قال: اتیت النبی صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم وعلیہ ثوب ابیض، وهو نائم، ثم اتیته وقد استیقظ، فقال: ما من عبد قال لا الٰہ الا اللّٰہ، ثم مات علی ذلک الا دخل الجنة. قلت: وان زنی وان سرق؟ قال: وان زنی وان سرق. قلت: وان زنی وان سرق؟ قال: وان زنی وان سرق. قلت: وان زنی وان سرق؟ قال: وان زنی وان سرق، ثم فی

(۱) جیسا کہ اہلِ سنت و جماعت کا مسلک ہے۔

وان رغم علی رغم انف ابی ذر ﷺ

(رواہ البخاری و مسلم، النبراس شرح شرح العقائد)

ترجمہ: "حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرمایا کہ میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا آپ سفید کپڑا اوڑھے سو رہے تھے، میں دوبارہ حاضر ہوا تو آپ بیدار ہو چکے تھے، پس آپ نے یہ ارشاد فرمایا جو بندہ لا الہ الا اللہ پڑھے، پھر اسی کلمہ پر مر جائے وہ جنت میں ضرور داخل ہوگا۔ میں نے عرض کیا اگرچہ وہ زنا کرے اور چوری کرے؟ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگرچہ زنا کرے اور چوری کرے۔ میں نے پھر کہا اگرچہ زنا کرے اور چوری کرے؟ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اگرچہ زنا کرے اور چوری کرے۔ میں نے پھر (تعجب سے) پوچھا اگرچہ زنا کرے اور چوری کرے؟ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اگرچہ زنا کرے اور چوری کرے۔ پھر چوتھی مرتبہ آپ نے فرمایا ابوذر کی ناک خاک آلود ہونے کے باوجود یعنی ابوذر کو کتنا ہی ناگوار محسوس ہو رہا ہو مگر وہ شخص جنت میں ضرور جائے گا۔ پس وہ آیات جن سے مرتکب کبیرہ کا مخلد فی النار ہونا معلوم ہوتا ہے تو وہ اپنے ظاہر پر محمول نہیں ہیں بلکہ ان میں تاویل کی جائے گی تا کہ آیت میں تطبیق ہو جائے۔"

پہلی آیت: "بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ" میں دو تاویلیں کی گئی ہیں:

(۱) سیئہ سے مراد گناہ کبیرہ نہیں بلکہ شرک مراد ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت میں سیئہ کی تفسیر شرک کے ساتھ منقول ہے، ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ

عنہ سے ابن جریر نے حضرت ابو وائل، مجاہد، قتادہ، عطاء اور ربیع سے سیئۃ اور خطیئۃ کی تفسیر کفر کے ساتھ نقل کی ہے، پس یہ آیت کافر کے حق میں ہوئی اور کافر مخلد فی النار ہوتا ہے۔ اس تفسیر کے بعد اس آیت سے مرتکب کبیرہ کا مخلد فی النار ہونا لازم نہیں آیا۔ پس یہ آیت اخیر کی دو آیتوں سے معارض نہیں رہی۔

(روح المعانی، مدارک، خازن وغیرہ)

(۲) دوسری تاویل یہ ہے کہ اس میں "اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ" فرمایا گیا ہے کہ اس کی خطائیں ہر جانب سے اس کا احاطہ کرلیں یعنی اس کے ظاہر و باطن پر خطاؤں کا غلبہ ہو جائے، کوئی خیر اس کے اندر باقی نہ رہے حتیٰ کہ اس کے قلب میں تصدیق اور زبان پر اقرار بھی باقی نہیں اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص کافر ہوتا ہے، پس اس تاویل کی بنا پر یہ آیت کافر کے حق میں ہوئی اور کافر مخلد فی النار ہوتا ہے۔ (التحریر)

دوسری آیت: "وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا" میں بھی دو تاویلیں کی گئی ہیں:

(۱) وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ سے مراد وَيَتَعَدَّ جَمِيْعَ حُدُوْدِهٖ ہے کہ جو شخص اللہ اور رسول کی نافرمانی کرے اور اللہ کی تمام حدود سے تجاوز کر جائے وہ مخلد فی النار ہے اور تمام حدود سے تجاوز کر جانے والا کافر ہوتا ہے، اس لئے کہ جمیع حدود میں ایک حد توحید بھی ہے جو شخص حد توحید سے بھی تجاوز کر جائے بایں طور کہ اللہ کے ساتھ غیر کو شریک کرنے لگے وہ کافر ہوتا ہے، مومن اگرچہ فاسق و فاجر ہو مگر وہ حد توحید پر ٹھہرا رہتا ہے، وہ اس حد سے تجاوز نہیں کرتا، لہٰذا وہ اس آیت میں داخل نہیں ہوگا اس کا مخلد فی النار ہونا لازم نہیں آئے گا۔ (روح المعانی، والتحریر)

(۲) علامہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ حق تعالیٰ نے اس آیت سے اوپر جو میراث کی تقسیم بیان کی ہے اور جو حدود اس تقسیم کی متعین فرمائی ہیں جو شخص ان حدود سے تجاوز کرنا حلال سمجھے اور حلال سمجھ کر ان حدود سے تجاوز کر جائے، وہ مخلد فی النار

ہے۔ اور کسی گناہ کو حلال سمجھنا کفر ہے، پس یہ آیت کافر کے بارے میں ہوئی اور کافر کے مخلد فی النار ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، ان دونوں تاویلوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ یہ آیت کافر کے حق میں ہے۔ ابن جریج اور ابن جبیر سے بھی یہی منقول ہے کہ "وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ" کا مطلب من لا یؤمن بما فصل سبحانہ من المواریث یعنی وہ شخص مراد ہے جو حق تعالیٰ کی بیان کردہ مواریث پر ایمان نہ لائے۔ وہ کافر ہے اور مخلد فی النار ہے۔ (روح المعانی)

تیسری آیت: "وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ الخ" میں چار تاویلات کی گئی ہیں:

① خلود فی النار کی وعید زجر و توبیخ میں تغلیظ و تشدید پر محمول ہے، یعنی خلود فی النار مقصود نہیں ہے بلکہ ڈانٹ ڈپٹ میں سختی اختیار کرتے ہوئے یہ وعید سنائی گئی ہے تاکہ کوئی شخص مومن کو قتل کرنے کی جرأت و ہمت نہ کرسکے۔ روایات میں بھی قتل مومن پر اسی قسم کی وعیدیں زجر و توبیخ کے طور پر وارد ہوئی ہیں۔

﴿عَنِ الْحَسَنِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ: نَازَلْتُ رَبِّيْ فِيْ قَاتِلِ الْمُؤْمِنِ اَنْ يَّجْعَلَ لَهٗ تَوْبَةً فَاَبٰى عَلَيَّ﴾ (رواہ عبد بن حمید۔ روح المعانی ج:۵ ص:۱۱۶)

ترجمہ: "حضرت حسن سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے مومن کے قاتل کے بارے میں درخواست کی کہ اس کی توبہ قبول کرلیا کریں تو حق تعالیٰ نے انکار فرما دیا۔ (کہ مومن کے قاتل کی دعا قبول نہیں کروں گا)"

یہ زجر و توبیخ پر محمول ہے، ورنہ ہر گناہ کبیرہ سے حتیٰ کہ کفر و شرک سے بھی توبہ قبول ہوجاتی ہے۔ اسی طرح حضرت سعید بن مینا سے منقول ہے کہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک شخص آیا، اس نے دریافت کیا کہ

مؤمن کو قتل کرنے والے کی توبہ قبول ہو جاتی ہے؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "لَا وَالَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ" قسم ہے اس ذات کی جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اس شخص کی توبہ قبول نہیں ہوتی وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے سوراخ میں داخل ہو جائے۔ (یعنی قاتلِ مؤمن کا جنت میں داخل ہونا محال ہے جیسا کہ اونٹ کا سوئی کے سوراخ میں داخل ہونا محال ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مشہور ہے کہ قاتلِ مؤمن کی توبہ قبول نہیں ہوتی، یہ سب زجر و توبیخ پر محمول ہے۔

دلیل اس کی یہ ہے کہ حضرت ابن حمید اور امام نحاس رحمہما اللہ نے سعید بن جبیدہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص مؤمن کو قتل کر دے اس کی توبہ قبول ہو جاتی ہے، ایک مرتبہ ایک شخص نے آکر ان سے سوال کیا کہ کیا قاتلِ مؤمن کی توبہ قبول ہو جاتی ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا نہیں، اس کے لئے تو صرف جہنم ہے۔ جب وہ شخص چلا گیا تو اہل مجلس نے عرض کیا آپ تو اس طرح کا فتویٰ نہیں دیتے ہیں آپ تو ہم سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ قاتلِ مؤمن کی توبہ قبول ہو جاتی ہے، آج کیا بات ہوئی؟ (کہ آپ نے فرما دیا اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی اس کے لئے صرف جہنم ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ شخص غصہ میں بھرا ہوا تھا، میرا گمان یہ ہے کہ اس کا ارادہ کسی مؤمن کو قتل کرنے کا تھا (یہ اسی لئے معلوم کرنے آیا تھا کہ اگر قبولیتِ توبہ کی گنجائش نکل آئی تو قتل کرنے کے بعد توبہ کر لوں گا، اس لئے میں نے اس سے کہہ دیا کہ قاتلِ مؤمن کی توبہ قبول نہیں ہوتی تاکہ یہ قتل سے رک جائے) لوگوں نے کسی شخص کو اس کے پیچھے بھیجا کہ دیکھ آئے وہ کہاں جاتا ہے، اس کا کیا ارادہ ہے، معلوم ہوا کہ واقعی اس کا ارادہ کسی مؤمن کو قتل کرنے کا تھا، اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ زجر و توبیخ کے طور پر فرما دیا کرتے تھے کہ قاتلِ مؤمن کی

توبہ قبول نہیں ہوتی، وہ مخلد فی النار ہوتا ہے، یعنی ایسے ہی آیت شریف بھی تغلیظاً وتشدید
فی الزجر والتوبیخ پر محمول ہے۔ (روح المعانی)

(۲) دوسری تاویل یہ ہے کہ مطلب آیت شریف کا یہ ہے کہ قتل مومن عمداً کی جزاءِ
حقیقی تو تخلید فی النار ہی ہے، اگر حق تعالیٰ اس کو جزائے حقیقی دینا چاہیں تو تخلید فی
النار کی سزا دیں گے مگر یہ حق تعالیٰ کے فضل وکرم کی بات ہے کہ اس کو جہنم سے نکال
کر جنت میں بھیج دیں گے۔ ابن منذر نے عون بن عبداللہ سے اس آیت کی تفسیر میں
یہی نقل کیا ہے "فَجَزَاؤُهٗ جَهَنَّمُ اِنْ جَازَاهُ" ابوداؤد شریف کی روایت میں
حضرت ابومجلز سے یہی تفسیر منقول ہے "قَالَ: هِيَ جَزَاؤُهٗ فَاِنْ شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَجَاوَزَ
عَنْ جَزَائِهٖ فَعَلَ" کہ قتل مومن کی جزاء تو جہنم ہی ہے (معافی کا کوئی سوال نہیں)
لیکن حق تعالیٰ شانہ اگر معاف کرنا چاہیں گے تو معاف فرما دیں گے۔ عذاب کی وعید
بیان کرنے کے بعد اس کے خلاف کر دینا یعنی معاف کر دینا اس کو کذب نہیں کہا جاتا
ہے جیسے کوئی شخص کسی کو زجر وتوبیخ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر تو نے فلاں حرکت کی تو
تیری سزا قتل اور ضرب ہے، پھر اس حرکت کے کرنے پر اس کو وہ سزا نہ دے تو اس کو
کذب نہیں کہا جاتا بلکہ یہ تو احسان وکرم شمار ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ سزا تو اس
جرم کی قتل وضرب ہی تھی مگر ہم نے تجھ پر احسان وکرم کرتے ہوئے تجھ کو معاف کر دیا،
بس اسی طرح حق تعالیٰ وعید بیان کرنے کے بعد اگر چاہیں گے تو معاف فرما دیں
گے، امام واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل وعدہ خلافی تو نہیں کر سکتے، البتہ
وعید کے خلاف کر سکتے ہیں، حدیث میں بھی یہ مضمون وارد ہوا ہے:

﴿عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ
تَعَالٰى عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ وَعَدَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى عَمَلِهٖ
ثَوَابًا فَهُوَ مُنْجِزُهٗ، وَمَنْ اَوْعَدَهٗ عَلٰى عَمَلِهٖ عِقَابًا فَهُوَ بِالْخِيَارِ﴾

(روح المعانی ج۵ ص:۱۱۶)

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ جس شخص سے اس کے عمل پر ثواب کا وعدہ فرمالیتے ہیں اس کو پورا فرماتے ہیں اور جس کے عمل پر عذاب کی وعید بیان کر دیتے ہیں تو حق تعالیٰ کو اختیار ہے (چاہیں تو عذاب دیدیں چاہیں معاف فرمادیں)۔"

بہرحال اس تفسیر کے بعد آیت سے مرتکب کبیرہ کا خلد فی النار ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ فلا تعارض۔ (روح المعانی، مدارک، خازن)

(۳) تیسری تاویل یہ ہے کہ یہ استحلال پر محمول ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص حلال سمجھ کر کسی مومن کو قتل کرے وہ خلد فی النار ہے اور گناہ کبیرہ کو حلال سمجھنا کفر ہے اور کفر کی سزا تخلید فی النار ہے۔ حضرت عکرمہ اور ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے متعمداً کی تفسیر مستحلاً کے ساتھ کی ہے۔ (روح المعانی، خازن، جلالین)

(۴) چوتھی تاویل: آیت کا مطلب یہ ہے "وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِناً لِكَوْنِهٖ مُؤْمِناً" کہ جو شخص کسی مومن کو اس کے مومن ہونے کی وجہ سے قتل کرے وہ مخلد فی النار ہے اور ظاہر ہے کہ کسی مومن کو اس وجہ سے قتل کرنا کہ وہ مومن ہے یہ کفر ہے کیونکہ یہ ایمان سے نفرت اور عداوت کی دلیل ہے اور ایمان سے عداوت ونفرت رکھنا کفر ہے، وجہ اس تاویل کی یہ ہے کہ جب کسی حکم کو کسی مشتق پر مرتب کیا جاتا ہے تو اس مشتق کا مصدر ترتب حکم کی علت ہوتا ہے، یہاں پر قتل مرتب ہورہا ہے مومن پر جو کہ مشتق ہے، پس اس کا مصدر یعنی ایمان قتل کی علت بن جائے گا کہ یہ شخص ایمان کی وجہ سے اس کو قتل کر رہا ہے جیسے کہا جائے "ضَرَبْتُ السَّارِقَ" اس کا مطلب یہ ہوتا ہے "ضربت السارق لکونه سارقا" حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْۤا اَيْدِيَهُمَا" اس کا مطلب ہے "فَاقْطَعُوْۤا اَيْدِيَهُمَا لِكَوْنِهِمَا سَارِقَيْنِ."

(جاری ہے)

چوتھی آیت کی تاویل یہ ہے کہ ”وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ“ سے مراد توحید کے معاملہ میں نافرمانی کرنا ہے کیونکہ اوپر سے کلام توحید کے متعلق چل رہا ہے، مطلب یہ ہوگا ”مَنْ لَّمْ یُؤْمِنْ بِالتَّوْحِیْدِ فَاِنَّ لَہٗ نَارَ جَہَنَّمَ خَالِدِیْنَ فِیْہَا اَبَدًا“۔

❷ اس تعارض کا دوسرا جواب چاروں آیات کا مجموعی جواب ہے کہ ان آیات میں خلود سے مراد مجازاً مکث طویل (زیادہ طویل تک رہنا) ہے، کہا جاتا ہے ”سِجْنٌ مُخَلَّدٌ“ مراد اس سے لمبی قید ہوتی ہے۔ یہ تاویل ان آیات میں اکثر مفسرین نے کی ہے، اس صورت میں مرتکب کبیرہ کو مخلد فی النار ہونا اور عدم خروج من النار لازم نہیں آتا۔ پس یہ آیات اخیر کی دونوں آیتوں سے معارض نہیں ہوں گی۔

آیاتِ قرآنیہ میں حق تعالیٰ تبدیلی فرماتے ہیں یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱، ۱۱، ۱۴، ۲٦

آیات

① ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا﴾

(پارہ ۱، رکوع ۱۳، سورۂ بقرہ جلالین ص: ۱۷)

② ﴿وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مُفْتَرٍ﴾

(پارہ ۱۴، رکوع ۲۰، سورۂ نحل جلالین ص: ۲۲٦)

③ ﴿لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ﴾ (پارہ ۱۱، رکوع ۱۲، سورۂ یونس جلالین ص: ۱۷٦)

④ ﴿مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾

(پارہ ۲٦، رکوع ۱٦، سورۂ ق جلالین ص: ۴۳۱)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ و ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ آیت قرآنیہ میں تبدیلی فرمادیتے ہیں کہ ایک آیت کو منسوخ کرکے اس کے بدلہ میں اس جیسی آیت یا اس سے بہتر لے آتے ہیں اور آیت نمبر ۳ و ۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کے کلمات و اقوال میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ آیت نمبر او ۲ میں تبدیل سے مراد تبدیلی احکام ہے، یعنی ایک حکم منسوخ کر کے اس کے بدلے میں دوسرا حکم نازل فرما دیتے ہیں اور آیت نمبر ۳ و ۴ میں عدم تبدیلی سے مراد عدم تبدیلی وعدہ وعید ہے، یعنی حق تعالیٰ کسی حکمت ومصلحت کی وجہ سے احکام میں تبدیلی فرما دیتے ہیں۔ حق تعالیٰ جانتے ہیں کہ کس حال اور کس زمانے میں کون سا حکم بندوں کے لئے مناسب ہے جیسا کہ ایک ماہر طبیب وڈاکٹر مریض کے لئے دواؤں کا نسخہ بدل دیتا ہے، وہ اپنی مہارت فی الطب کی وجہ سے جانتا ہے کہ اتنے روز تک مریض کے لئے یہ دوا مفید ہوگی، اس کے بعد مریض کی حالت بدل جائے گی اور دوسری دوا اس کے لئے نافع ہوگی، حق تعالیٰ کے احکام امراض معنویہ وروحانیہ کے لئے دواؤں کی حیثیت رکھتے ہیں، حق تعالیٰ اپنے علم وحکمت کے مطابق ان میں تبدیلی کر دیتے ہیں لیکن حق تعالیٰ کے وعدہ وعید میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی، حق تعالیٰ مغفرت ورحمت، جنت اور ثواب وغیرہ کا جو وعدہ فرما لیتے ہیں اس کے خلاف نہیں کرتے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ."

اسی طرح عذاب جہنم وغیرہ کی جو وعید بیان کرتے ہیں اس کے خلاف نہیں کرتے۔ آیت نمبر ۳ "لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ" میں کلمات سے مراد وعدے ہیں جیسا کہ آیت کے سیاق وسباق "لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ" سے معلوم ہوتا ہے اور آیت نمبر ۴ "مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ" میں قول سے مراد وعید ہے جیسا کہ آیت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے "لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ." (روح المعانی)

❷ اخیر کی دو آیتوں میں کلمات واقوال سے مراد حق تعالیٰ کی قضاء یعنی ازل میں مقرر شدہ فیصلے ہیں، یعنی حق تعالیٰ شانہ نے جو فیصلہ کر دیا ہے وہ پورا ہو کر رہتا ہے، اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اور احکام منسوخ کرنا اور بدلنا بھی حق تعالیٰ کے

فیصلوں میں سے ایک فیصلہ ہے، حق تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ فلاں وقت تک فلاں حکم جاری رہے گا، اس کے بعد وہ حکم بدل جائے گا اس فیصلہ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی، یعنی ایسا نہ ہوگا کہ وقت آنے پر وہ حکم نہ بدلے، لہٰذا احکام کا منسوخ ہو جانا اور بدل جانا "مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ" اور "لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ" کے عین موافق و مطابق ہے، ان میں کوئی تعارض نہیں۔ هذا ما سنح لي ولم اجده فيما تتبعته من الكتب التي عندي. والله اعلم.

سب سے بڑا ظالم کون شخص ہے؟

پارہ نمبر: ۱، ۷، ۸، ۱۱، ۱۲، ۲۱، ۲۴، ۲۸

آیات

① ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ﴾

(پارہ: ۱، رکوع: ۱۴، سورۂ بقرہ، جلالین ص: ۱۷) ◆

② ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ﴾

(پارہ: ۱، رکوع: ۱۶، سورۂ بقرہ، جلالین ص: ۲۰) ◆

③ ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ﴾

(پارہ: ۷، رکوع: ۹، سورۂ انعام، جلالین ص: ۱۱۳)

④ ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ﴾

(پارہ: ۷، رکوع: ۱۷، سورۂ انعام، جلالین ص: ۱۲۰)

⑤ ﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾

(پارہ: ۸، رکوع: ۳، سورۂ انعام، جلالین ص: ۱۲۷)

⑥ ﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا﴾

(پارہ: ۸، رکوع: ۷، سورۂ انعام، جلالین ص: ۱۲۸)

⑦ ﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ﴾

(پارہ: ۸، رکوع: ۱۱، سورۂ اعراف، جلالین ص: ۱۳۳)

⑧ ﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ﴾ (پارہ: ۱۱، رکوع: ۷، سورۂ یونس، جلالین ص: ۱۷۱)

⑨ ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى

رَبِّهِمْ ﴾ (پارہ:۱۲ رکوع ۲ سورۂ ہود جلالین ص:۱۸۱)

(۱۰) ﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ﴾

(پارہ:۲۱ رکوع:۱۵ سورۂ سجدہ جلالین ص:۳۵۰)

(۱۱) ﴿ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ﴾

(پارہ:۲۴ رکوع:۱ سورۂ زمر جلالین ص:۳۸۶)

(۱۲) ﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ ﴾

(پارہ:۲۸ رکوع:۹ سورۂ صف جلالین ص:۴۵۹)

تشریح تعارض

وَمَنْ اَظْلَمُ کا صیغہ قرآن پاک میں بہت سی جگہ آیا ہے جیسا کہ آیات مذکورہ سے ظاہر ہے، اس میں "مَنْ" استفہامیہ ہے، آیت نمبر ا کا ترجمہ یہ ہوگا کہ کون زیادہ ظالم ہے اس شخص سے جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کا ذکر کرنے سے لوگوں کو روکے؟ لیکن اس میں استفہام کے حقیقی معنی یعنی "استعلام، کسی چیز کو معلوم کرنا، سمجھنا" مراد نہیں ہو سکتے اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہ تو علیم بکل شئے ہیں، ان کے حق میں استفہام محال ہے اس لئے استفہام مجازاً نفی کے معنی میں ہے جس کو استفہام انکاری کہتے ہیں اور من اظلم کا مطلب لَا اَحَدَ اَظْلَمُ ہے، اب ترجمہ یہ ہوگا کہ اس سے بڑا کوئی ظالم نہیں ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کا ذکر کرنے سے روکے، یعنی سب سے بڑا ظالم مانع ذکر اللہ فی المساجد ہے، اسی طرح ہر آیت میں یہی مطلب نکلے گا کہ سب سے بڑا ظالم وہ شخص ہے جو اللہ پر افتراء پردازی کرے وغیرہ۔

اب تعارض یہ ہے کہ آیت نمبر ا سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے بڑا ظالم مساجد میں اللہ کا ذکر کرنے سے روکنے والا ہے، اس سے بڑا کوئی ظالم نہیں اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے بڑا ظالم وہ شخص ہے جو شہادت کو چھپائے، اس سے

بڑا کوئی ظالم نہیں اور اخیر کی تمام آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے بڑا ظالم شخص وہ ہے جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھے، آیتِ خداوندی کی تکذیب کرے اور ان سے اعراض کرے۔ ان آیات میں متعدد لوگوں کو اظلم بتایا گیا ہے حالانکہ اظلم تو ایک ہی شخص ہوسکتا ہے، اگر مانعِ ذکر اللہ فی المسجد اظلم ہے تو کاتمِ شہادت اظلم نہیں ہوسکتا، اگر کاتمِ شہادت اظلم ہے تو مانعِ ذکر اظلم نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح تمام آیات میں کہا جائے گا، پس ان آیات میں تعارض ہوگیا کہ ہر ایک کی اظلمیت کا اثبات بھی ہے اور اس کی نفی بھی ہورہی ہے۔ وھذا ھو التعارض۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

1. ہر آیت میں جو ایک شخص کی اظلمیت میں تخصیص ہورہی ہے وہ "مَنْ" موصولہ کے بعد آنے والے صلہ کے مفہوم کے ساتھ ہے مثلاً "مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ الخ" کا مطلب یہ ہے کہ لا احد من المانعین اظلم ممن منع مساجد اللّٰہ الخ یعنی نیک کاموں سے روکنے والے لوگوں میں سب سے بڑا ظالم وہ شخص ہے جو اللہ کی مسجدوں میں ذکر اللہ کرنے سے روکے۔ اسی طرح "لا احد من الکاتمین اظلم ممن کتم شہادۃ عندہ من اللّٰہ" کہ کاتمین میں سے سب سے بڑا ظالم وہ شخص ہے جو شہادت من اللہ کا کتمان کرے۔ ایسے ہی "لا احد من المفترین اظلم ممن افتریٰ علی اللّٰہ کذبا" افتراء پردازی کرنے والوں میں سے سب سے بڑا ظالم وہ ہے جو اللہ پر افتراء پردازی کرے۔ "لا احد من المکذبین اظلم ممن کذب بآیت اللّٰہ، ولا احد من المکذابین ممن کذب علی اللّٰہ، ولا احد من المعرضین اظلم ممن ذکر بآیت ربہ، ثم اعرض عنہا۔" اس صورت میں کوئی تعارض نہیں رہا اس لئے

کہ ہر شخص کی اظلمیت کی نوعیت جداگانہ ہے۔ (جمل و روح المعانی)

❷ ان آیات میں مانع، کاتم، مفتری، کاذب، مکذب وغیرہم کو اظلم کہا گیا ہے، اس میں کوئی تعارض نہیں اس لئے کہ متعدد افراد اظلمیت میں برابر ہو سکتے ہیں، یہ لفظ تسویۃ فی الاظلمیت کی نفی پر دلالت نہیں کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ یہ سارے کے سارے اظلم ہونے میں برابر ہیں اور یہ سب اپنے علاوہ دیگر لوگوں سے اظلم ہیں جیسا کہ کہا جائے، لا احدا أفقه من زيد وعمرو وخالد (زید، عمرو، خالد سے زیادہ کوئی افقہ نہیں ہے، یعنی یہ تینوں سب سے بڑے فقیہ ہیں، اس کا مطلب عرف میں یہ ہوتا ہے کہ یہ تینوں افقہ ہونے میں برابر ہیں اور باقی تمام لوگ ان سے کم درجے کے فقیہ ہیں۔ (روح المعانی، جمل)

❸ اس طرح کے کلام سے بسا اوقات صرف مبالغہ مقصود ہوتا ہے، مساوات یا زیادتی کی نفی مقصود نہیں ہوتی کہ دوسرا شخص اس سے بڑا ظالم ہے یا نہیں ہے، مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ایسا کرنے والا بڑا ظالم شخص ہے، بہت بری حرکت میں مبتلا ہے، اس کو ایسا نہ کرنا چاہئے، پس ان آیات میں بھی مبالغہ مقصود ہے کہ ایسے لوگ بڑے ظالم ہیں، اس سے تعرض نہیں ہے کہ دوسرے اظلم ہیں یا نہیں۔ فافهم۔ (روح المعانی)

مشرق ومغرب کی تعداد کتنی ہے؟

پارہ نمبر: ۱، ۱۹، ۲۳، ۲۷، ۲۹

آیات

① ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾

(پارہ ۱، رکوع ۱۴، سورۂ بقرہ، جلالین ص: ۱۸)

② ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ﴾

(پارہ ۱۹، رکوع ۶، سورۂ شعراء، جلالین ص: ۳۱۰)

③ ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا﴾

(پارہ ۲۹، رکوع ۱۳، سورۂ مزمل، جلالین ص: ۴۷۸) ✦

④ ﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ﴾

(پارہ ۲۳، رکوع ۵، سورۂ صافات، جلالین ص: ۳۷۳)

⑤ ﴿فَلَا أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ﴾

(پارہ ۲۹، رکوع ۸، سورۂ معارج، جلالین ص: ۴۷۴) ✦

⑥ ﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ﴾ (پارہ ۲۷، رکوع ۱۲، سورۂ رحمن، جلالین ص: ۴۴۳)

تشریحِ تعارض

پہلی تین آیتوں میں مشرق ومغرب صیغۂ مفرد کے ساتھ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرق ومغرب ایک ایک ہیں اور آیت نمبر ۴ و ۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشارق ومغارب کثیرہ ہیں اور آیت نمبر ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرق ومغرب دو دو ہیں، لہٰذا ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ پہلی تین آیتوں میں تو جنس مشرق و مغرب مراد ہے جو قلیل و کثیر سب کو شامل ہے اور آیت نمبر ۴ و ۵ میں ہر یوم کی مشرق و مغرب کے اعتبار سے جمع کا صیغہ لایا گیا ہے کیونکہ روزانہ مشرق و مغرب بدلتے رہتے ہیں، سال کے ایام کی تعداد کے مطابق تین سو ساٹھ (۳۶۰) مشارق اور تین سو ساٹھ (۳۶۰) مغارب ہیں، ابن عطیہ سے مروی ہے کہ یک سو اسی (۱۸۰) مشارق اور اتنے ہی مغارب ہیں، یا مطلق کواکب کے مشارق و مغارب مراد ہیں، اس لئے صیغۂ جمع لایا گیا ہے۔ اور آیت نمبر ۲ میں مشرق صیف و شتاء اور مغرب صیف و شتاء کے اعتبار سے صیغۂ تثنیہ استعمال کیا گیا ہے، گرمی و سردی کے مشرق و مغرب مختلف ہوتے ہیں، یا مشرق شمس و قمر اور مغرب شمس و قمر کے اعتبار سے مشرقین و مغربین کہہ دیا گیا ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (روح المعانی)

نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

تعارض نمبر: ۲۱

آیات

① ﴿فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ (پارہ:۱، رکوع:۱۴، سورۂ بقرہ، جلالین ص:۱۸) ◆

② ﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾

[پارہ:۲، رکوع:۱، سورۂ بقرہ، جلالین ص: ۲۱،۲۲]

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ا میں فرمایا کہ جدھر بھی رخ کرلو اسی طرف اللہ کی ذات موجود ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنا ضروری نہیں، مصلی کو اختیار ہے جس طرف منہ کر کے چاہے نماز پڑھ لے اور آیت نمبر ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی جہاں بھی کہیں ہو قبلہ (مسجد حرام) کی طرف رخ کرنا ضروری ہے، پس دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے پانچ جواب ہیں:

❶ لفظ اَينما جہت کے معنیٰ میں ہو کر تولّوا کا مفعول نہیں ہے بلکہ یہ مکان کے معنیٰ میں ہے اور تولوا کا ظرف ہے اور وجہ اللّٰہ میں "وجہ" سے مراد جہت ہے جیسا کہ وزن بمعنی زنۃ ہے، مطلب یہ ہوگا "فِيْ اَيِّ مَكَانٍ تُوَلُّوْا شَطْرَ الْقِبْلَةِ فَثَمَّ

وَجْهُ اللّٰهِ الَّتِیْ اُمِرْتُمْ بِهَا" کہ جس جگہ رہ کر بھی تم قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لو گے اسی جگہ اللہ کی وہ جہت موجود ہے جس کی طرف تم کو رخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یعنی نماز کسی مسجد اور کسی مکان کے ساتھ خاص نہیں بلکہ پورے عالم میں جس مسجد میں یا جس جگہ، گھر یا جنگل وغیرہ میں (بشرطیکہ پاک جگہ ہو اور کوئی محذور شرعی نہ ہو) قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لو، نماز درست ہو جائے گی۔ امت محمدیہ کے لئے پوری زمین کو مسجد اور طہور بنایا گیا ہے۔ جیسا کہ حدیث صحیح میں وارد ہے: "جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُوْرًا"، امم سابقہ کے لئے ان کے معابد، بیعہ وکنائس میں نماز پڑھنا ضروری تھا، خارج معبد نماز درست نہیں تھی مگر یہ اس امت کی خصوصیت ہے کہ اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ جس جگہ بھی قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لی جائے، اللہ کی مقرر کی ہوئی جہت موجود ہے، جہت کی اضافت اللہ کی طرف اس لئے کر دی گئی ہے کہ اللہ نے اس جہت قبلہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وجہ ذات کے معنی میں ہے جیسے "كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ" میں وجہ بمعنی ذات مستعمل ہے، اب ترجمہ یہ ہوگا کہ جس جگہ رہ کر بھی قبلہ کی طرف منہ کر لو اسی جگہ اللہ کی ذات موجود ہے۔ مگر اس وقت لفظ ذات کنایہ ہوگا علم اور اطلاع سے، یعنی اسی جگہ اللہ کو تمہارے نماز پڑھنے اور رخ کرنے کا علم ہے، اللہ تعالیٰ ہر جگہ اپنے بندوں کی عبادات پر مطلع ہیں۔

ابو منصور نے وجہ بمعنی جاہ لیا ہے اور جاہ سے مراد عظمت وجلالت ہے "ای فثم عظمة اللّٰه وجلالته" بہر حال "وجہ" جہت کے معنی میں ہو یا ذات و عظمت کے معنی میں ہو، مراد اس آیت سے کسی بھی مقام پر رہ کر قبلہ کی طرف رخ کرنا ہے، لہٰذا یہ آیت: فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ کے معارض نہیں ہے۔ (روح المعانی)

❷ اَیْنَمَا جہت کے معنی میں ہو کر تولوا کا مفعول ہے جیسا کہ یہی استعمال اس کا

شائع ہے یعنی اسی جہت توجہوا جس طرف بھی رخ کرلو ادھر ہی اللہ کی ذات موجود ہے، مگر یہ آیت تطوع علی الراحلة فی السفر کے بارے میں نازل ہوئی جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے (سفر سے مراد سفر لغوی) یعنی آبادی سے باہر سواری پر سوار ہو کر نفل نماز پڑھنے کے لئے جہت قبلہ کی طرف رخ کرنا ضروری نہیں ہے جس طرف بھی سواری کا رخ ہو اسی طرف نماز درست ہو جائے گی، اور آیت نمبر ۲ "حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ" فرض نماز اور آبادی میں نماز کے متعلق ہے، یعنی فرض نماز خواہ آبادی میں ہو یا آبادی سے باہر اور نفل نماز جب کہ آبادی میں ہو غیر قبلہ کی طرف درست نہیں ہے، پس ان دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ (روح المعانی)

۴ اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ کا حکم ان لوگوں کے لئے ہے جن پر قبلہ مشتبہ ہو جائے، وہ تحری کر کے جس طرف بھی نماز پڑھ لیں گے درست ہو جائے گی، اگرچہ فی الواقع غیر قبلہ کی طرف ہو، حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی مروی ہے کہ ایک غزوہ میں جس میں، میں بھی شریک تھا، لوگوں پر قبلہ مشتبہ ہو گیا تھا تو جنوب اور شمال کی طرف نماز پڑھ لی تھی، صبح کو خطا ظاہر ہوئی تھی کہ غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھی گئی، اس پر یہ آیت شریفہ نازل ہوئی "اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ"، "ای اذا اشتبهت عليكم القبلة، واذا لم تشتبه القبلة فولوا وجوهكم شطر المسجد الحرام"، فلا تعارض بينهما۔ (روح المعانی)

۵ آیت نمبر ا سے مصلی کو کسی بھی طرف رخ کرنے میں اختیار دینا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ آیت تحویل قبلہ کی تمہید ہے، جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا تو یہود نے اعتراض کیا کہ مسلمان لوگ پہلے تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے اور اب مسجد حرام کی طرف نماز پڑھنے لگے ایسا کیوں کیا؟

حق تعالیٰ شانہ نے اس کا جواب دیا کہ اللہ جل شانہ تمام جہات کے مالک ہیں،

وہ اپنی مصلحت و حکمت سے جس جہت کو چاہیں قبلہ مقرر کر دیں، تمہیں اس پر اعتراض کا کوئی حق نہیں، حق تعالیٰ نے چند مہینوں تک بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا، اس کے بعد بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا جس سے اس بات کو واضح کر دیا کہ کسی خاص جہت کو قبلہ بنانا اس وجہ سے نہیں کہ معوذ اللہ خدا کے تعالیٰ اسی جہت یا اس مکان میں ہے دوسری جہت میں نہیں ہے، حق تعالیٰ کی توجہ تو ہر سمت میں برابر ہے، حق تعالیٰ جہت و مکان سے منزہ ہیں، کسی جہت و مکان کے ساتھ مقید و محدود نہیں ہیں، لہٰذا تم لوگ جس طرف بھی منہ کرو اُدھر ہی اللہ کی ذات موجود ہے۔ (تفسیر روح المعانی، بیان القرآن)

۵ آیت نمبر ا منسوخ ہے آیت نمبر ۲ سے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے، ابتداء میں اختیار تھا جس طرف چاہے منہ کر کے نماز پڑھ لی جائے، پھر اس کو منسوخ کر دیا گیا اور بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیدیا گیا۔ فلا تعارض بعد النسخ۔ (الاتقان فی علوم القرآن)

حق تعالیٰ کو مخلوق کے ساتھ مشابہت ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱، ۶، ۸، ۱۱، ۱۶، ۱۷، ۱۹، ۲۱، ۲۳، ۲۴،
۲۵، ۲۶، ۲۷، ۳۰

آیات

① ﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ (پارہ ۱ رکوع ۱۴ سورۂ بقرہ جلالین ص ۱۸)

② ﴿ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللّٰهِ﴾ (پارہ ۲۱ رکوع ۷ سورۂ روم جلالین ص ۳۴۳)

③ ﴿تُرِيدُونَ وَجْهَ اللّٰهِ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ﴾

(پارہ ۲۱ رکوع ۷ سورۂ روم جلالین ص ۳۴۳)

④ ﴿وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾

(پارہ ۲۷ رکوع ۱۲ سورۂ رحمٰن جلالین ص ۴۴۴)

⑤ ﴿إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلٰى﴾ (پارہ ۳۰ رکوع ۱۷ سورۂ لیل جلالین ص ۵۰۱)

⑥ ﴿بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ﴾ (پارہ ۶ رکوع ۱۴ سورۂ مائدہ جلالین ص ۱۰۳)

⑦ ﴿فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ﴾

(پارہ ۲۳ رکوع ۴ سورۂ یٰس جلالین ص ۳۷۳)

⑧ ﴿يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ﴾ (پارہ ۲۶ رکوع ۹ سورۂ فتح جلالین ص ۴۲۴)

⑨ ﴿وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِينِهِ﴾ (پارہ ۲۴ رکوع ۴ سورۂ زمر جلالین ص ۳۹۰)

⑩ ﴿وَأَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ﴾

(پارہ ۲۷ رکوع ۲۰ سورۂ حدید جلالین ص ۴۵۴)

(۱۱) ﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾

(پارہ ۲۹، رکوع ۱، سورۂ ملک جلالین ص ۴۶۶)

(۱۲) ﴿اَوْ یَاْتِیَ رَبُّكَ اَوْ یَاْتِیَ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ﴾

(پارہ ۸، رکوع ۷، سورۂ انعام جلالین ص ۱۲۸)

(۱۳) ﴿اَفَلَا یَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا﴾

(پارہ ۱۷، رکوع ۴، سورۂ انبیاء جلالین ص ۲۷۳)

(۱۴) ﴿وَقَدِمْنَاۤ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾

(پارہ ۱۹، رکوع ۱، سورۂ فرقان جلالین ص ۳۰۲)

(۱۵) ﴿وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ (پارہ ۳۰، رکوع ۱۳، سورۂ فجر جلالین ص ۴۹۸)

(۱۶) ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ (پارہ ۸، رکوع ۱۴، سورۂ اعراف جلالین ص ۱۳۴)

(۱۷) ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾

(پارہ ۱۱، رکوع ۶، سورۂ یونس جلالین ص ۱۷۰)

(۱۸) ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾ (پارہ ۱۶، رکوع ۱۰، سورۂ طٰہٰ جلالین ص ۲۶۰)

(۱۹) ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِیْرًا﴾

(پارہ ۱۹، رکوع ۳، سورۂ فرقان جلالین ص ۳۰۷)

(۲۰) ﴿لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ﴾ (پارہ ۲۵، رکوع ۳، سورۂ شوریٰ جلالین ص ۴۰۳)

تشریح تعارض

پہلی پانچ آیات میں حق تعالیٰ کے لئے وجہ (چہرہ) ہونے کا ثبوت ہے، اس کے بعد آیت نمبر ۶ تا ۱۱ میں ید اور یمین، یعنی ہاتھ کا ثبوت ہے، اس کے بعد آیت نمبر ۱۲ تا ۱۵ میں حق تعالیٰ کے لئے آمد و اتیان کو ثابت کیا گیا ہے، اس کے بعد آیت نمبر ۱۶ تا ۱۹ میں استواء علی العرش یعنی عرش پر بیٹھنا ثابت کیا گیا ہے، استواء کے معنی جلوس

کے آتے ہیں، ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کے لئے بھی مخلوق کی طرح اعضاء و جوارح ہیں، چہرہ بھی ہے، ہاتھ پاؤں بھی ہیں جن سے پکڑتے ہیں اور چلتے پھرتے، آتے جاتے ہیں اور حق تعالیٰ تخت پر بھی بیٹھتے ہیں، ان آیت سے حق تعالیٰ کا مخلوق کے مشابہ و مماثل ہونا لازم آتا ہے اور اخیر کی آیت نمبر ۲۰ میں فرمایا کہ اللہ کے مثل کوئی شے نہیں ہے، حق تعالیٰ جسمیت اور اعضاء و جوارح اور مماثلت مخلوق سے بالکل منزہ و مقدس ہے، پس اخیر کی یہ آیت پہلی آیات کے بظاہر معارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی آیات جن سے تشبیہ و تجسیم کا شبہ ہوتا ہے آیات متشابہات کہلاتی ہیں، جن میں علماء کے دو مسلک ہیں: (۱) مسلک تفویض، (۲) مسلک تاویل۔ مسلک تفویض کا مطلب یہ ہے کہ ان کے معانی و مفاہیم کو حق تعالیٰ کے علم پر محمول کر دیا جائے۔ یعنی یوں کہا جائے کہ حق تعالیٰ ہی ان کے مفہوم و مراد سے واقف ہیں، ہم اپنی طرف سے ان کی کوئی تاویل و تفسیر نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے اذہان و عقول ناقص ہیں، اگر ہم اپنی عقل و رائے سے کوئی تاویل و تفسیر کرتے ہیں تو اندیشہ ہے کہ وہ مراد حق کے خلاف ہو اس لئے سکوت و تسلیم ہی اسلم ہے، یہ طریق اسلم کہلاتا ہے۔

حضرات سلف صالحین نے اسی مسلک تفویض کو اختیار کیا ہے جیسے امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد، امام شافعی، محمد بن حسن، سعد بن معاذ مروزی، عبداللہ بن مبارک، ابو معاذ خالد بن سلیمان، سفیان ثوری، اسحاق بن راہویہ، محمد بن اسماعیل بخاری، ابو عیسیٰ ترمذی، ابو داؤد سجستانی، قاضی ابو العلاء رحمہم اللہ تعالیٰ۔ صاعد بن محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے کتاب الاعتقاد میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "لا ینبغی

لاحد أن ينطق في الله تعالى بشيء من ذاته، ولكن يصفه بما وصف سبحانه به نفسه، ولا يقول فيه برايه شيئا، تبارك الله رب العالمين.''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ اہل قرون ثلاثہ کا اس پر اتفاق ہے جن کے خیر القرون ہونے کی صاحب شریعت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے شہادت دی ہے، امام الحرمین شیخ ابو المعالی عبد الملک بن عبد اللہ الجوینی رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ نظامیہ میں اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔

امام ابو الحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب میں جو اختلاف المضلین و مقالات الاسلامیین کے موضوع پر تصنیف کی ہے اسی کو اختیار کیا ہے اور اپنی کتاب ''الابانۃ فی اصول الدیانۃ'' میں اسی کو اختیار کرتے ہیں، قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ بھی ''طوالع'' میں فرماتے ہیں کہ آیاتِ متشابہات میں اولی و بہتر سلف صالحین کی اتباع کرنا ہے اور اللہ کو تشبیہ و تجسیم سے منزہ مانتے ہوئے ان آیات کا علم حق تعالیٰ کے سپرد کر دینا ہے، محققین صوفیاء کرام بھی مسلکِ تفویض ہی کے قائل ہیں۔

دوسرا مسلک مسلکِ تاویل ہے، تاویل کا مطلب یہ ہے کہ ان الفاظ متشابہات کے ایسے معانی و مفاہیم بیان کئے جائیں جو حق تعالیٰ کی شان کے مناسب ہوں جن سے تشبیہ و تجسیم لازم نہ آئے، یہ مسلک حضرات متاخرین نے اختیار کیا ہے، امام الحرمین رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب ''الارشاد'' میں مسلک تاویل ہی کی طرف مائل ہیں، حق تعالیٰ نے ان حضرات کے قلوب پر الفاظ متشابہات کے ایسے معانی و مفاہیم منکشف فرمائے ہیں جو حق تعالیٰ کی شان جلالت کے مناسب اور تشبیہ و تجسیم سے بالکل منزہ و مقدس ہیں، یہ طریق طریق احکم کہلاتا ہے، چنانچہ یہ حضرات ان مذکورہ آیات متشابہات میں مندرجہ ذیل تاویلات کرتے ہیں۔

پہلی پانچ آیات میں ''وجہ'' سے مراد ذات ہے، چنانچہ محاورہ میں وجہ بول کر ذات کو مراد لیا جاتا ہے جیسے کوئی شخص کسی پر غصہ ہوتے ہوئے کہتا ہے تو آج سے مجھ کو

اپنا چہرہ مت دکھانا، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھ سے دور اور پوشیدہ ہو جاؤ، میرے قریب بالکل نہ آنا۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ چہرہ پر نقاب ڈال کر میرے پاس آجایا کرنا، چہرے کے علاوہ باقی اعضاء مجھ کو دکھا دیا، صرف چہرہ مت دکھانا۔ بلکہ چہرہ بول کر پوری ذات مراد ہوا کرتی ہے، ایسی آیت میں بھی وجہ سے مراد ذات ہے۔ فثم وجه الله أی ذات الله، یریدون وجه الله أی ذات الله، و یبقی وجه ربك أی ذات ربك وغیرہ۔

اور آیت نمبر ۶ تا ۱۱ میں ید اور یمین سے مراد قوت ونصرت ہے ید الله فوق ایدیھم ای قوۃ الله ونصرۃ الله فوق قوتھم ونصرتھم اور مطویات بیمینه میں یمین سے مراد قدرت ہے کہ آسمان حق تعالیٰ کی قدرت سے لپٹے ہوں گے اور یداہ مبسوطتان میں بسط یدین سے مراد سخاوت ہے، سخی آدمی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ یا ید سے مراد نعمت ہے کہ اللہ کی دونوں نعمتیں نعم دنیوی و نعم اخروی یا نعم ظاہرہ و باطنہ وسیع اور پھیلی ہوئی ہیں۔

اور آیت نمبر ۱۲ تا ۱۵ میں یأتی ربك اور جاء ربك میں مضاف محذوف ہے یأتی امر ربك اور جاء امر ربك، اور قدمنا الی ماعملوا میں قدوم سے مراد قصد وارادہ ہے ای عمدنا وقصدنا الی ماعملوا من عمل۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی تفسیر منقول ہے، ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے مجاہد سے یہی معنی نقل کئے ہیں۔

اور آیت نمبر ۱۶ تا ۱۹ میں استواء سے مراد استیلاء اور غلبہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ عرش پر غالب و مستولی ہیں، یا استواء کنایہ ہے ملک سے جیسا کہ علامہ زمخشری نے یہی معنی کئے ہیں کہ حق تعالیٰ عرش کے مالک ہیں، ملکیت و جلوس و استواء سے تعبیر کر دیا جاتا ہے کہا جاتا ہے فلاں استوی علی العرش کہ فلاں شخص شاہی تخت پر بیٹھ گیا ہے، آج کل وزارت کی کرسی پر فلاں شخص بیٹھا ہے۔ ان جملوں سے مراد یہ ہوتی

ہے کہ شاہی تخت کا مالک وزیری وزارت کا مالک فلاں شخص ہے، حقیقۃً جلوس واستواء مراد نہیں ہوتا کیونکہ یہ جملہ "مسند وزارت کی کرسی پر فلاں شخص بیٹھا ہے" اس وقت بھی کہا جاتا ہے جب کہ وزیر کرسی پر نہ بیٹھا ہو بلکہ کسی ضرورت سے باہر سفر پر گیا ہوا ہو، معلوم ہوا کہ جلوس واستواء سے مراد بیٹھنا نہیں بلکہ مالک ہونا ہے کہ حق تعالیٰ عرش کے مالک ہیں، یا استویٰ کے معنی علا علی العرش لئے جائیں کہ حق تعالیٰ عرش پر بلند ہیں۔

بہرحال ان تاویلات و معانی کے بعد حق تعالیٰ کے لئے جسمیت واعضاء و جوارح اور مشابہت ومماثلت بالمخلوق کا ہونا لازم نہیں آئے گا اور ان آیات اور آیت لیس کمثلہ شیء میں کوئی تعارض نہیں رہے گا۔ (روح المعانی وغیرہ)

مرتکب کبیرہ مؤمن ہے یا کافر؟

پارہ نمبر: ۲، ۶، ۲۶، ۲۸، ۱۸، ۲۱

آیات

① ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى﴾

(پارہ ۲، رکوع ۶، سورۃ البقرۃ، آیت نمبر ۱۷۸)

② ﴿وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾

(پارہ ۲۶، رکوع ۱۳، سورۃ الحجرات، آیت نمبر ۹)

③ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾

(پارہ ۲۸، رکوع ۲۰، سورۃ التحریم، آیت نمبر ۸)

④ ﴿وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾

(پارہ ۶، رکوع ۱۰، سورۃ المائدۃ، آیت نمبر ۴۴)

⑤ ﴿وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾

(پارہ ۱۸، رکوع ۱۳، سورۃ النور، آیت نمبر ۵۵)

⑥ ﴿أَفَمَن كَانَ مُؤْمِنًا كَمَن كَانَ فَاسِقًا﴾

(پارہ ۲۱، رکوع ۱۵، سورۃ السجدۃ، آیت نمبر ۱۸)

تشریح تعارض

مذکورہ تین آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتکب کبیرہ مؤمن رہتا ہے ایمان سے خارج نہیں ہوتا کیونکہ آیت نمبر ۱ میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے یعنی اے ایمان والو! تم پر مقتولین کے بارے میں قصاص فرض کیا گیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی کسی کو قتل کر دے تو قاتل کو قصاصاً قتل کیا جائے۔ اور قتل کرنا گناہ کبیرہ ہے اس کے باوجود حق تعالیٰ نے یا

ایہا الذین آمنوا کے ساتھ خطاب کیا ہے، معلوم ہوا کہ گناہ کبیرہ کرنے سے آدمی ایمان کے ساتھ متصف رہتا ہے کافر نہیں ہوتا، اسی طرح آیت نمبر ۲ میں آپس میں قتل وقتال کرنے والی جماعتوں کو مومنین سے تعبیر کیا ہے اور آیت نمبر ۳ میں توبہ کا حکم دیا ہے اور توبہ کا مخاطب مرتکب کبیرہ ہے، اس کے باوجود یا ایہا الذین آمنوا کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، ان تمام آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا اور اخیر کی تین آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتکب کبیرہ کافر ہو جاتا ہے کیونکہ آیت نمبر ۴ میں ارشاد ہے کہ جو لوگ اللہ کے نازل شدہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ لوگ کافر ہیں، اور خلاف شریعت فیصلہ کرنا گناہ کبیرہ ہے، اس کے مرتکب کو حق تعالیٰ نے کافر بتایا ہے، اسی طرح آیت نمبر ۵ میں فرمایا کہ "جو اس کے بعد کفر کریں وہی لوگ فاسق ہیں" کفر کرنے والے کو فاسق بتایا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق اور کافر دونوں ایک ہیں، بلکہ مبتداء وخبر کے درمیان ضمیر فصل لا کر حصر کیا گیا ہے کہ کافر ہی فاسق ہے، کافر کے علاوہ کوئی فاسق نہیں، معلوم ہوا کہ ہر فاسق کافر ہے اور فاسق مرتکب کبیرہ ہوتا ہے، پس لازم آیا کہ ہر مرتکب کبیرہ کافر ہے، ایسے ہی آیت نمبر ۶ میں فرمایا "کیا وہ شخص جو مومن ہو وہ فاسق کی طرح ہو سکتا ہے؟" یہ استفہام انکاری ہے یعنی مومن وفاسق دونوں برابر نہیں ہیں بلکہ دونوں میں مغایرت ہے، جو مومن ہے وہ فاسق نہیں، جو فاسق ہے وہ مومن نہیں، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فاسق مومن نہیں رہتا بلکہ کافر ہو جاتا ہے، خلاصہ یہ ہوا کہ پہلی تین آیتوں سے معلوم ہوا کہ مرتکب کبیرہ مومن ہے، کافر نہیں اور اخیر کی تین آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مرتکب کبیرہ کافر ہے، مومن نہیں، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ اصل بات تو وہی ہے جو پہلی تین آیتوں میں مذکور

ہے کہ مرتکب کبیرہ مومن رہتا ہے اور آخر کی تین آیات جو مرتکب کبیرہ کے کافر ہونے پر دال ہیں یا اپنے ظاہر پر محمول نہیں ہیں بلکہ ان میں تاویل کی جائے گی جس سے ان آیات میں تطبیق پیدا ہو جائے اور تعارض ختم ہو جائے، چنانچہ آیت نمبر ۴ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ میں چند تاویلات کی گئی ہیں:

① حکم کا اطلاق اگرچہ عمل قلبی اور عمل جوارح دونوں پر ہوتا ہے مگر یہاں عمل قلبی مراد ہے جس کو تصدیق کہا جاتا ہے اور ومن لم يحكم الخ کے معنیٰ ومن لم يصدق بما انزل الله ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ کی طرف سے نازل شدہ امور کی تصدیق نہ کرے وہ کافر ہے۔ (روح المعانی)

② من لم يحكم بما انزل الله على سبيل الاستہانة مراد ہے کہ جو شخص ما انزل اللہ کی توہین و تحقیر کرتے ہوئے اس کے مطابق حکم نہ لگائے وہ کافر ہے اور ظاہر ہے کہ احکام منزلہ من اللہ کی توہین و تحقیر کرنا کفر ہے۔ (الجمل، تفسیر ابوالسعود)

③ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ میں کلمہ ما نکرہ ہے جو تحت النفی واقع ہے اور نکرہ تحت النفی عموم کا فائدہ دیتا ہے، مطلب یہ ہوگا من لم يحكم بشيء مما انزل الله فاولئك هم الكافرون "کہ جو شخص اللہ کی طرف سے نازل شدہ امور میں سے کسی شئے کا بھی حکم نہ لگائے وہ کافر ہے" اور ما انزل اللہ میں ایمان و توحید بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جو ایمان و توحید کا بھی حکم نہ لگائے اس کے کافر ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ (روح المعانی، والنبراس)

④ یہ آیت خاص کر یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ اللہ کی نازل شدہ آیات میں تحریف کرتے تھے اور تورات کے احکام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تھے، ان کے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ لوگ کافر ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مروی ہے۔ (خازن، روح المعانی)

اسی طرح آیت نمبر ۵ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ میں

بھی مختلف تاویلات کی گئی ہیں:

(۱) حضرت ابوالعالیہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اس آیت میں کفر سے مراد کفرانِ نعمت یعنی ناشکری ہے، وہ کفر مراد نہیں جو ایمان کا مقابل ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو اللہ کی جانب سے عطا ہونے والے اس قدر انعامات کے بعد اس کی ناشکری کریں گے، وہ لوگ فاسق ہیں، آیت کے سیاق سے بھی معلوم ہوتا ہے، حق تعالیٰ نے اس آیت میں مومنین صالحین سے وعدہ فرمایا ہے کہ ہم تم کو زمین میں حکومت عطا فرمادیں گے جس طرح قبطیوں کو ہلاک کر کے بنی اسرائیل کو مصر و شام پر حکومت عطا فرمائی تھی، اور دینِ اسلام میں قوت عطا فرمائیں گے اور دشمنوں کی طرف سے ہونے والے خوف کو امن و سکون سے بدل دیں گے اور ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں اللہ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں جن پر اللہ کا شکر ادا کرنا ضروری ہے، جو ان نعمتوں کی ناشکری کرے وہ فاسق ہے، مفسرین رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے ان نعمتوں کی ناشکری کرنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کیا۔ (روح المعانی، مدارک، الخازن، الجامع، قرطبی)

(۲) فسق سے مراد فسقِ کامل ہے اور فسقِ کامل کفر کہلاتا ہے، مطلب آیت کا یہ ہے کہ مومنین میں سے جو شخص ان نعمتوں کے وعدوں کے حصول کے بعد مرتد ہو جائے وہ بہت بڑا فاسق ہے، کامل فی الفسق ہے اور کامل فی الفسق مرتد اور کافر ہوتا ہے۔

(روح المعانی)

(۳) آیت شریفہ میں کافر کا فاسق پر جو حصر کیا ہے کہ کافر ہی فاسق ہے، کافر کے علاوہ کوئی فاسق نہیں ہے، یہ حصر حقیقی نہیں ہے بلکہ حصر اضافی ہے، یعنی مبالغہ مقصود ہے ورنہ تو کافر کے علاوہ بھی فاسق ہوتے ہیں، جیسے مرتکبِ کبیرہ کہ یہ فاسق ہے کافر نہیں ہے کیونکہ اگر آیت میں حصر حقیقی مراد لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ جو آدمی ایمان کے بعد کفر کرے وہی فاسق ہے، اس سے یہ لازم آئے گا کہ جو ایمان سے پہلے کفر

کرے وہ فاسق نہیں ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ حصر حقیقی نہیں ہے، لہٰذا اس سے ہر فاسق کا کافر ہونا لازم نہیں آئے گا۔ ان تاویلات سے بھی واضح ہو گیا کہ آیت شریفہ سے مرتکب کبیرہ کا کافر ہونا لازم نہیں آتا۔

چھٹی آیت: اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا کی تاویل یہ ہے کہ فاسقاً سے مراد مرتکب کبیرہ نہیں بلکہ کافر ہے یعنی اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ كَافِرًا۔ فاسق سے مراد کافر ہونے کا قرینہ ایک تو یہ ہے کہ فاسق مطلق بولا گیا ہے اور المطلق اذا اطلق یراد بہ الفرد الکامل اور کامل فی الفسق کافر ہوتا ہے لان الکفر اعظم الفسوق۔ دوسرا قرینہ آیت کا سیاق ہے، چنانچہ آگے ارشاد ہے: وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ، اور تکذیب کفر ہے، پس معلوم ہوا کہ فسق سے مراد کفر ہے۔ تیسرا قرینہ یہ ہے کہ یہ آیت ولید بن عقبہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالٰی عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، دونوں میں کسی بات پر مباحثہ ہو گیا، ولید بن عقبہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالٰی عنہ سے کہا: اسکت فانک صبی وانا شیخ، خاموش رہو تم ابھی بچے ہو، میں بڑا آدمی ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالٰی عنہ نے فرمایا اسکت فانک فاسق، خاموش ہو جا اس لئے کہ تو فاسق ہے، اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: افمن کان مؤمنا کمن کان فاسقا لا یستوون، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ فاسق سے مراد کافر ہے، پس اس آیت سے بھی مرتکب کبیرہ کا کافر ہونا ثابت نہیں ہوتا ہے، لہٰذا ان آیات میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ (خازن، مدارک، احمدی)

رمضان کی راتوں میں، اکل و شرب و جماع بعد النوم حلال ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ٢

آیات

(١) ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ﴾

(پارہ ٢ رکوع ٧ سورۂ بقرۃ جلالین ص: ٢٦) ✦

(٢) ﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۔ إلى قوله ۔ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ (پارہ ٢ رکوع ٧ سورۂ بقرہ جلالین ص: ٢٨)

تشریح تعارض

آیت نمبر ١ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اور جس کیفیت کے ساتھ امم سابقہ پر روزے فرض تھے، اسی کیفیت کے ساتھ امت محمدیہ پر روزے فرض کئے گئے اور امم سابقہ پر روزوں کی کیفیت یہ تھی کہ رات میں سونے سے قبل تو کھانا، پینا اور جماع کرنا حلال تھا مگر سونے کے بعد اکل و شرب اور جماع حرام ہو جاتا تھا، اگر طلوع فجر سے قبل رات میں آدمی کسی وقت بیدار ہوتا تو اس کے لئے کھانا، پینا، جماع کرنا جائز نہیں تھا، كَمَا كُتِبَ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی کیفیت امت محمدیہ کے روزوں کی ہے کہ رات میں سونے کے بعد اکل و شرب اور جماع حرام ہے اور آیت نمبر ٢ سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی رات میں طلوع فجر سے پہلے پہلے اکل و شرب اور جماع حلال ہے، پس دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیتِ اولیٰ آیتِ ثانیہ سے منسوخ ہے، یعنی ابتداءِ اسلام میں یہی حکم تھا کہ رمضان کی راتوں میں سونے کے بعد اکل و شرب اور جماع کی اجازت نہیں تھی، پھر یہ حکم منسوخ کر دیا گیا اور اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ، اور كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ الخ کہہ کر طلوعِ فجر سے پہلے پہلے تک اکل و شرب، جماع کی اجازت دیدی گئی جیسا کہ امام احمد وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ولا تعارض بعد النسخ۔ (الروض النضیر)

❷ كَمَا كُتِبَ سے صرف نفسِ وجوب میں تشبیہ مقصود ہے، طریقِ ادا اور تحدیدِ اوقات وغیرہ تمام امور میں تشبیہ مقصود نہیں ہے، آیتِ اولیٰ کا مطلب صرف یہ ہے کہ امم سابقہ پر بھی روزے فرض کئے گئے، تم پر بھی فرض کر دیئے گئے اگرچہ دونوں کے طریقِ ادا اور کیفیت میں اختلاف ہے کہ ان پر رات میں اکل و شرب و جماع بعد النوم حرام تھا اور تمہارے لئے حلال ہے، اس سے مسلمانوں کی دلجوئی مقصود ہے کہ روزہ کی فرضیت تمہارے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے، امم سابقہ پر بھی روزے فرض تھے، روزہ اگرچہ مشقت کی چیز ہے مگر یہ مشقت تم سے پہلے لوگ بھی برداشت کرتے آئے ہیں اور یہ طبعی بات ہے کہ جب مشقت میں بہت سے لوگ مبتلا ہوں تو وہ ہلکی معلوم ہوتی ہے بلکہ تمہارے لئے تو آسانی کر دی گئی کہ اکل و شرب و جماع بعد النوم رات میں حلال کر دیا گیا، امم سابقہ کے لئے حرام تھا۔ اس تفسیر کے بعد دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں رہا، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے الفوز الکبیر میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ (الفوز الکبیر، روح المعانی وغیرہ)

رمضان کا روزہ ہی رکھنا ضروری ہے یا فدیہ بھی دیا جاسکتا ہے؟

پارہ نمبر ۲

آیات

① ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾

(پارہ:۲، رکوع:۷، سورۂ بقرہ، جلالین ص:۲۶)

② ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (پارہ:۲، رکوع:۷، سورۂ بقرہ، جلالین ص:۲۶)

تشریح تعارض

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں مگر روزہ رکھنا نہ چاہیں تو ان کو اجازت ہے کہ وہ ایک روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلا کر فدیہ ادا کریں، یعنی جس کا دل چاہے روزہ رکھے، جس کا جی چاہے روزہ کے بدلہ میں فدیہ ادا کردے اور آیت ثانیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی رمضان کے مہینہ میں موجود ہو اس پر روزہ رکھنا فرض ہے، فدیہ دینے کا اختیار نہیں، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے چھ جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ آیت ثانیہ سے منسوخ ہے، ابتداء میں چونکہ لوگ روزہ رکھنے کے عادی نہیں تھے، روزہ رکھنے میں دشواری ہوتی تھی تو حق تعالیٰ نے آسانی فرمادی تھی اور

صوم و فدیہ میں اختیار دے دیا تھا کہ جس کا جی چاہے روزہ رکھ لے جو چاہے فدیہ ادا کر دے، جب رفتہ رفتہ لوگ عادی ہو گئے تو روزہ رکھنا لازم کر دیا گیا اور فدیہ کا اختیار منسوخ فرما دیا، روایت صحیحہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔

﴿عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: لَمَّا نَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ كَانَ مَنْ شَاءَ مِنَّا صَامَ، وَمَنْ شَاءَ أَفْطَرَ وَيَفْتَدِيْ، فَعَلَ ذٰلِكَ حَتّٰى نَزَلَتِ الْآيَةُ الَّتِيْ بَعْدَهَا، فَنَسَخَتْهَا فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (رواہ البخاری و مسلم و ابو داؤد و ترمذی والنسائی والطبرانی وغیرہ، روح المعانی ج ۲ ص ۵۸)

ترجمہ: ”حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب آیت: وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ الخ نازل ہوئی تو ہم میں سے جو چاہتا روزہ رکھ لیتا اور جو چاہتا افطار کرتا اور جو فدیہ ادا کرنا چاہتا وہ فدیہ ادا کر دیتا، یہاں تک کہ اس کے بعد والی آیت: فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ نازل ہوئی، اس آیت نے پچھلی آیت کو منسوخ کر دیا۔“

اور ظاہر ہے کہ نسخ کے بعد کوئی تعارض نہیں رہتا۔

❷ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت نمبر ۱ ایسے مریض کے بارے میں ہے جو بیمار تو ہے مگر اس کی بیماری اس درجہ کی نہیں ہے کہ روزہ کی طاقت نہ ہو بلکہ وہ روزہ رکھ سکتا ہے مگر ضعف و مرض کی وجہ سے روزہ رکھنا دشوار معلوم ہوتا ہے، اس کو حق تعالیٰ نے ابتداء میں اختیار دے دیا تھا کہ جی چاہے روزہ رکھ لے اور جی چاہے روزہ کے بدلے میں فدیہ ادا کر دے، پھر یہ حکم منسوخ فرما دیا کہ رمضان کے مہینے میں ہر شخص کو روزہ رکھنا ضروری ہے، البتہ مریض کے لئے اتنی سہولت ہے کہ وہ ماہِ رمضان میں افطار کر لے، جب تندرست ہو جائے تو روزہ کی قضاء کر لے، روزہ کے بدلے میں فدیہ

دینا جائز نہیں۔ ولا تعارض بعد النسخ۔ (تفسیر خازن)

❸ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ الخ میں لا حرف نفی مقدر ہے ای وعلی الذین لایطیقونه، حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک قرأت وعلی الذین لایطیقونه مروی ہے جیسا کہ روح المعانی میں مذکور ہے اور یہ آیت شیخ فانی کے بارے میں ہے کہ جو لوگ بوڑھے، انتہائی عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں وہ ہر روزہ کے بدلہ میں فدیہ ادا کردیں، اور آیت نمبر ۲ جوانوں اور طاقتور بوڑھوں سے متعلق ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں کیونکہ جب دو متعارض چیزوں کا مصداق جدا جدا ہو تو تعارض نہیں رہتا۔

❹ يُطِيْقُوْنَهٗ باب افعال سے ہے اور باب افعال کا ہمزہ کبھی سلب ماخذ کے لئے ہوتا ہے جیسے افلس الرجل یعنی اس کے پاس فلوس (پیسے ختم) ہوگئے، وہ شخص مفلس ہوگیا۔ اشکیتہ میں نے اس کی شکایت کو دور کردیا، ختم کیا، اسی طرح یہاں پر یطیقونه کے معنی یہ ہوں گے کہ جن لوگوں میں روزہ کی طاقت نہیں رہی وہ فدیہ ادا کرسکتے ہیں، لہٰذا لا نفی مقدر ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، دفع تعارض کی توجیہ اس صورت میں بھی وہی رہے گی جو اوپر گزری کہ یہ آیت شیخ فانی کے بارے میں ہے اور آیت نمبر ۲ غیر شیخ فانی کے بارے میں۔ فلا تعارض۔

❺ ایک توجیہ ایسی کی گئی ہے جس میں نہ حرف نفی مقدر ماننے کی ضرورت ہے اور نہ ہمزۂ افعال کو سلب کے لئے ماننے کی ضرورت، اس کے باوجود یہ آیت شیخ فانی کے بارے میں رہتی ہے، وہ توجیہ یہ ہے کہ لغت عرب اور ان کے طرز کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں شئے پر قادر ہونے کی مختلف تعبیرات ہوتی ہیں اور تعسر و دشواری کی کمی بیشی کے لحاظ سے قدرت کے مختلف درجات ہوتے ہیں، جس کا ادنیٰ درجہ استطاعت اور آخری درجہ اطاقۃ ہے، لفظ اطاقۃ اس جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں کسی کام کے کرنے میں انتہائی مشقت ہو، چنانچہ یہ نہیں کہا جاتا: انی اطیق ان ارفع

اللقمة الى فمی "کہ میں اپنے منہ تک لقمہ اٹھانے کی طاقت رکھتا ہوں" اس لئے کہ لقمہ اٹھانا ایک آسان چیز ہے اس میں کوئی مشقت نہیں، البتہ یہ کہا جاتا ہے: انی اطیق ان احمل ھذا الحجر الثقیل "کہ میں یہ بھاری پتھر اٹھانے کی طاقت رکھتا ہوں۔" پس آیت شریفہ میں بھی اطاق کا لفظ آیا ہے اس لئے آیت کے معنی اس صورت میں یہ ہوں گے کہ جو لوگ آسانی سے روزہ نہ رکھ پاتے ہوں بلکہ انتہائی شدت وتعب اور مشقت عظیمہ ہی کے ساتھ رکھ پاتے ہوں جیسے شیخ فانی اور بہت ہی بوڑھی عورت، ان کے لئے جائز ہے کہ وہ ہر روزہ کا فدیہ ادا کریں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس آیت میں متعدد قرأتیں منقول ہیں:

① یُطَوَّقُوْنَهٗ بضم الیاء وفتح الطاء وفتح الوا والمشددة، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہی قرأت ہے،

② یُطَیَّقُوْنَهٗ بضم الیاء الاولی وتشدید الیاء الثانیه حضرت سعید ابن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کی یہی قرأت ہے،

③ یَطَّیَّقُوْنَهٗ بتشدید الطاء والیاء الثانیه حضرت مجاہد اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہم کی یہی قرأت ہے،

④ یَتَطَوَّقُوْنَهٗ۔ ان کے معانی کسی کام کو مشقت اور تکلف کے ساتھ کر پانا، ان قرأت کے پیش نظر بھی آیت کے معنی یہی ہوں گے کہ جو لوگ روزہ انتہائی مشقت اور شدت کے ساتھ ہی رکھ پاتے ہوں وہ فدیہ ادا کرسکتے ہیں جیسے شیخ فانی اور عجوزہ کبیرہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد یہی ہے کہ ان الآیة نزلت فی الشیخ الکبیر الھرم والعجوز الکبیرة الھرمة۔

❼ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ "الفوز الکبیر" میں فرماتے ہیں کہ آیت شریفہ میں روزہ کی طاقت اور عدم طاقت سے بحث ہی نہیں ہے اور فِدْیَةٌ

طَعَامُ مِسْكِينٍ سے مراد روزوں کا فدیہ نہیں ہے بلکہ فدیہ سے مراد صدقۂ فطر ہے اور یطیقونہ کی ضمیر فدیہ کی طرف راجع ہے، ترجمہ یہ ہوگا "اور جو لوگ (صاحب نصاب ہونے کی وجہ سے) صدقۂ فطر دینے پر قادر ہیں ان پر صدقۂ فطر واجب ہے جو ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے۔" اس پر دو اشکال ہوتے ہیں ایک یہ کہ اضمار قبل الذکر لازم آرہا ہے اس کا جواب شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیا ہے کہ فدیہ اگرچہ لفظاً موخر ہے مگر ترتیب میں رتبۃً مقدم ہے کیونکہ وعلى الذين يطيقونه خبر مقدم ہے اور فديةٌ طعامُ مسكين مبتداء موخر ہے اور مبتداء کا رتبہ مقدم ہوتا ہے اور جب مرجع رتبۃً مقدم ہو تو اضمار قبل الذکر صرف لفظاً ہوتا ہے جو کہ جائز ہے۔ دوسرا اشکال یہ ہوتا ہے کہ فدیہ مونث ہے اور یطیقونہ میں ضمیر مذکر ہے، ضمیر اور مرجع میں تذکیر و تانیث میں مطابقت نہیں رہی، اس کا جواب شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیتے ہیں کہ فدیہ سے مراد طعام ہے اور طعام مذکر ہے تو فدیہ کو طعام کے معنی میں لے کر ضمیر مذکر اس کی طرف لوٹا دی گئی، لہٰذا اشکال نہ رہا۔ (الفوز الکبیر)

بہر حال شاہ صاحب کے نزدیک اس آیت شریفہ میں روزہ کی طاقت اور عدم طاقت اور فدیہ ادا کرنے سے کوئی گفتگو نہیں ہے، بلکہ اس میں ایک دوسرے حکم یعنی وجوب صدقۂ فطر کو بیان کیا گیا ہے، لہٰذا یہ آیت "فمن شهد منكم الشهر فليصمه" کے معارض نہیں ہے۔ فافہم۔

قرآن پاک لیلۃ القدر میں نازل ہوا یا لیلۃ البراءۃ میں؟

پارہ نمبر ۲، ۲۵، ۳۰

آیات

① ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾

(پارہ ۲، رکوع ۷، سورۂ بقرہ، جلالین ص: ۲۷) ◆

② ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ﴾

(پارہ ۲۵، رکوع ۱۳، سورۂ دخان، جلالین ص ۴۱۰) ◆

③ ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (پارہ ۳۰، رکوع ۲۲، سورۂ قدر، جلالین ص ۵۰۲)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مقدس ماہِ رمضان میں نازل ہوا ہے اور دوسری آیت میں ہے کہ لیلۂ مبارکہ میں نازل ہوا اور لیلۂ مبارکہ کی تفسیر حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ایک جماعت سے لیلۃ البراءۃ یعنی لیلۂ نصف شعبان کے ساتھ منقول ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن پاک شعبان کی پندرھویں رات میں نازل ہوا اور تیسری آیت میں ہے کہ شب قدر میں نازل ہوا ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ آیت ثانیہ میں لیلۂ مبارکہ سے مراد لیلۃ البراءۃ

نہیں ہے بلکہ لیلۃ القدر ہی مراد ہے، اکثر مفسرین رحمہم اللہ تعالیٰ اسی کے قائل ہیں، روح المعانی میں ہے ھی لیلۃ القدر علی ماروی عن ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہ وقتادۃ وابن جبیر ومجاھد وابن زید والحسن وعلیہ اکثر المفسرین، تفسیر مدارک میں ہے (فی لیلۃ مبارکۃ) ای لیلۃ القدر اولیلۃ النصف من شعبان وقیل بینہا وبین لیلۃ القدر اربعون لیلۃ والجمہور علی الاول۔ تفسیر کبیر میں ہے "اختلفوا فی ھذہ اللیلۃ المبارکۃ فقال الاکثرون انہا لیلۃ القدر" بیان القرآن میں ہے کہ لیلۃ المبارکۃ کی تفسیر اکثر حضرات نے شب قدر سے کی ہے، معارف القرآن میں ہے کہ لیلہ مبارکہ سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک شب قدر ہے۔ لیلہ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہونے کے متعدد دلائل ہیں جن کو امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کبیر میں مفصل ذکر کیا ہے:

(۱) سورۂ دخان کی آیت میں انزال قرآن کی رات کو لیلہ مبارکہ کہا گیا ہے، کوئی تصریح نہیں کی گئی کہ یہ لیلۃ القدر ہے یا لیلۃ البراءۃ اور سورۂ قدر کی آیت میں تصریح ہے کہ "اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ" والقرآن یفسر بعضہ بعضاً، پس معلوم ہوا کہ لیلۃ البراءۃ سے مراد لیلۃ القدر ہے۔

(۲) سورۂ دخان میں تو فرمایا کہ ہم نے قرآن لیلہ مبارکہ میں نازل کیا اور سورہ بقرہ میں ہے کہ شہر رمضان میں نازل کیا، اس سے معلوم ہوا کہ لیلہ مبارکہ ماہ رمضان میں واقع ہوتی ہے اور رمضان میں واقع ہونے والی لیلۃ القدر ہے نہ کہ لیلۃ البراءۃ، کیونکہ وہ تو شعبان میں ہوتی ہے، پس معلوم ہوا کہ لیلہ مبارکہ شب قدر ہے۔

(۳) سورۂ قدر میں لیلۃ القدر کی جو صفات مذکور ہیں وہ موافق و متقارب ہیں ان صفات کے جو لیلہ مبارکہ کی سورۂ دخان میں ذکر کی گئی ہیں، چنانچہ سورۂ قدر میں ہے: "تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ" کہ اس رات میں فرشتے اور روح القدس اپنے رب کے حکم سے ہر امر کو لے کر اترتے ہیں اور سورۂ دخان میں ہے:

"فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ" "اس رات میں ہر معاملے کو طے کر دیا جاتا ہے۔ ان دونوں باتوں کا مفہوم تقریباً ایک ہی ہے، سورۂ قدر میں ہے یاذن ربھم، سورۂ دخان میں ہے اَمْرًا مِنْ عِنْدِنَا ان دونوں کا مفہوم قدر، سورۂ قدر میں ہے سلام هي، سورۂ دخان میں ہے رحمة من ربك، ان دونوں (سلامتی و رحمت) کا مفہوم قریب قریب ہے، جب دونوں مقام پر بیان کردہ صفات متقارب ہیں تو لازمی طور پر اس کا نتیجہ نکلتا ہے کہ لیلہ مبارکہ اور لیلۃ القدر دونوں ایک ہیں۔

④ محمد بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں حضرت قتادہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے:

نزلت صحف ابراهيم في اول ليلة من رمضان، والتوراة لست ليال منه والزبور لاثنتي عشر ليلة مضت منه، والانجيل لثمان عشر ليلة مضت منه والقرآن لاربع وعشرين ليلة مضت من رمضان، والليلة المباركة هي ليلة القدر. (تفسیر طبری)

"حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحیفے رمضان کی پہلی شب میں نازل ہوئے اور تورات رمضان کی چھٹی شب میں، زبور بارھویں شب میں اور انجیل اٹھارویں شب میں اور قرآن پاک رمضان کی چوبیسویں شب میں نازل ہوا اور لیلہ مبارکہ لیلۃ القدر ہی ہے۔" تفسیر قرطبی میں یہ روایت حضرت واثلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے۔

⑤ سورۂ دخان میں ہے فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ "اس رات میں ہر معاملہ کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے" اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ لیلۃ القدر میں ہوتا ہے، پس معلوم ہوا کہ لیلہ مبارکہ لیلۃ القدر ہے۔

عن ابن عباس رضي الله تعالى عنه انه قال في ذلك يكتب من ام الكتاب في ليلة القدر ما يكون في السنة من رزق اوموت اوحياة

او مطر حتی یکتب الحاج یحج فلان ویحج فلان. اخرجہ محمد بن نصروا بن المنذر وابن ابی حاتم. (روح المعانی)

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس بارے میں فرمایا کہ شب قدر میں لوح محفوظ سے نقل کر کے وہ تمام امور لکھ دیے جاتے ہیں جو پورے سال میں پیش آنے والے ہیں یعنی رزق، موت، حیات، بارش، یہاں تک کہ یہ بھی لکھ دیا جاتا ہے کہ فلاں فلاں اس سال حج کرے گا۔''

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی مروی ہے:

﴿عن ربیعۃ بن کلثوم قال: کنت عندالحسن، فقال لہ رجل: یا ابا سعید، لیلۃ القدر فی کل رمضان ھی؟ قال: ای واللّٰہ: انہا لفی کل رمضان! وانہا للیلۃ یفرق فیہا کل امر حکیم، فیہا یقضی اللّٰہ تعالیٰ کل اجل و عمل ورزق الی مثلہا. اخرجہ عبد بن حمید وابن جریر.﴾ (روح المعانی)

ترجمہ: ''ربیعہ بن کلثوم رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ میں حضرت حسن رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس تھا، ایک شخص نے ان سے دریافت کیا کہ اے ابو سعید! لیلۃ القدر ہر رمضان میں ہوتی ہے؟ فرمایا خدا کی قسم، وہ ہر رمضان میں ہوتی ہے اور یہی وہ رات ہے جس میں ہر معاملہ طے کر دیا جاتا ہے، اس رات میں حق تعالیٰ اس جیسی آئندہ رات تک ہونے والے تمام امور (موت، عمل، رزق) کے فیصلے فرما دیتے ہیں۔''

ان دلائل خمسہ مذکورہ سے ثابت ہوتا ہے کہ لیلہ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہے۔ رہا حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا قول کہ لیلہ مبارکہ سے مراد لیلۃ البراءۃ ہے سو اس کو علماء نے غیر معتبر قرار دیا ہے، امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں:

﴿واما القائلون بانّ المراد من الیلۃ المبارکۃ المذکورۃ فی

ھذہ الآیۃ ھی لیلۃ النصف من شعبان فما رأیت لھم فیہ دلیلاً یعول علیہ۔﴾

ترجمہ: ''جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ لیلۂ مبارکہ سے مذکورہ فی الآیۃ سے مراد نصف شعبان کی رات ہے میں نے اس بارے میں ان حضرات کی کوئی معتبر دلیل نہیں دیکھی۔''

تفسیر مظہری میں ہے:

﴿وما قیل انھا لیلۃ النصف من شعبان فلیس بشیء۔﴾

حاشیہ کمالین علی تفسیر جلالین میں ہے:

﴿قولہ اولیلۃ النصف من شعبان قال النووی رحمہ اللہ علیہ فی باب صوم التطوع من شرح مسلم انہ احطاوالصواب وبہ قال العلماء انھا لیلۃ القدر۔﴾

بیان القرآن میں ہے کہ یہ تفسیر صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

دراصل ان حضرات نے لیلۂ مبارکہ کی تفسیر لیلۃ القدر کے ساتھ اس روایت کے پیش نظر کر دی ہے جس میں معاملات کا فیصلہ ہونا لیلۂ براءۃ میں مذکور ہے۔ تفسیر ابن کثیر، روح المعانی میں عثمان بن محمد بن المغیرہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایت ہے:

﴿ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم قال: "تقطع الآجال من شعبان الی شعبان حتی ان الرجل لینکح ویولد لہ وقد اخرج اسمہ فی الموتی۔"﴾

ترجمہ: ''رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک شعبان سے دوسرے شعبان تک تمام آجال کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ یہ بھی کہ فلاں شخص نکاح کرے گا اس کے بچے پیدا ہوں گے حالانکہ اس کا نام مردوں میں آچکا ہوتا ہے۔''

مگر اس روایت کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے جو نصوص کے مقابلہ میں قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے:

﴿فهو حديث مرسل ومثله لا يعارض به النصوص﴾

معارف القرآن میں ہے کہ قاضی ابوبکر بن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نصف شعبان کی رات کے بارے میں کوئی قابلِ اعتماد روایت ایسی نہیں ہے جس سے ثابت ہو کہ رزق اور موت وحیات کے فیصلے اس رات میں ہوتے ہیں۔

پھر اس حدیث سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃ البراءۃ میں فیصلے ہوتے ہیں، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن میں جو لیلۂ مبارکہ فرمایا گیا ہے اس سے مراد لیلۃ البراءۃ ہی ہے کسی آیت وروایت میں اس کی تصریح نہیں ہے کہ نزولِ قرآن لیلۃ البراءۃ میں ہوا ہے، جب کہ لیلۃ القدر اور ماہِ رمضان میں نازل ہونا قرآن پاک میں مصرح ہے، البتہ سالانہ معاملات کے فیصلوں کے متعلق روایات میں تعارض ہے کہ لیلۃ القدر میں ہوتے ہیں یا لیلۃ البراءۃ میں، جیسا کہ اوپر دونوں قسم کی روایات مذکور ہوئی ہیں، ان میں تطبیق یہ ہے کہ سالانہ واقعات کے کاغذات لیلۃ البراءۃ میں لوحِ محفوظ سے نقل کر کے لکھنے شروع کر دیے جاتے ہیں اور لیلۃ القدر میں فراغت ہو جاتی ہے، اس رات میں وہ کاغذات ملائکہ کے سپرد کر دیے جاتے ہیں، ارزاق کا رقعہ حضرت میکائیل علیہ الصلاۃ والسلام کے حوالہ کر دیا جاتا ہے اور لڑائیوں، زلزلوں اور بجلیوں وغیرہ کا رقعہ حضرت جبرئیل علیہ الصلاۃ والسلام کے حوالہ کر دیا جاتا ہے اور اعمال کا پرچہ حضرت اسماعیل علیہ الصلاۃ والسلام (جو کہ آسمانی دنیا پر ایک بڑے فرشتے ہیں) کے سپرد کر دیا جاتا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ تطبیق مروی ہے۔

﴿قال: تقضى الاقضية كلها ليلة النصف من شهر شعبان، وتسلم الى اربابها ليلة السابع والعشرين من شهر رمضان.﴾

(روح المعانی)

ترجمہ: "فرمایا کہ تمام فیصلے نصف شعبان کی شب میں کر دیئے جاتے ہیں اور ان امور کو رمضان کی ستائیسویں شب میں ان کے ذمہ دار فرشتوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔"

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بیان القرآن میں فرماتے ہیں کہ لیلۂ مبارکہ کی تفسیر اکثر حضرات نے شب قدر سے کی ہے اور بعض نے اس کی تفسیر لیلۃ البراءۃ سے اس بنا پر کی ہے کہ روایات میں اس کی نسبت بھی واقعات سالانہ کا فیصلہ ہونا آیا ہے لیکن چونکہ کسی روایت میں اس میں قرآن کا نزول وارد نہیں ہے اور شب قدر میں نزول خود قرآن میں مذکور ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ۔ اس لئے یہ تفسیر صحیح نہیں معلوم ہوتی، اور واقعات کا فیصلہ ہونا اس شب میں اس کو مستلزم نہیں ہے کہ قرآن میں جو لیلۂ مبارکہ آیا ہے اس سے مراد یہی ہو، غایت ما فی الباب اس کا قائل ہونا پڑے گا کہ دونوں شب میں واقعات فیصل ہوتے ہیں تو یہ کچھ بعید نہیں بلکہ ممکن ہے کہ واقعات لکھ تو لئے جاتے ہوں شب براءت میں اور سپرد کئے جاتے ہوں شب قدر میں۔

(بیان القرآن)

اس تفصیل سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ لیلۂ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہے پس آیت ثانیہ اور ثالثہ میں تعارض ختم ہو گیا، رہی آیت اولیٰ: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ، سو یہ بھی ان آیتوں کے معارض نہیں ہے اس لئے کہ روایت مرفوعہ صحیحہ سے یہ بات ثابت ہے کہ لیلۃ القدر ماہ رمضان میں ہوتی ہے:

﴿عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ: "تَحَرَّوْا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْوِتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ"﴾

(رواہ البخاری ومسلم واحمد والترمذی، روح المعانی)

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شبِ قدر کو ماہ رمضان کے عشرۂ اخیرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔“

اور بھی بہت سی روایات صحیحہ اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر رمضان میں ہوتی ہے، اکثر حضرات اسی کے قائل ہیں، اسی کو صحیح کہا گیا ہے، صرف حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ لیلۃ القدر نصف شعبان کی شب ہے مگر اس قول کے متعلق روح المعانی میں ہے وهو قول شاذ غريب كما في تحفة المحتاج۔

بہرحال یہ ثابت ہوگیا کہ لیلۃ القدر ماہ رمضان میں ہوتی ہے، اس لئے آیت اولیٰ بھی دوسری دونوں آیتوں کے معارض نہیں رہی۔ فحصل التطبيق بين الآيات وارتفع التعارض فلله الحمد، فافهم واحفظ۔

ابتداءً بالقتال مع الکفار جائز ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر ۲، ۵، ۱۰

آیات

(۱) ﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ (پارہ ۲، رکوع ۸، سورۂ بقرہ، جلالین ص ۲۸)

(۲) ﴿وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ﴾ (پارہ ۲، رکوع ۸، سورۂ بقرہ، جلالین ص ۲۸)

(۳) ﴿وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا﴾ (پارہ ۵، رکوع ۹، سورۂ نساء، جلالین ص ۸۳)

(۴) ﴿فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأُولَٰئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُبِينًا﴾ (پارہ ۵، رکوع ۹، سورۂ نساء، جلالین ص ۸۳)

(۵) ﴿فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ﴾ (پارہ ۱۰، رکوع ۷، سورۂ توبہ، جلالین ص ۱۵۵)

(۶) ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً﴾ (پارہ ۱۰، رکوع ۱۱، سورۂ توبہ، جلالین ص ۱۵۸)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ۱ میں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کے راستے میں انہیں لوگوں سے قتال کرو جو تم سے قتال کرتے ہیں، ان پر زیادتی نہ کرو یعنی قتال کرنے میں ابتداء نہ کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین جہاں بھی ملیں ایک دم ان سے قتال کی ابتداء نہ کی جائے، ہاں اگر وہ قتال کریں تو جواباً ان سے قتال کیا جائے گا اور اخیر کی پانچوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کرو خواہ وہ قتال کریں یا نہ کریں۔ یعنی

ابتداء بالقتال کا حکم دیا گیا ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

1. آیتِ اولیٰ بعد کی پانچوں آیات سے، منسوخ ہے یعنی ابتداء اسلام میں ابتداء بالقتال سے منع کیا گیا کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد کم تھی، اسلام کا ابھی غلبہ نہیں ہوا تھا اس لئے نرمی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا، جب اسلام کو قوت وغلبہ حاصل ہوگیا، مسلمانوں کی تعداد کثیر ہوگئی اور معجزات رسالت وقتاً فوقتاً بار بار ظاہر ہونے کے باوجود بھی مشرکین اپنے شرک پر جمے رہے، ان سے اسلام کی ناامیدی ہوگئی تو حق تعالیٰ نے علی الاطلاق قتال کا حکم دے دیا "فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ" اور "قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً" چنانچہ حضرت ربیعہ بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ قَاتِلُوا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ قتال کے سلسلہ میں سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت ہے جس میں قتال کی ابتداء کرنے سے منع کیا گیا، پھر حق تعالیٰ نے "فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً" اور "وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ" فرما کر تمام مشرکین سے مطلق قتال کا حکم فرما دیا خواہ وہ قتال کریں یا نہ کریں (یعنی ابتداء بالقتال کی اجازت دیدی) پس آیت سیف: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً، اور وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ۔ اس آیت (یعنی آیت نمبر۱) کے لئے ناسخ ہے۔

(جلالین، خازن، تفسیر کبیر، تفسیر مظہری)

2. آیت اولیٰ میں ابتداء بالقتال کرنے یا نہ کرنے سے کوئی بحث نہیں ہے بلکہ اس آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ تم لوگ صرف ان کفار سے قتال کرو جو تمہارے مقابلہ میں قتال کے لئے آسکتے ہیں جن کی طرف سے قتال کی توقع ہے، یعنی عورتوں، بچوں اور زیادہ بوڑھوں اور پادریوں و راہبوں کو جو دنیا سے یکسو ہو کر عبادت میں مشغول رہتے

ہیں، اسی طرح اپاہجوں، معذوروں اور کفار کے یہاں مزدوری اور نوکری کرنے والوں کو جو قتال میں شریک نہیں ہوتے ہیں ان کو جہاد میں قتل نہ کرو اس لئے کہ یہ لوگ قتال میں مقابلہ پر آنے والے نہیں ہیں، اس صورت میں وَلَا تَعْتَدُوْا کا مطلب یہ ہوگا: وَلَا تَعْتَدُوْا بِقَتْلِ الصِّبْيَانِ وَالنِّسَاءِ وَالشُّيُوْخِ الْكِبَارِ وَ الرُّهْبَانِ وَغَيْرِهِمْ مِنَ الَّذِيْنَ لَمْ يُشَارِكُوْا فِي الْقِتَالِ، اس وقت یہ آیت منسوخ نہیں ہوگی بلکہ محکم رہے گی، وهو قول ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہ و مجاہد رحمۃ اللہ علیہ۔ (مظہری، قرطبی وغیرہ)

اور اخیر کی آیات میں جن مشرکین کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان سے مراد بھی مشرکین مقاتلین ہیں وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ میں "هُمْ" ضمیر الذین يقاتلونكم کی طرف راجع ہے اور قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً میں الف لام عہدی ہے مراد مشرکین مقاتلین ہیں۔ یعنی لوجوان اور طاقتور لڑنے والے کفار کو جہاں پاؤ قتل کر ڈالو اور تمام مشرکین مقاتلین سے قتال کرو، پس ان آیات میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ اس تقریر کے بعد ان تمام آیات کا مضمون و مفہوم متحد ہو چکا ہے۔

اشہر حرم میں قتال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۲، ۶، ۱۰

آیات

(۱) ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ﴾
(پ۲، ر۱۱، سورۃ بقرہ، جلالین ص: ۳۲)

(۲) ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ﴾
(پ۶، ر۵، سورۃ مائدہ، جلالین ص: ۹۳)

(۳) ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً﴾
(پ۱۰، ر۱۱، سورۃ توبہ، جلالین ص: ۱۵۸)

تشریحِ تعارض

پہلی دو آیتوں سے اشہر حرم (شوال، ذی القعدہ، ذی الحجہ، رجب) میں قتال کرنے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے کیونکہ آیت نمبر ا میں ارشاد ہے قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ شہر حرم میں قتال کرنا گناہ کبیرہ ہے، اور آیت نمبر ۲ میں فرمایا کہ اللہ کی نشانیوں اور شہر حرام کی بے حرمتی نہ کرو اور شہر حرام میں جب قتال کرنے سے منع کر دیا گیا ہے تو اس میں قتال کرنا اس کی بے حرمتی کرنا ہے، پس مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ شہر حرام میں قتال کر کے اس کی بے حرمتی نہ کرو۔ اور آیت نمبر ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ اشہر حرم میں قتال کرنا ممنوع نہیں ہے کیونکہ اس میں ارشاد ہے کہ تمام مشرکین سے قتال کرو جیسا کہ وہ تم سب سے قتال کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین سے ہر زمانہ ہر مہینہ میں قتال کر سکتے ہو جیسا کہ وہ ہر مہینہ میں تم سے قتال کر لیتے ہیں، خواہ اشہر حرم ہوں یا غیر

اشہرِ حرم میں۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے جلالین میں اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے: "قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَافَّةً أَيْ جَمِيْعًا فِيْ جَمِيْعِ الشُّهُوْرِ كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَافَّةً" اور یہ تفسیر ایک قاعدہ کے تحت کی گئی ہے، قاعدہ یہ ہے کہ عموم اشخاص مستلزم ہوتا ہے عموم احوال، عموم الازمان، عموم الامکنہ کو، تو جب اس آیت میں تمام مشرکین سے قتال کا حکم دیا گیا ہے تو اس کا مطلب قاعدۂ مذکورہ کے پیشِ نظر یہ ہوگا: "اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ جَمِيْعًا فِيْ أَيِّ حَالٍ فِيْ أَيِّ زَمَانٍ وَفِيْ أَيِّ مَكَانٍ" کہ جس حال میں، جس زمانہ میں، جس جگہ پاؤ قتال کرو۔" (جمل)

بہر حال خلاصہ یہ ہوا کہ پہلی دو آیتوں میں اشہرِ حرم میں قتال کی ممانعت اور تیسری آیت میں اجازت ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ پہلی دونوں آیتیں تیسری آیت سے منسوخ ہیں، یعنی ابتداءً اشہرِ حرم میں قتال کرنا ممنوع تھا، بعد میں "وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَافَّةً" نازل فرما کر ممانعت منسوخ کر دی گئی اور اشہرِ حرم و غیر حرم تمام مہینوں میں قتال کی اجازت دے دی گئی، اب کسی بھی مہینہ میں قتال کرنا حرام نہیں ہے، حضرت عطاء خراسانی رحمۃ اللہ علیہ، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ، سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ، ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے، بلکہ جمہور فقہاء نسخ ہی کے قائل ہیں۔ صاحب روح المعانی اور قاضی بیضاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اشہرِ حرم میں قتال کی حرمت کے منسوخ ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔ البتہ ناسخ کی تعیین میں اختلاف ہے، بعض نے تو "قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَافَّةً" کو ناسخ مانا ہے جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے اور بعض نے "فَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ" کو ناسخ مانا ہے بایں طور کہ لفظ "حیث" کو زمانہ کے معنی میں یہ

ہے کہ مشرکین کو جس زمانہ میں پاؤ قتل کردو، بہرحال نسخ کے بعد کوئی تعارض نہیں رہتا کما مر غیر مرۃ۔ (مظہری وخازن وروح المعانی وغیرہ)

❷ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلی دو آیتوں سے اشہرِ حرم میں قتال کی ممانعت پر دلالت ہی نہیں ہے بلکہ یہ آیات تو اس کے جواز پر دلالت کرتی ہیں جیسا کہ پوری آیت کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے، پوری آیت اس طرح ہے:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ، قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَاللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ.

مطلب یہ ہے کہ شہرِ حرام میں قتال کرنا اگرچہ گناہ کی بات ہے لیکن لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکنا اور اسلام سے انکار کرنا اور مسجدِ حرام کی زیارت سے لوگوں کو روکنا اور اہلِ مکہ کو مکہ سے نکالنا یہ سب امور شہرِ حرام میں قتال کرنے سے بھی زیادہ گناہ ہیں اور کفار برابر یہ حرکات کرتے رہتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ شہرِ حرام میں بلاوجہ اور ناحق لڑنا بے شک اشد گناہ ہے مگر جو لوگ کہ حرم میں بھی کفر پھیلائیں اور بڑے بڑے فساد کریں ان سے لڑنا منع نہیں ہے بلکہ ان کی حرکات کی روک تھام کے لئے مقاتلہ جائز ہے کیونکہ اخف کے مقابلہ میں اشد کی مدافعت ضروری ہے۔

جب پہلی دو آیتوں سے قتال فی الشہر الحرام کی ممانعت ثابت ہی نہیں ہوئی تو تیسری آیت کے ساتھ ان کا کوئی تعارض نہیں رہا۔ (الفوز الکبیر وشرح الروض النضیر)

❸ تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے بلکہ محکم ہے، حضرت عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ تعالیٰ قسم کھا کر فرماتے تھے کہ قتال فی الشہر الحرام کی حرمت ہمیشہ کے لئے باقی ہے۔ اور بھی متعدد حضرات تابعین اس حکم کو ثابت اور غیر منسوخ مانتے ہیں، البتہ اس آیت میں قتال فی الشہر الحرام کو جو ممنوع قرار دیا گیا ہے

اس سے مراد ابتداءً قتال ہے کہ اشہرِ حرم میں ابتداءً بالقتال کرنا حرام ہے اور آیت ثالثہ میں قتال فی الاشہر الحرم کی جو اجازت ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اگر مشرکین اشہرِ حرم میں قتال کی ابتداء کریں تو جوابی کارروائی کرتے ہوئے تمہارے لئے بھی اشہرِ حرم میں قتال کرنا جائز ہے، اسی لئے فرمایا: كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً کہ جس طرح یہ مشرکین تم سے ہر مہینہ میں قتال کر لیتے ہیں اشہرِ حرم کی پرواہ نہیں کرتے تم بھی جوابی کارروائی کرتے ہوئے اشہرِ حرم میں ان سے قتال کرو جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے "الشهر الحرام بالشهر الحرام" شہرِ حرام شہرِ حرام کے عوض میں ہے۔ اگر وہ لوگ اس مہینہ کی حرمت کا خیال رکھیں اور قتال نہ کریں تو تم بھی اس کی حرمت کی رعایت کرو اور قتال نہ کرو اور اگر وہ لوگ اس ماہ کی رعایت نہ کرتے ہوئے تم سے اس ماہ میں قتال کریں تو تم بھی جواباً اس ماہ میں ان سے قتال کرو کیونکہ "الحرمات قصاص" حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں، جانبین سے اس کی رعایت ضروری ہے، وہ رعایت کرتے ہیں تم بھی کرو، وہ رعایت نہ کریں تم بھی نہ کرو۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ابتداءً قتال کرنا تو اشہرِ حرم میں ہمیشہ کے لئے حرام ہے کما فی الآیتین الاولیین، البتہ ان کی طرف سے ابتداء کے بعد مدافعانہ قتال کرنا مسلمانوں کے لئے اشہرِ حرم میں جائز ہے کما فی الآیۃ الثالثۃ، پس ان آیات میں کوئی تعارض نہیں رہا۔ (مستفاد من معارف القرآن)

عدتِ وفات چار ماہ دس دن ہے یا ایک سال؟

پارۂ لمبر: ۲

آیات

① ﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجاً يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾ (پارہ: ۲ رکوع: ۱۴ سورۂ بقرہ و جلالین ص: ۳۶)

② ﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجاً وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ﴾ (پارہ: ۲ رکوع: ۱۵ سورۂ بقرہ و جلالین ص: ۳۷)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ متوفی عنہا زوجہا کی عدتِ وفات چار ماہ دس دن ہے اور دوسری آیت میں ہے کہ یہ عورت ایک سال تک انتظار کرے گی اور اس کا نفقہ ایک سال تک شوہر کے ذمہ رہے گا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عدت وفات ایک سال ہے، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ دوسری آیت پہلی آیت سے منسوخ ہے، پہلی آیت اگرچہ تلاوت کے اعتبار سے مقدم ہے لیکن نزول کے اعتبار سے موخر ہے، ابتداءً "تربص الی الحول" کا حکم تھا، پھر "تربص اربعة اشهر وعشرا" کا حکم نازل ہوگیا اور پہلا حکم منسوخ ہوگیا، جمہور مفسرین رحمہم اللہ نے نسخ ہی کو اختیار کیا ہے، ولا تعارض بعد النسخ۔

(جلالین والفوز الکبیر)

ایک نیکی کا ثواب اسی کے مثل ملتا ہے یا تضاعف کے ساتھ، پھر تضاعف کی مقدار کیا ہے؟

پارہ نمبر: ۲، ۳، ۸، ۲۷، ۲۸

آیات

① ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً﴾
(پارہ: ۲ رکوع: ۱۶ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۳۷)

② ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَلَہٗ اَجْرٌ کَرِیْمٌ﴾
(پارہ: ۲۷ رکوع: ۱۷ سورۂ حدید جلالین ص: ۴۴۹)

③ ﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَہُمْ وَلَہُمْ اَجْرٌ کَرِیْمٌ﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۱۸ سورۂ حدید جلالین ص: ۴۵۰)

④ ﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْہُ لَکُمْ الخ﴾
(پارہ: ۲۸ رکوع: ۱۶ سورۂ تغابن جلالین ص: ۴۶۳) ✦

⑤ ﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَہُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْۢبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾ (پارہ: ۳ رکوع: ۴ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۴۱) ✦

⑥ ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَۃِ فَلَہٗ عَشْرُ اَمْثَالِہَا﴾
(پارہ: ۸ رکوع: ۷ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۲۹) ✦

⑦ ﴿لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۷ سورۂ نجم جلالین ص: ۴۳۹)

تشریحِ تعارض

ان آیات میں دو طرح سے تعارض ہے، ایک تو پہلی چھ آیات کے درمیان بایں

طور کہ پہلی چار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص اللہ کو قرض حسن دیتا ہے، یعنی اس کے راستہ میں اپنا مال خرچ کرتا ہے، تو حق تعالیٰ اس کا ثواب بہت گنا بڑھا کر عطا فرماتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیکی کا ثواب کئی کئی گنا بڑھا کر دیا جاتا ہے، دس گنا یا سات سو گنا کی کوئی تحدید نہیں بلکہ حق تعالیٰ اس سے بھی زائد عطا فرمائیں گے، اور آیت نمبر۵ میں ارشاد ہے کہ جو لوگ اللہ کے راستہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے کہ ایک دانہ کسی نے بویا، اس سے سات بالیں اگیں، ہر بال میں سو سو دانے ہوئے، یعنی ایک دانہ خرچ کرنے کا ثواب سات سو دانوں کے برابر ملتا ہے، معلوم ہوا کہ ایک نیکی کا ثواب سات سو گنا کر دیا جاتا ہے اور اس آیت کے جملہ اخیرہ "وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ" کا مطلب اگر یضاعف الی اکثر من سبع مائۃ لیا جائے کہ جس کے لئے چاہتے ہیں سات سو سے بھی زیادہ بڑھا دیتے ہیں تو اس جملہ کا مضمون پہلی چار آیات کے مرادف ہوگا اور اگر یضاعف الی سبع مائۃ لمن یشاء مراد ہو تو اس کا مضمون اس آیت کے اول حصہ کے مرادف ہوگا، صرف یہ جتلانا مقصود ہے کہ ایک نیکی کا ثواب سات سو گنا کر دینا حق تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، جس کے لئے چاہتے ہیں سات سو گنا کر دیتے ہیں۔

بہر حال اس آیت کے اول حصہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیکی کا ثواب سات سو گنا ملتا ہے اور آیت نمبر۶ میں ہے کہ ایک نیکی کا ثواب دس گنا دیا جاتا ہے، پس ان آیات میں تعارض ہو رہا ہے کہ پہلی چار آیات میں تضاعف حسنہ بلا تحدید اور آیت نمبر۵ میں تضاعف الی سبع مائۃ اور آیت نمبر۶ میں تضاعف الی عشر امثالہا ہے۔

دوسرا تعارض پہلی چھ آیات اور اخیر کی آیت نمبر۷ کے درمیان ہے، بایں طور کہ پہلی چھ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیکی کا ثواب تضاعف کے ساتھ ملتا ہے اور آیت نمبر۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیکی کا ثواب بغیر تضاعف کے اسی کے برابر ملتا

ہے کیونکہ اس میں ارشاد ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی "کہ انسان کے لئے اسی عمل کا ثواب ہے جس کی اس نے سعی کی ہے۔" اگر ایک نیکی کی ہے تو ایک ثواب، اگر دو کی ہیں تو دو ثواب، اگر تین کی ہیں تو تین، وعلیٰ ہذا القیاس۔ ایک نیکی کا ثواب دس گنا یا سات سو گنا نہیں دیا جاتا، پس یہ آیت نمبر ۷ پہلی چھ آیات کے بظاہر معارض ہے۔

دفع تعارض

پہلے تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ دس گنا اور سات سو گنا اور اس سے زائد تضاعف کا تفاوت اخلاص و مشقت میں تفاوت کے اعتبار سے ہے، جس شخص کی نیکی میں ادنیٰ درجہ کا اخلاص یا مشقت ہوتی ہے اس کو دس گنا ثواب ملتا ہے، اوسط درجہ کے اخلاص و مشقت میں سات سو گنا اور اعلیٰ درجہ کے اخلاص اور مشقت شدیدہ کی صورت میں اس سے زیادہ مثلاً سات لاکھ بلکہ اور زائد تک تضاعف ہوجاتا ہے جیسا کہ ایک روایت میں بیس لاکھ اور چالیس لاکھ تک کا ذکر ہے۔

﴿عن ابی عثمان النهدی قال: بلغنی عن ابی هریرة رضی الله تعالیٰ عنه انه قال: انّ الله لیکتب لعبده المؤمن بالحسنة الواحدة الف الف حسنة فحججت ذلك العام، ولم اكن اريد ان احج الا للقائه فی هذا الحديث، فلقيت ابا هريرة رضی الله تعالیٰ عنه، فقلت له، فقال: ليس هذا قلت، ولم يحفظ الذی حدثك، انما قلت: ان الله يعطی العبد المؤمن بالحسنة الواحدة الفی الف حسنة. ثم قال ابوهريرة رضی الله تعالیٰ عنه: اوليس تجدون هذا فی كتاب الله تعالیٰ: "من ذا الذی يقرض الله قرضاً حسناً فيضاعفه له اضعافاً كثيرة" فالكثيرة

عندہ تعالیٰ اکثر من الفی الف والفی الف، والذی نفسی بیدہ لقد سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم یقول: ان اللّٰہ یضاعف الحسنۃ الفی الفی حسنۃ۔

(رواہ احمد وابن المنذر وابن ابی حاتم، روح المعانی ۲/۱۳۳)

ترجمہ: "حضرت ابو عثمان نہدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مجھ کو خبر پہنچی کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یوں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندہ کے لئے ایک نیکی کا ثواب دس لاکھ نیکیوں کے برابر لکھتے ہیں۔ تو میں نے اس سال حج کیا اور صرف اس ارادہ سے حج کیا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حج میں ملاقات ہو جائے گی، ان سے یہ حدیث معلوم کروں گا تو میری ملاقات حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوگئی، میں نے ان سے (اس حدیث کے متعلق) عرض کیا تو انہوں نے فرمایا میں نے یہ نہیں کہا تھا، جس نے آپ سے حدیث بیان کی اس کو یاد نہیں رہی۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ مومن بندہ کو ایک نیکی کا ثواب بیس لاکھ لکھتے ہیں پھر فرمایا کیا تم اس چیز کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے "مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا الخ" جو اللہ کو قرض حسن دیتا ہے (یعنی انفاق فی سبیل اللہ) اس کے ثواب کو حق تعالیٰ بہت زیادہ کتنا بڑھا دیتے ہیں اور اضعاف کثیرہ اللہ کے نزدیک بیس لاکھ اور بیس لاکھ سے زائد ہیں اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک حسنہ کو چالیس لاکھ حسنات تک بڑھا دیتے ہیں۔"

یا پھر وطن میں رہ کر اور سفر جہاد وغیرہ میں نکل کر نیکی کرنے کے اعتبار سے تفاوت ہوتا ہے، گھر میں رہ کر سات سو اور جہاد فی سبیل اللہ میں نکل کر سات لاکھ کا

ثواب ملتا ہے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اور جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت مرفوعہ میں ہے:

﴿عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ: مَنْ اَرْسَلَ بِنَفَقَةٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَقَامَ فِيْ بَيْتِهٖ، فَلَهٗ بِكُلِّ دِرْهَمٍ سَبْعُمِائَةِ دِرْهَمٍ، وَمَنْ غَزَا بِنَفْسِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى، وَاَنْفَقَ فِيْ وَجْهِهٖ ذٰلِكَ، فَلَهٗ بِكُلِّ دِرْهَمٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سَبْعُ مِائَةِ اَلْفِ دِرْهَمٍ، ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ (مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ الخ)﴾

(اخرجہ ابن ماجہ وابن ابی حاتم۔ روح المعانی)

ترجمہ: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جس شخص نے اللہ کے راستہ میں خرچ بھیج دیا اور خود اپنے گھر مقیم رہا تو اس کو ہر درہم پر سات سو دراہم کا ثواب ملتا ہے اور جو آدمی خود اللہ کے راستہ میں غزوہ کے لئے نکل جائے اور وہاں جا کر خرچ کرے تو اس کو قیامت کے دن ہر درہم پر سات لاکھ درہم کا ثواب ملتا ہے، پھر آپ نے یہ آیت (مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ الخ) تلاوت فرمائی۔“

یا پھر مہاجرین و اعراب کا فرق ہوتا ہے کہ اعراب کے لئے دس گنا اور مہاجرین کے لئے سات سو گنا ثواب ہوتا ہے جیسا کہ ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور ابوالشیخ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور عبد بن حمید وغیرہ نے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ فلہ عشر امثالها والی روایت خاص کر اعراب (اہل دیہات) کے بارے میں نازل ہوئی ہے، بہر حال مہاجرین، تو ان کی نیکی تو سات سو گنا تک بڑھا دی جاتی ہے مگر ظاہر یہ ہے کہ یہ تضاعف سب کے حق میں عام ہے اعراب ہوں یا غیر اعراب (ہاں اخلاص و مشقت کا تفاوت بہر

حال معتبر ہے)۔ (تفسیر روح المعانی)

❷ عشرہ وغیرہ سے مراد تحدید نہیں ہے بلکہ تکثیر مقصود ہے کہ حق تعالیٰ ایک نیکی کا ثواب بہت زیادہ عطا فرمائیں گے، اس توجیہ پر تمام آیات کا مفہوم متحد ہو جاتا ہے اور کوئی تعارض نہیں رہتا۔ (روح المعانی)

دوسرے تعارض کے چار جواب ہیں:

❶ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی میں مثلیت کی تصریح نہیں ہے، یعنی لیس للانسان الامثل ماسعی نہیں فرمایا کہ انسان کو اس کی سعی حسن کے مثل ہی ثواب ملے گا، تضاعف کے ساتھ نہیں جیسا کہ سیئہ کے بارے میں "مَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَلَا یُجْزٰی اِلَّا مِثْلَھَا" میں مثلیت کی تصریح ہے بلکہ اس آیت میں تو مطلق کہا گیا ہے اور مقصود حصر کا یہ ہے کہ انسان کو صرف خود اسی کی سعی کا ثواب ملتا ہے، دوسرے شخص کی سعی کا ثواب نہیں دیا جاتا ہے، البتہ ثواب کتنا دیا جاتا ہے، اس کی کوئی تصریح نہیں کی گئی، پہلی چھ آیات میں اس کو واضح کر دیا گیا کہ کسی کو دس گنا، کسی کو سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زائد ثواب دیا جاتا ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (مؤلف)

❷ اگر مثلیت مراد لی جائے تو جواب یہ ہے کہ یہ آیت عدل پر اور پہلی چھ آیات فضل پر محمول ہیں لہٰذا کوئی تعارض نہیں، یعنی عدل وانصاف کا تقاضہ تو یہی ہے کہ ایک نیکی کا ثواب اسی کے مثل دیا جائے مگر حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ثواب میں اضافہ فرمادیں گے، والیٔ خراسان عبداللہ بن طاہر نے حضرت حسین بن فضل رحمہ اللہ سے اس آیت اور وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ کے درمیان تعارض کے متعلق سوال کیا تو حضرت حسین بن فضل رحمہ اللہ نے جواب دیا لیس لہ بالعدل الا ما سعی ولہ بالفضل ماشاء اللّٰہ۔ "کہ اگر حق تعالیٰ عدل سے کام لیں تو اس کی سعی کے مثل ہی ثواب دیں گے اور اگر فضل وکرم فرمائیں تو جتنا چاہیں بڑھا چڑھا کر ثواب عطا فرمادیں گے"۔ اس جواب کو سن کر والیٔ خراسان نے حضرت حسین بن فضل رحمہ اللہ کا

سر چھو لیے۔ (روح المعانی)

❸ تضاعف ثواب اس صورت میں ہے جب کہ انسان اس نیت و امید پر نیکی کرے کہ حق تعالیٰ اس کا ثواب بڑھا کر عطا فرمائیں گے، اس وقت گویا اس کی سعی تضاعف کے ساتھ ہے تو اس کا ثواب بھی تضاعف کے ساتھ ہوگا۔ پس تضاعف کی صورت میں جزاء سعی کے مثل رہی، فوق السعی نہیں ہوئی، لہٰذا پہلی چھ آیات، آیت نمبر ۷ کے معارض نہیں ہیں۔ (تفسیر کبیر)

❹ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی میں لام علیٰ کے معنی میں ہے، یعنی انسان کو اس کی سیئہ برائی کے مثل عذاب دیا جائے گا، پس چونکہ چھ آیات حسنات کے بارے میں ہیں کہ ان کے اجر و ثواب میں تضاعف ہوتا ہے اور آخری آیت نمبر ۷ سیئات سے متعلق ہے کہ سیئہ کا بدلہ اس کے مثل ملتا ہے کقولہ تعالیٰ "مَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَلَا یُجْزٰٓی اِلَّا مِثْلَهَا" لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے مگر اس توجیہ کو صاحب روح المعانی نے بعید اور خلاف ظاہر کہا ہے۔ (روح المعانی)

بعث بعد الموت کی کیفیت کیا ہوگی؟

پارہ نمبر: ۳، ۱۷

آیات

① ﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (پارہ: ۳، رکوع: ۳، سورۂ بقرہ، جلالین ص: ۴۱) ◆

② ﴿كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ﴾

(پارہ: ۱۷، رکوع: ۷، سورۂ انبیاء، جلالین ص: ۱۴۱)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بعث بعد الموت کی کیفیت یہ ہوگی کہ اجزاء متفرقہ کو جمع کر کے ان کے اجساد بنا کر ان میں روح ڈال دی جائے گی کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے احیاء موتیٰ کی کیفیت کے متعلق دریافت کیا تھا تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ چار پرندے لے کر پہلے ان کو خوب مانوس کر لو پھر ان کو ذبح کر کے ان کے گوشت کا پروں اور ہڈیوں سمیت خوب قیمہ بنا کر اس کے کئی حصے کر کے ہر پہاڑ پر ایک ایک حصہ رکھ دو، پھر ان سب پرندوں کو بلاؤ تو وہ سب زندہ ہو کر دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آ جائیں گے، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا کہ چار پرندے (مرغ، مور، کبوتر، کوا) لئے ان کو مانوس کیا، پھر ان کو ذبح کر کے ان کے گوشت، ہڈیوں اور پروں کو خوب باریک کاٹ کر اس کے سات حصے بنائے اور

ایک ایک حصہ ایک ایک پہاڑ پر رکھ دیا، جس کے بعد ان جانوروں کو پکارا تو فوراً ہڈی سے ہڈی، پر سے پر، اور خون سے خون، گوشت سے گوشت مل کر سب اپنی اصلی ہیئت پر زندہ ہو کر ان کے پاس آ گئے، حق تعالیٰ نے یہ منظر دکھا کر واضح کر دیا کہ ہم قیامت کے دن اسی طرح مردوں کو زندہ کریں گے کہ تمام مخلوق کے اجزاء بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہو کر جو پورے عالم میں متفرق اور منتشر ہوں گے ان کو ہمارا منادی پکارے گا، ایتھا العظام البالیۃ، والجلود المتمزقۃ، و اللحوم المتفرقۃ، ھلموا الی عرض الرحمن. ''اے بوسیدہ ہڈیوں، متفرق کھالو، اور متفرق گوشت کے ٹکڑو، چلو اللہ کے سامنے پیش ہونے کے لئے۔'' چنانچہ تمام مخلوق کے اجزاء متفرقہ منتشرہ جمع ہو کر اجساد بن جائیں گے، ان میں حق تعالیٰ روح ڈال کر زندہ کر دیں گے اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعث بعد الموت کی کیفیت اعادہ بعد الاعدام ہے، یعنی ہر شے کو بالکل معدوم اور فنا کر کے دوبارہ موجود کیا جائے گا، اسی لئے کہ آیت ثانیہ میں فرمایا: ''کَمَا بَدَاْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُہٗ'' جس طرح ہم نے ہر چیز کو اول مرتبہ پیدا کیا، اسی طرح ہم دوبارہ پیدا کر دیں گے، اور ہر شے کی اول پیدائش عدم سے وجود میں ہوئی ہے، پس اعادہ بھی ایجاد بعد الاعدام کے طور پر ہوگا، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے پانچ جواب ہیں۔

❶ بعث بعد الموت کی کیفیت وہی ہے کہ جو آیت اولیٰ میں بیان کی گئی ہے، یعنی جمع بعد التفریق۔ اور آیت ثانیہ کمابدأنا اول خلق نعیدہ میں جو خلق ثانی کو خلق اول کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، یہ سہولت و آسانی میں تشبیہ ہے جیسا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حاشیہ بیان القرآن میں اس کی تصریح کی ہے اور مطلب یہ

ہے کہ جس طرح ہم نے آسانی اور سہولت سے ہر شئے کو اول مرتبہ پیدا کر دیا، اسی طرح آسانی اور سہولت سے دوبارہ پیدا کر دیں گے، بعث بعد الموت ہمارے لئے کوئی مشکل نہیں ہے، پس آیت ثانیہ میں کیفیت بعث سے کوئی گفتگو ہی نہیں ہے، لہٰذا یہ آیت، آیت اولیٰ کے معارض نہیں ہے۔

۲ آیت ثانیہ میں نفس خلق میں تشبیہ مقصود ہے نہ کہ کیفیت خلق میں، مطلب یہ ہے کہ ہم نے ابتداء مخلوق کو پیدا کیا، اسی طرح ہم دوبارہ بھی پیدا فرما دیں گے، رہی کیفیت خلق سو وہ آیت اولیٰ سے معلوم ہو چکی ہے کہ جمع بعد التفریق ہے۔ فلا تعارض بینہما۔

۳ آیت ثانیہ میں احوال و اوصاف میں تشبیہ مقصود ہے کہ جس حالت اور جس صفت پر ہم نے اول مرتبہ پیدا کیا کہ حفاۃ، عراۃ، غرلا، ننگے پاؤں، ننگے بدن، غیر مختون پیدا ہوئے، اسی حالت و صفت پر ہم قیامت کے روز دوبارہ کر کے اٹھائیں گے، اس کی تائید ایک صحیح روایت سے ہوتی ہے۔

﴿عن ابن عباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال: قام رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم، وقال: یاایہا الناس انکم تحشرون الی اللّٰہ حفاۃ، مشاۃ، عراۃ، غرلا، ثم قرأ کما بدأنا اول خلق نعیدہ، واول من یکسی من الخلائق ابراھیم علیہ السلام.﴾

(رواہ الشیخان والترمذی، مظہری)

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (خطبہ دینے کے لئے) کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! تم اللہ کی طرف ننگے پاؤں پیدل، ننگے بدن، غیر ختنہ شدہ لے جائے جاؤ گے، پھر آپ نے یہ آیت کما بدأنا اول خلق نعیدہ تلاوت فرمائی اور (فرمایا) مخلوق میں سب سے پہلے حضرت

ابراہیم علیہ السلام کو کپڑے پہنائے جائیں گے۔"

تفسیر ابنِ کثیر میں بھی ایک روایت ہے:

﴿عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: قام فینا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم بموعظۃ، فقال: انکم محشورون الی اللہ عزوجل حفاۃ، عراۃ، غرلاً، کما بدأنا اول خلق نعیدہ وعداً علینا، انا کنا فاعلین۔ ...... وذکر تمام الحدیث، اخرجاہ فی الصحیحین من حدیث شعبۃ وذکرہ البخاری عند ھذہ الآیۃ فی کتابہ.﴾ (ابن کثیر ۲۳۲/۳)

ترجمہ: "حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان وعظ فرمانے کھڑے ہوئے تو ارشاد فرمایا کہ تم کو اللہ عزوجل کی طرف ننگے پاؤں، ننگے بدن، غیر مختون سے جایا جائے گا (حق تعالیٰ کا ارشاد ہے) جیسا ہم نے پہلی مرتبہ پیدا کیا ایسے ہی ہم لوٹائیں گے یہ ہمارے اوپر وعدہ ہے، ہم اس کو پورا کرنے والے ہیں۔ راوی نے آگے پوری حدیث ذکر کی، اس کی تخریج امام بخاری و امام مسلم رحمہما اللہ نے اپنی صحیحین میں حضرت شعبہ رحمہ اللہ کی حدیث سے کی ہے اور امام بخاری نے اس کو اپنی کتاب میں اس آیت کے قریب ذکر کیا ہے۔" (ابن کثیر)

ان روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کَمَا بَدَأْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُہٗ سے مراد ایجاد بعد الاعدام نہیں ہے بلکہ بعث بعد الموت کی حالت وصفت کو بیان کرنا مقصود ہے، کیفیتِ بعث کی دلیل ہے جو کہ آیت میں ہے، یعنی جمع الاجزاء المتفرقۃ، پس یہ آیت پہلی آیت کے معارض نہیں ہے۔

 کَمَا بَدَأْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُہٗ، میں بھی جمع من الاجزاء المتفرقۃ مر

تشبیہ مقصود ہے جیسا کہ صاحب روح المعانی نے ۱۰/۱۰۱ پر ایک وجہ شبہ جمع من الاجزاء المتفرقة بھی بیان کی ہے، یعنی جس طرح ہم نے اجزاء متفرقہ کو جمع کر کے اولاً پیدا کیا، اسی طرح دوبارہ بھی اجزاء متفرقہ کو جمع کر کے پیدا فرمائیں گے، تمام انسانوں اور حیوانوں کی پیدائش میں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں بکھرے ہوئے اجزاء و ذرات کو جمع کر کے ان کو پیدا کیا ہے، انسان کی آفرینش جن ماں باپ کے ذریعہ ہوتی ہے اور جن غذاؤں سے ان کا خون اور جسم بنتا ہے وہ خود دنیا بھر کے مختلف گوشوں سے سمٹے ہوئے ذرات ہوتے ہیں، پھر پیدائش کے بعد انسان جس غذا سے نشوونما پاتا ہے، جس سے اس کا خون اور گوشت پوست بنتا ہے۔ اس میں غور کیا جائے تو اس کی غذاؤں میں ایک ایک چیز ایسی ہے جو دنیا کے مختلف ذرات سے بنی ہوئی ہے، دودھ پیتا ہے تو وہ کسی گائے بھینس یا بکری کے اجزاء ہیں اور ان جانوروں میں یہ اجزاء اس گھاس دانے سے پیدا ہوئے جو انہوں نے کھائے ہیں، یہ گھاس دانے معلوم نہیں، کس کس خطۂ زمین سے آئے ہیں اور ساری دنیا میں پھرنے والی ہواؤں نے کہاں کہاں کے ذرات کو ان کی ترتیب میں شامل کر دیا ہے۔ اسی طرح دنیا کا دانہ دانہ اور پھل اور ترکاریاں اور انسان کی تمام غذائیں اور دوائیں جو اس کے بدن کا جزو بنتی ہیں وہ کس کس گوشۂ عالم سے کس کس طرح حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور نظام محکم نے ایک انسان کے بدن میں جمع فرما دیے ہیں۔ اگر غافل اور کوتاہ نظر انسان دنیا کو چھوڑ کر اپنے بدن ہی کی تحقیق اور ریسرچ کرنے بیٹھے تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ اس کا وجود خود ایسے بے شمار اجزاء سے مرکب ہے جو کوئی مشرق کا ہے، کوئی مغرب کا، کوئی جنوبی دنیا کا، کوئی شمالی حصہ کا، حق تعالیٰ نے جس طرح اجزاء منتشرہ کو جمع کر کے انسان بنا دیا، اسی طرح مرنے کے بعد یہ اجزاء پھر منتشر ہو جائیں گے، حق تعالیٰ قیامت کے روز ان اجزاء متفرقہ منتشرہ کو اپنی قدرت کاملہ سے جمع کر کے زندہ فرما دیں گے۔ (معارف القرآن)

قال الشاعر:

زندگی کیا ہے؟ عناصر کا ظہور ترتیب
موت کیا ہے؟ انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

پس دونوں آیتوں میں کیفیت بعث کا بیان متحد ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے، لیکن یہ توجیہ صرف ان اشیاء میں جاری ہوگی جو عناصر سے مرکب ہیں جیسے انسان، حیوانات، نباتات وغیرہ، بخلاف نفس عناصر کے کہ ان میں یہ توجیہ مشکل ہے اس لئے کہ تمام مسلمین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عناصر کی تخلیق اولی اجزاء متفرقہ سے نہیں ہوئی بلکہ حق تعالیٰ نے ان کو عدم سے وجود بخشا ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

❽ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ بعث بعد الموت کی دونوں کیفیتیں متحقق ہوں گی، بعض کے اجزاء تو بالکل معدوم اور فنا ہو جائیں گے، ان کو از سر نو پیدا کیا جائے گا جس کو آیت ثانیہ میں بیان کر دیا گیا اور بعض کے اجزاء متفرق اور منتشر ہو جائیں گے، ان کو جمع کر کے پیدا کر دیا جائے گا جس کو آیت اولی میں واضح کیا گیا ہے، پس دونوں میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ بعض حضرات کے بارے میں تو احادیث میں وارد ہوا ہے کہ ان کے اجسام بالکل محفوظ رہتے ہیں، نہ معدوم ہوتے ہیں نہ منتشر، جیسے حضرات انبیاء علیہم السلام کے اجسام کہ حق تعالیٰ نے ان کو زمین پر حرام کر دیا ہے، وہ جوں کے توں محفوظ رہتے ہیں، طبرانی شریف میں اخلاص کے ساتھ اذان دینے والوں کے بارے میں اور ابن مندہ کی حدیث میں، حاملین قرآن کے متعلق بھی یہی وارد ہے کہ ان کے اجسام محفوظ رہتے ہیں۔ (روح المعانی ۱۰۲/۷)

وساوسِ قلبیہ غیر اختیاریہ پر مؤاخذہ ہوگا یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۳

آیات

(۱) ﴿وَإِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْ أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾

(پارہ:۳، رکوع:۸، سورۂ بقرہ، جلالین ص:۴۶)

(۲) ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (پارہ:۳، رکوع:۸، سورۂ بقرہ، جلالین ص:۴۶)

تشریحِ تعارض

آیتِ اولیٰ میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تمہارے قلوب میں جو خیالات و وساوس پیدا ہوتے ہیں اگر تم ان کو اپنے قول و عمل سے ظاہر کروگے، یا ان کو اپنے قلوب ہی میں چھپائے رکھوگے دونوں صورتوں میں حق تعالیٰ تمہارا حساب لیں گے، حساب لینے کے بعد جس کو چاہیں گے معاف فرمادیں گے، جس کو چاہیں گے عذاب دیں گے، بہرحال اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قلوب میں آنے والے برے خیالات و وساوس خواہ اختیاریہ ہوں یا غیر اختیاریہ انسان ان کے دفع کرنے پر قادر ہو یا نہ ہو ہر حال میں ان خیالات کا حساب ہوگا اور ان پر مؤاخذہ بھی ہوسکتا ہے اور آیتِ ثانیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان انہیں چیزوں کا مکلّف ہے جو اس کی وسعت و طاقت میں ہیں اور جو امور اس کی وسعت سے باہر ہیں ان کا وہ مکلّف نہیں، ان کے کرنے نہ کرنے پر کوئی مؤاخذہ و گرفت نہیں ہے، معلوم ہوا کہ وساوس غیر اختیاریہ جن کے دفع کرنے پر انسان قادر نہیں ہے ان پر مؤاخذہ نہیں ہوگا، پس دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے، پہلی آیت میں وساوسِ قلبیہ غیر اختیاریہ پر مؤاخذہ کا اثبات اور

دوسری آیت میں مؤاخذہ کی نفی کی گئی ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے پانچ جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ میں وساوس اختیاریہ مراد ہیں، یعنی وہ خیالات فاسدہ جن کو انسان اپنے دل میں اختیار سے جگہ دیتا ہے ان پر مؤاخذہ ہوگا اور آیت ثانیہ میں وساوس غیر اختیاریہ مراد ہیں کہ ان پر مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ (بیان القرآن)

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے سفیان رحمۃ اللہ علیہ سے معلوم کیا کہ ارادہ اور خیال پر بھی بندہ سے مؤاخذہ ہوگا؟ تو انہوں نے فرمایا: کہ ہاں، اگر وہ ارادہ عزم کے درجہ میں ہو تو مؤاخذہ ہوگا۔ (خازن)

❷ پہلی آیت دوسری آیت سے منسوخ ہے، جب "ان تبدوا مافی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللّٰہ" نازل ہوئی اور معلوم ہوا کہ دل کے خیالات پر بھی حساب اور گرفت ہے تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم گھبرائے اور ڈرے کیونکہ ان خیالات سے احتراز ممکن نہیں ہے تو حق تعالیٰ نے اس کے بعد یہ آیت نازل فرمائی لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا "کہ اللہ تعالیٰ وسعت وقدرت سے زیادہ کا کسی کو مکلف نہیں بناتے۔" لہٰذا جو خیالات دل میں آجائیں اور ان پر عمل نہ ہو اس میں کوئی گناہ اور گرفت نہیں ہے، اس کی تائید ایک صحیح روایت سے ہوتی ہے:

﴿عن أبی هریرة رضی اللّٰه تعالی عنه لمانزلت علی رسول اللّٰه صلی اللّٰه تعالیٰ علیه وآله وسلم وان تبدوا مافی انفسکم او تخفوه الآیة فاشتد ذلك علی اصحاب رسول اللّٰه صلی اللّٰه تعالیٰ علیه وآله و سلم، فأتوا رسول اللّٰه صلی اللّٰه تعالیٰ علیه وآله وسلم، ثم جثوا علی الرکب،

فقالوا: یارسول اللہ، کلفنا من الاعمال ما نطیق، الصلوٰۃ، و الصوم، والجہاد، والصدقۃ، وقد انزل اللہ علیک ھذہ الایۃ، ولا نطیقھا، فقال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم: اتریدون ان تقولوا کما قال اھل الکتابین من قبلکم: سمعنا وعصینا، بل قولوا: سمعنا واطعنا، غفرانک ربنا، والیک المصیر، فلما اقترأھا القوم، وزلت بھا السنتھم انزل اللہ فی اثرھا (آمن الرسول) الآیۃ، فلما فعلوا ذلک، نسخھا اللہ تعالیٰ، فانزل سبحانہ: لا یکلف اللہ نفسًا الا وسعھا ﴾ (رواہ مسلم، روح المعانی ۳/۶۳)

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِیْٓ اَنْفُسِکُمْ تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر یہ چیز دشوار گزری، پس صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر عرض کیا یا رسول اللہ! (اب تک تو) ہمیں ان اعمال کا مکلف بنایا گیا تھا جو ہماری طاقت وقدرت میں ہیں یعنی نماز، روزہ، جہاد، صدقہ اور اب اللہ نے آپ پر یہ آیت نازل فرمائی ہے۔ (وان تبدوا مافی انفسکم الخ کہ دل میں آنے والے خیالات پر بھی مؤاخذہ ہوگا) ہم تو اس کی طاقت نہیں رکھتے (کہ ایسے خیالات بھی دل میں نہ آنے دیں، خیالات تو غیر اختیاری طور پر دلوں میں آ ہی جاتے ہیں، یہ معاملہ تو بہت دشوار ہو کر رہ جائے گا، ہم اس بارے میں حق تعالیٰ کی طاعت کیسے کر پائیں گے؟) آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (کہ حق تعالیٰ کو اختیار ہے جو چاہیں حکم نازل فرمائیں، تمہیں تو

تعالیٰ کے حکم کی اطاعت ہر حال میں کرنی ہوگی اور خیالات قلبیہ سے احتراز کرنا ہوگا) کیا تمہارا ارادہ یہ ہے کہ تم بھی اہل کتاب یہود ونصاریٰ کی طرح کہو سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا (کہ ہم نے سن تو لیا مگر ہم آپ کے حکم کی فرمانبرداری نہیں کرتے بلکہ نافرمانی کرتے ہیں) بلکہ تم لوگ تو یوں کہو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا الخ کہ ہم نے سن لیا اور ہم آپ کی اطاعت کریں گے (اور کوشش کریں گے کہ دل میں خیالات نہ آئیں) اے اللہ، ہماری مغفرت فرما، تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے پڑھا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا الخ مگر (یہ عہد و پیمان کرتے ہوئے) ان کی زبانیں لڑکھڑانے لگیں (کہ ہم وعدہ کر تو رہے ہیں مگر معلوم نہیں پورا کر پائیں گے یا نہیں کیونکہ وساوس غیر اختیاریہ سے احتراز کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے) تو حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی آمَنَ الرَّسُوْلُ الخ (جس میں حق تعالیٰ نے ان عہد و پیمان کرنے والے مومنین کی مدح فرمائی) جب لوگوں نے یہ عہد و پیمان (سمعنا واطعنا) کیا تو حق تعالیٰ نے اس آیت کو منسوخ کر دیا اور لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا نازل فرمائی (جس میں بتا دیا کہ تم لوگ وسعت کے بقدر مکلف ہو، لہٰذا غیر اختیاری خیالات و وساوس پر تمہاری کوئی گرفت نہیں ہوگی)

مگر اس توجیہ پر اشکال ہوتا ہے کہ نسخ تو انشاءات کے ساتھ مخصوص ہے، اخبار میں نسخ جاری نہیں ہوتا اور اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ الخ خبر ہے نہ کہ انشاء۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی کلام اگر لفظاً تو خبر ہو مگر معنی انشاء ہو تو اس میں نسخ واقع ہو جاتا ہے اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اگر چہ خبر ہے مگر مقصود اس کا یہ ہے کہ "تم لوگ اپنے دلوں میں برے خیالات نہ آنے دو، ورنہ گرفت ہوگی اور یہ مفہوم از قبیل نہی ہے جو کہ انشاءات میں سے ہے، پس اس

میں نسخ کا جاری ہونا قابل اشکال نہیں ہے۔" (روح المعانی ۳: ۶۴)

❸ پہلی آیت میں ثبات محاسبہ کا ہے اور دوسری آیت میں نفی مؤاخذہ کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ امور قلبیہ پر محاسبہ تو ہوگا مگر مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ اسی لئے یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ فرمایا یؤاخذکم به الله نہیں فرمایا۔ محاسبہ اور مؤاخذہ میں فرق ہے۔ محاسبہ تو یہ ہے کہ بندہ کو اس کے اعمال کی خبر دیدی جائے اور بتلا دیا جائے کہ تو نے یہ یہ اعمال کئے تھے، تیرے دل میں فلاں فلاں معاصی کے خیالات آئے تھے مگر ان پر کوئی گرفت نہ کی جائے بلکہ ان کو معاف کر دیا جائے اور مؤاخذہ کا مطلب عذاب وسزا دینا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی توجیہ منقول ہے۔ اس کی تائید روایت مرفوعہ صحیحہ سے ہوتی ہے۔

﴿عن صفوان بن محرز المازني قال: بينما ابن عمر يطوف اذ عرض له رجل، فقال: يا ابا عبدالرحمن، اخبرني ما سمعت عن رسول الله صلى الله تعالى عليه وآله وسلم في النجوى، قال: سمعت رسول الله صلى الله تعالى عليه وآله وسلم يقول: يدنى المؤمن من ربه حتى يضع عليه كنفه، فيقرره بذنوبه: تعرف ذنب كذا، وكذا؟ فيقول: اعرف ربي، اعرف مرتين، فيقول الله: سترتها عليك في الدنيا، وانا اغفرها لك اليوم، ثم تطوى صحيفة حسناته، واما الآخرون، وهم الكفار والمنافقون، فينادى بهم على رؤوس الخلائق: هؤلاء الذين كذبوا على ربهم، الا لعنة الله على الظالمين.﴾ (رواہ البخاری و مسلم، المشکوٰۃ ۲/ ۴۹۱)

ترجمہ: "صفوان بن محرز المازنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ طواف کر رہے تھے کہ اچانک ایک شخص نے

سامنے آکر دریافت کیا کہ آپ نے خیالِ قلبی کے بارے میں جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے سنی ہو وہ مجھے بھی بتلایئے، انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ مومن اپنے رب کے قریب جائے گا، حق تعالیٰ اس پر اپنا پردہ ڈال دیں گے، اس کے بعد اس کے گناہوں کا اس سے اقرار کرائیں گے کہ تو فلاں فلاں گناہ جانتا ہے؟ وہ دو مرتبہ کہے گا اے رب جانتا ہوں (میں نے فلاں فلاں گناہ کیا ہے) حق تعالیٰ فرمائیں گے میں نے دنیا میں تیری پردہ پوشی کی تھی اور آج تیری مغفرت کرتا ہوں، پھر اس کے حساب کا صحیفہ لپیٹ دیا جائے گا، بہر حال دوسرے لوگ (جو کفار و منافقین ہیں) ان کو تو تمام مخلوق کے سامنے پکارا جائے گا کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا ہے، یاد رکھو! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔"

❷ پہلی آیت میں جس مواخذہ کا اثبات ہے وہ مواخذہ فی الدنیا ہے اور دوسری آیت میں جس مواخذہ کی نفی ہے وہ مواخذہ فی الآخرۃ ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں، کیونکہ جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں اور جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں، مطلب یہ ہوا کہ امورِ قلبیہ پر حق تعالیٰ دنیا میں مواخذہ فرماتے ہیں، جن لوگوں کے قلوب میں معاصی کے خیالات و وساوس آتے رہتے ہیں ان پر حق تعالیٰ دنیا ہی میں غموم و ہموم طاری فرما دیتے ہیں، آخرت میں ان پر کوئی عقاب نہیں ہوگا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ارشاد بلکہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی سے معلوم ہوتا ہے:

﴿روى الضحاك عن عائشة رضى الله تعالىٰ عنها انها قالت: ما احدث العبدبه نفسه من شركائت محاسبة الله

علیہ بغم یبتلیہ بہ فی الدنیا او حزن او اذی، فاذا جاءت

الآخرۃ لم یسئل عنہ، ولم یعاقب علیہ، وروت انہا سالت

النبی صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم عن ھذہ الآیۃ،

فاجابہا بما ھذا معناہ.﴾ (التفسیر الکبیر ج۷ ص۱۳۴)

ترجمہ: ”امام ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نقل کیا ہے انہوں نے فرمایا کہ بندے کے دل میں جو برا خیال آتا ہے، اللہ تعالیٰ کا محاسبہ اس پر یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں اس کو کسی رنج و غم یا تکلیف میں مبتلا فرما دیتے ہیں، آخرت میں نہ اس سے سوال ہوگا نہ عذاب اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان کیا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کا جواب دیا تھا۔“

۵ پہلی آیت میں جو مؤاخذہ کا اثبات ہے یہ تو اس شخص کے حق میں ہے جو خیالات فاسدہ کو اچھا سمجھے اور ان پر مصر رہے اور آیت ثانیہ میں جو مؤاخذہ کی نفی ہے یہ اس شخص کے بارے میں ہے جو ان خیالات شرکو ناگوار سمجھے، ان سے نفرت کرے، اختلاف اشخاص کے بعد کوئی تعارض نہیں رہتا۔ (تفسیر کبیر ج۷ ص۱۳۵)

بندہ کو مالا یطاق کا مکلف بنایا جاتا ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۳، ۸

آیات

① ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (پارہ: ۳ رکوع: ۸ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۴۵)

② ﴿لَا نُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (پارہ: ۸ رکوع: ۶ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۲۸) ✦

③ ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ (پارہ: ۳ رکوع: ۸ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۴۵)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱، ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کسی بندہ کو ایسے امور کا مکلف نہیں بناتے جو بندہ کی طاقت سے باہر ہوں اور آیت نمبر ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کو مالا یطاق کا مکلف بنایا جاتا ہے کیونکہ اس میں حق تعالیٰ نے بندہ کو یہ دعا کرنے کی تلقین فرمائی ہے کہ اے ہمارے رب، تو ہمارے اوپر ان امور کا بوجھ مت ڈال جن کی ہم میں طاقت نہیں ہے۔ اور ایسی دعا اسی وقت کی جاسکتی ہے جب کہ حق تعالیٰ مالا یطاق کا مکلف بناتے ہوں، اگر حق تعالیٰ کسی کو مالا یطاق کا مکلف نہ بناتے ہوں تو پھر یہ دعا کرنا بے سود و بے معنی ہوگا کہ ہم کو مالا یطاق کا مکلف نہ بنا، اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ مالا یطاق کا مکلف بناتے ہیں، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو گیا کیونکہ پہلی دو آیتوں میں تکلیف مالا یطاق کی نفی اور تیسری میں اثبات ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ آیت نمبر ۱، ۲ میں نفی تکلیف کی ہے اور تیسری آیت میں اثبات تحمیل کا ہے نہ

کہ تکلیف کا اور تکلیف و تحمیل میں فرق ہے، تکلیف کے معنی تو الزام ما فیہ کلفۃ ومشقۃ ہے، یعنی کسی چیز کو لازم کردینا جس میں کلفت و مشقت ہو جیسے بندوں پر فرائض وواجبات کو لازم کردیا گیا ہے اور تحمیل کے معنی عوارض وحوادث اور عقوبات کا نازل کرنا ہیں، پس پہلی دو آیتوں کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم بندوں پر ایسے امور کو واجب، فرض اور لازم نہیں کرتے جن کی بندوں میں طاقت نہ ہو اور تیسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے رب! آپ عوارض وحوادث اور عقوبات نازل فرمانے والے ہیں، ہر قسم کے عوارض وحوادث کا نازل کرنا آپ کے قبضہ قدرت میں ہے مگر اے ہمارے رب! ہم پر ایسے حوادث وعوارض، مصائب و آلام مت ڈالنا جن کو ہم برداشت نہ کرپائیں، پس جس شئے کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں اور جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں کیونکہ اثبات تحمیل مالا یطاق کا ہے اور نفی تکلیف مالا یطاق کی ہے۔ فلا تعارض بینہما. (تفسیر روح المعانی جز ۳، ۶۹ وغیرہ)

❷ تحمیل کو تکلیف ہی کے معنی میں لے کر جواب یہ ہے کہ پہلی دو آیتوں میں تکلیف مالا یطاق کے وقوع کی نفی ہے کہ حق تعالیٰ تکلیف مالا یطاق واقع نہیں فرماتے یعنی کسی کو مالا یطاق کا مکلف نہیں بناتے اور تیسری آیت میں تکلیف مالا یطاق کے امکان کا اثبات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے رب، آپ اگرچہ مالا یطاق کا مکلف بناسکتے ہیں، تکلیف مالا یطاق ممکن ہے مگر ہم کو آپ مالا یطاق کا مکلف نہ بنایئے۔ پس نفی وقوع کی ہے اور اثبات امکان کا ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ ایسا جائز ہے کہ ایک شئے ممکن ہو مگر واقع نہ ہو، ہر ممکن کا واقع ہونا کوئی ضروری نہیں ہے، اہل سنت والجماعت کا مسلک بھی یہی ہے کہ تکلیف مالا یطاق ممکن ہے مگر واقع نہیں ہے، شرح عقائد اور اس کی شرح النبراس میں اس کی تفصیل ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ (مؤلف)

پورا قرآن متشابہ ہے یا محکم یا بعض متشابہ و بعض محکم ہے؟

پارہ نمبر: ۳، ۱۱، ۲۳

آیات

① ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ﴾ (پارہ ۳ رکوع ۹ سورۂ آل عمران جلالین ص ۴۶) ◆

② ﴿الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِیْمٍ خَبِیْرٍ﴾ (پارہ ۱۱ رکوع ۱۴ سورۂ ہود جلالین ص ۱۷۹) ◆

③ ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ﴾ (پارہ ۲۳ رکوع ۱۷ سورۂ زمر جلالین ص ۳۸۷)

تشریح تعارض

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا بعض حصہ محکم اور بعض حصہ متشابہ ہے اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی تمام آیات یعنی پورا قرآن محکم ہے اور تیسری آیت میں کتاباً متشابہاً کہا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پورا قرآن متشابہ ہے لہٰذا ان تینوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

پہلی آیت میں محکم اور متشابہ کے اصطلاحی معنی مراد ہیں اور دوسری و تیسری آیت میں محکم و متشابہ لغوی معنی کے اعتبار سے کہا گیا ہے۔ محکم کے معنی لغت میں مضبوط اور

متقن کے ہیں، یا احکام بمعنی اتقان سے اسم مفعول کا صیغہ ہے اور متشابہ کے معنی لغت میں وہ شئے جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کے مشابہ و مماثل ہو دونوں میں کوئی فرق نہ ہو اور اصطلاح میں محکم واضح الدلالۃ علی المراد کو کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ لفظ جو مراد و مقصود پر واضح طور پر دلالت کرے اور متشابہ اصطلاح میں مخفی الدلالۃ علی المراد کو کہا جاتا ہے، یعنی وہ لفظ جس کی دلالت مراد پر مخفی ہو جس کے معنی و مقصود ظاہر و واضح نہ ہوں، دفع تعارض کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں قرآن کے بعض حصے کو محکم اور بعض کو متشابہ اصطلاحی معنی کے اعتبار سے کہا گیا ہے کہ قرآن کی بعض آیات ایسی ہیں جو مراد و مقصود پر واضح طور پر دلالت کرتی ہیں جیسے آیاتِ احکام، آیات وعد و وعید وغیرہ اور بعض آیات ایسی ہیں جن کی مراد مخفی ہے جیسے سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات الٓمٓ، الٓرٰ، الٓمّٓرٰ، الٓمٓصٓ، طٰسٓ، طٰسٓمّٓ، حٰمٓ وغیرہ اور دوسری آیت میں جو تمام آیات کو محکم کہا گیا ہے یہ معنی لغوی کے اعتبار سے ہے کہ قرآن کی تمام آیات مضبوط و مستحکم ہیں ان میں کوئی خلل، کوئی عیب و نقص نہیں ہے، پورا قرآن تناقض، فسادِ معنی، رکاکتِ لفظ اور دیگر تمام عیوب و نقائص سے منزہ و مقدس ہے، نیز تغیر و تبدل اور تحریف سے بھی محفوظ ہے، کسی کی مجال نہیں کہ قرآن میں کوئی تغیر و تبدل اور تحریف کر دے، حق تعالیٰ کا وعدہ ہے "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ"، محکم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمام آیات واضحات الدلالۃ ہیں، اور تیسری آیت میں جو پورے قرآن کو متشابہ کہا گیا ہے یہ بھی معنی لغوی کے اعتبار سے ہے۔ یعنی فصاحت و بلاغت میں، حسن و صداقت میں قرآن کا ایک حصہ دوسرے کے مشابہ ہے، قرآن کی تمام آیات لفظاً و معنیً فصیح و بلیغ ہیں، تمام آیات میں حسن و صداقت ہے، پورا قرآن حسنِ ترتیب سے مزین ہے، یہ مطلب نہیں کہ قرآن کی تمام آیات متشابہ اور غیر واضحات الدلالۃ ہیں، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (جلالین و روح المعانی بصاوی)

غزوۂ بدر میں کفار کو مسلمانوں کی تعداد زیادہ نظر آرہی تھی یا کم؟

پارہ نمبر:۳، ۱۰

آیات

(۱) ﴿وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ﴾

(پارہ:۳ رکوع:۱۰ سورۂ آل عمران جلالین ص:۴۸)

(۲) ﴿وَيُقَلِّلُكُمْ فِيْۤ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا﴾

(پارہ:۱۰ رکوع:۱ سورۂ انفال جلالین ص:۱۵۰)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت میں غزوۂ بدر کی کیفیت بیان کرتے ہوئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ." کہ جب مسلمانوں اور کفار کی دونوں جماعتیں باہم ایک دوسرے کے مقابل ہوگئی تھیں تو کفار مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے، حالانکہ کفار کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی اور مسلمان تین سو سے کچھ زائد تھے مگر کفار کو مسلمان دیکھنے میں دوگنے نظر آرہے تھے۔ یہ مطلب اس احتمال پر ہے کہ یرونہم کی ضمیر فاعل کفار کی طرف اور ہم ضمیر مفعول مسلمین کی طرف راجع ہے اور مثلیہم کی ضمیر بھی کفار کی طرف لوٹ رہی ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اسی احتمال کو لے کر ترجمہ کیا ہے "اور دوسری فوج کافروں کی ہے دیکھتے ہیں، یہ ان کو اپنے سے دوچند، صریح آنکھوں سے۔" اگرچہ ان ضمائر کے مراجع میں اور بھی متعدد احتمالات ہیں

مگر طوالت کے خوف سے ہم نے ان کو ترک کر دیا ہے۔

بہر حال مسلمانوں کی تعداد قلیل ہونے کے باوجود حق تعالیٰ نے کفار کی نظروں میں مسلمانوں کی تعداد کو کثیر دکھایا اور آیت ثانیہ میں ارشاد ہے "ویقللکم فی اعینھم" کہ حق تعالیٰ مومنوں کو کفار کی نگاہوں میں قلیل دکھا رہے تھے کہ کفار کو تعداد میں بہت کم دکھ رہے تھے، ویسے تو واقع میں بھی مسلمانوں کی تعداد کفار سے کم تھی مگر حق تعالیٰ نے مزید کم کر کے دکھائی جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوجہل نے مسلمانوں کے لشکر کو دیکھ کر اپنے اصحاب سے کہا کہ ان کی تعداد تو فقط اتنی معلوم ہوتی ہے جن کی خوراک ایک اونٹ ہو، عرب میں ایک اونٹ کو سو آدمیوں کی خوراک سمجھا جاتا تھا تو کفار کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ مسلمانوں کی تعداد سو سے زائد نہیں ہے، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے کہ پہلی آیت میں تو ہے کہ کفار مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا یعنی دو ہزار کے قریب دیکھ رہے تھے اور دوسری آیت میں ہے کہ بہت کم دیکھ رہے تھے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

1. اختلاف زمان پر محمول ہے، مطلب یہ ہے کہ لڑائی سے قبل تو حق تعالیٰ نے کفار کو مسلمانوں کی تعداد بہت کم دکھلائی، حکمت اس میں یہ تھی کہ اگر مسلمانوں کی تعداد شروع ہی میں کفار کو زیادہ دکھلائی جاتی تو کفار پر رعب طاری ہو جاتا اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے اور لڑائی کی نوبت نہ آتی اور حق تعالیٰ نے جو مشرکین کی ہزیمت کا فیصلہ کر رکھا تھا اس کا ظہور نہ ہوتا اس لیے حق تعالیٰ نے ابتداءً لڑائی شروع ہونے سے قبل مسلمانوں کی تعداد کفار کو بہت کم دکھلائی تاکہ وہ ان کی تعداد کو کم دیکھ کر کوئی خاص تیاری کیے بغیر لڑائی کے میدان میں آ جائیں اور جب لڑائی شروع ہوئی تو کفار

مسلمانوں کی تعداد کو اپنے سے دو گنا دیکھ رہے تھے اور کفار پر مسلمانوں کا ایک رعب طاری ہو رہا تھا اور مسلمانوں کو کفار کی تعداد بہت قلیل نظر آ رہی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہماری نظروں میں کفار صرف تو ے کی تعداد میں دکھائی دے رہے تھے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ آیت اولیٰ لڑائی کے شروع ہونے کے بعد کے زمانہ پر محمول ہے اور آیت ثانیہ لڑائی شروع ہونے سے قبل کے زمانہ پر محمول ہے اور جب دو متعارض چیزوں کا زمانہ مختلف ہو تو تعارض نہیں رہتا۔

(جلالین، تفسیر ابوالسعود وغیرہ)

۲ آیت اولیٰ میں یرونھم کی ضمیر فاعل اور ضمیر مفعول دونوں کفار کی طرف راجع ہیں اور مثلیھم کی ضمیر مسلمین کی طرف راجع ہے، ترجمہ یہ ہوگا کہ "کفار اپنے آپ کو مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ دیکھ رہے تھے۔" حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں یہی ترجمہ کیا ہے، مثلیھم اگرچہ تثنیہ کا صیغہ ہے مگر مراد اس سے اکثریت کو بیان کرنا ہے، تحدید مقصود نہیں ہے، کیونکہ کفار تو مسلمانوں سے واقع میں ہی تقریباً تین گنا زائد تھے، مسلمانوں کی تعداد ان کو بہت کم نظر آنے کی وجہ سے اپنی تعداد ان کو تین گنے سے بھی زیادہ نظر آ رہی تھی، اس احتمال پر ان دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں سے یہی معلوم ہو رہا ہے کہ کفار اپنے کو زیادہ اور مسلمانوں کو کم دیکھ رہے تھے۔

ایمان اسلام میں اتحاد ہے یا مغایرت؟

پارہ نمبر ۳، ۲۶، ۲۷

آیات

(۱) ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (پارہ ۳، رکوع ۱۰، سورۂ آل عمران جلالین ص: ۴۸)

(۲) ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾

(پارہ ۳، رکوع ۱۷، سورۂ آل عمران جلالین ص: ۵۶)

(۳) ﴿فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ (پارہ ۲۷، رکوع ۱، سورۂ ذاریات جلالین ص: ۴۳۳)

(۴) ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا﴾

(پارہ ۲۶، رکوع ۱۴، سورۂ حجرات جلالین ص: ۴۲۸)

تشریح تعارض

پہلی تین آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور اسلام دونوں متحد ہیں اور چوتھی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں مغایرت ہے اس لئے کہ آیت اولیٰ میں حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ دین فقط اسلام ہے، اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین اللہ کو پسند نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان بھی اسلام ہی ہے کیونکہ اگر ایمان اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین ہو تو اللہ کے نزدیک ایمان غیر پسندیدہ دین ٹھہرے گا اور ظاہر ہے کہ ایمان کے متعلق یہ کہنا کہ یہ حق تعالیٰ کو پسند نہیں ہے باطل اور غلط ہے، پس معلوم ہوا کہ ایمان و اسلام دونوں متحد ہیں۔ اور دوسری آیت میں فرمایا جو شخص اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی تلاش میں ہو وہ دین اس کا مقبول نہیں ہوگا۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایمان عین اسلام ہے کیونکہ اگر غیر اسلام ہو تو

ایمان مقبول عند اللہ نہیں رہے گا وہ باطل ہو، اور تیسری آیت میں حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے متبعین کو اولاً مومنین سے، ثانیاً مسلمین سے تعبیر کیا پہلے تو فرمایا "فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ" کہ جب ہم نے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب نازل کرنا چاہا تو اس بستی میں جتنے مومنین تھے سب کو باہر کر دیا، اس کے بعد فرمایا "فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ" کہ جب ہم نے مومنین کو نکالنے کا ارادہ کیا تو ہم کو اس بستی میں مسلمانوں کے صرف ایک گھر کے علاوہ اور کوئی گھر مسلمانوں کا نہیں ملا اور وہ گھر حضرت لوط علیہ السلام کا تھا جس میں بقول مجاہد رحمۃ اللہ علیہ حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی دو بیٹیاں تھیں اور بقول حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کل تیرہ افراد تھے۔ (کمافی روح المعانی)

پس حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے اہل کو اولاً مومنین سے اور ثانیاً مسلمین سے تعبیر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان و اسلام متحد ہیں، بہرحال یہ تینوں آیتیں ایمان و اسلام کے اتحاد پر دال ہیں اور چوتھی آیت سے دونوں میں مغایرت ثابت ہوتی ہے کیونکہ اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ قبیلہ بنو اسد کے کچھ دیہاتی لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض کیا "امنا" کہ ہم ایمان لائے۔" حق تعالیٰ نے فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہہ دیجئے کہ تم لوگ ابھی ایمان نہیں لائے لہٰذا آمنا مت کہو، تم لوگ ابھی صرف اسلام لائے ہو اس لئے یوں کہو اسلمنا کہ ہم اسلام لے آئے۔ تو اس آیت میں ان دیہاتیوں سے ایمان کی نفی اور اسلام کا اثبات کیا گیا ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایمان و اسلام میں مغایرت ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ اسلام لغوی معنی کے اعتبار سے تو ایمان کے مغایر

ہے مگر اصطلاحِ شرع میں دونوں کا مصداق متحد ہے۔ اسلام لغت میں انقیادِ ظاہری کو
کہا جاتا ہے، یعنی ظاہری افعال میں اطاعت کرنا اگرچہ تصدیق قلبی حاصل نہ ہو اور
اصطلاحِ شرع میں اسلام انقیادِ باطنی کو کہتے ہیں، یعنی التلفظ بالشہادتین بشرط
التصدیق القلبی کا نام شرع میں اسلام ہے، اور ایمان شرع میں التصدیق
القلبی بشرط التلفظ بالشہادتین کو کہتے ہیں پس اصطلاحِ شرع میں دونوں
متحد ہوئے، پہلی تین آیتوں سے جو ایمان و اسلام کا اتحاد ثابت ہوتا ہے وہ مصداق
شرعی کے اعتبار سے ہے، اور آیت نمبر ۴ میں جو مغایرت ہے وہ مفہوم لغوی کے اعتبار
سے ہے، آنے والے اعراب ظاہری افعال میں تو اطاعت کرتے تھے جیسا کہ
منافقین ظاہراً اطاعت کرتے تھے مگر ان کے قلب میں تصدیق داخل نہیں ہوئی تھی اس
لئے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تم لوگ ابھی ظاہری مسلمان ہو، تصدیق قلبی تم کو حاصل نہیں
ہے۔ پس اس آیت سے اسلام لغوی اور ایمان میں مغایرت ثابت ہوتی ہے نہ کہ
اسلام اصطلاحی شرعی اور ایمان اصطلاحی شرعی میں، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

(تکمیل وغیرہ)

کفار سے دوستی مطلقاً جائز نہیں یا صرف عدم ضرر کے وقت؟

پارہ نمبر: ۳، ۵، ۶، ۲۸

آیات

① ﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً﴾
(پارہ: ۳ رکوع: ۱۱ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۴۹)

② ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾
(پارہ: ۵ رکوع: ۱۸ سورۂ نساء جلالین ص: ۹۰)

③ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ﴾ (پارہ: ۶ رکوع: ۱۲ سورۂ مائدہ جلالین ص: ۱۰۱)

④ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ﴾
(پارہ: ۶ رکوع: ۱۳ سورۂ مائدہ جلالین ص: ۱۰۲)

⑤ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ﴾ (پارہ: ۲۸ رکوع: ۷ سورۂ ممتحنہ جلالین ص: ۴۵۶)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ۱ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر کفار کی طرف سے کسی قسم کے ضرر کا اندیشہ ہو تو ان سے موالاۃ اور دوستی رکھنا جائز ہے ورنہ جائز نہیں کیونکہ اس میں اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُ تُقٰىةً کا استثناء کیا گیا ہے اور آیت نمبر ۲ تا ۵ میں چونکہ کوئی استثناء نہیں ہے

اس لئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار و مشرکین، یہود و نصاریٰ سے کسی حال میں بھی دوستی جائز نہیں، ضرر کا اندیشہ ہو یا نہ ہو، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ پہلی آیت میں موالات تو مجازیہ اور آخر کی آیتوں میں موالات حقیقیہ مراد ہے، موالات حقیقیہ قلبی تعلق اور حقیقی دوستی کو کہا جاتا ہے اور مجازاً اس کا اطلاق مدارات یعنی ظاہری خوش خلقی پر ہوتا ہے، آیت اولیٰ کا مقصد یہ ہے کہ اگر تمہیں کفار کی طرف سے کسی قسم کے ضرر کا اندیشہ ہو تو ان کے ساتھ مدارات یعنی ظاہری خوش خلقی کرنا درست ہے، گفتگو اور ظاہری معاملات میں ان سے اچھا برتاؤ کیا جائے تاکہ وہ ضرر رسانی نہ کریں۔ البتہ قلبی تعلق تو ہرگز نہ کرے اور اگر کوئی ضرر کا اندیشہ نہ ہو تو مدارات بھی درست نہیں اور بھی دیگر حالات ایسے ہیں جن میں مدارات کرنا درست ہے جیسے مدارات کرنے سے اس کافر کے ہدایت پر آنے کی توقع ہو، یا کوئی کافر مہمان بن کر آئے تو اکرامِ ضیف کی خاطر مدارات کرنا جائز ہے۔ اور آخر کی چار آیت میں موالات حقیقیہ یعنی قلبی دوستی و تعلق مراد ہے جو کفار کے ساتھ کسی بھی حال میں درست نہیں خواہ ضرر کا اندیشہ ہو یا نہ ہو، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (بیان القرآن)

❷ پہلی آیت غلبۂ اسلام سے قبل پر محمول ہے اور بعد کی آیات غلبۂ اسلام کے بعد پر محمول ہیں، جب تک اسلام کو قوت حاصل نہیں ہوئی تھی، کفار کا غلبہ تھا اس وقت اندیشۂ ضرر کی صورت میں موالات اور دوستی کی اجازت دیدی گئی تھی، جب اسلام کو قوت حاصل ہوگئی، دینِ اسلام تمام ادیان پر غالب آگیا تو موالات سے مطلقاً منع کر دیا گیا، اب بھی جن ممالک اور جن علاقوں میں کفار کا غلبہ ہو ان میں یہی حکم ہے کہ کفار کے ساتھ موالات کی اجازت ہے، ورنہ وہ لوگ ضرر رسانی کے در پے ہوں گے۔ (جلالین)

حضرت زکریا علیہ السلام کے لئے علامت، تکلم سے تین دن رکنا تھا یا تین رات؟

پارہ نمبر ۳، ۱۶

آیات

(۱) ﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْ اٰيَةً قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا﴾ (پارہ ۳، رکوع ۱۲، سورۂ آل عمران، جلالین ص ۵۰)

(۲) ﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْ اٰيَةً قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا﴾ (پارہ ۱۶، رکوع ۴، سورۂ مریم، جلالین ص ۲۵۲)

تشریحِ تعارض

جب حق تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کے یہاں بڑھاپے اور ضعیفی کی عمر میں لڑکا پیدا ہونے کی بشارت دی تو حضرت زکریا علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے درخواست کی کہ بیوی کے استقرار حمل کی کوئی علامت بتلا دیجئے جس سے میں سمجھ جاؤں کہ میری بیوی حاملہ ہوگئی ہے، حق تعالیٰ نے فرمایا استقرار حمل کی علامت یہ ہے کہ آپ لوگوں سے تین دن تک بات چیت نہیں کرسکو گے، آپ کی زبان بند ہو جائے گی صرف اشارہ سے بات چیت کرسکو گے، جب ایسا ہو جائے تو سمجھ لینا کہ بیوی حاملہ ہوگئی ہے، اس کو بیان کرتے ہوئے آیتِ اولیٰ میں "ان لا تکلم الناس ثلثة ایام" فرمایا "کہ تین دن بات نہ کرو گے" اور آیتِ ثانیہ میں "ثلث لیال" ہے "کہ تین رات بات نہ کرسکو گے" یعنی پہلی آیت میں ایام اور دوسری میں لیالی کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں میں تعارض ہے، پس دونوں آیتوں میں بظاہر

تعارض ہو رہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ دونوں کا مجموعہ مراد ہے، یعنی تین دن تین رات تک بات نہ کرسکو گے، پہلی آیت میں ثلٰثة ایام بلیالیہا اور دوسری آیت میں ثلٰث لیال بایامہا مراد ہے، البتہ سورۂ آل عمران میں ایام اور سورۂ مریم میں لیالی کہنے کی حکمت یہ ہے کہ رات دن پر مقدم ہوتی ہے اور سورۂ مریم مکیہ ہونے کی وجہ سے مقدم اور سورہ آل عمران مدنیہ ہونے کی وجہ سے مؤخر ہے، پس سورۂ مقدمہ میں مقدم یعنی لیالی کو ذکر فرمایا اور سورۂ مؤخرہ میں مؤخر یعنی ایام کو ذکر کیا۔ (صاوی)

خالق صرف حق تعالیٰ ہیں یا بندے بھی خالق ہیں؟

پارہ نمبر: ۳، ۷، ۱۳، ۱۸، ۲۳

آیات

① ﴿ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ ﴾

(پارہ: ۳ رکوع: ۱۳ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۵۱)

② ﴿ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ ﴾ (پارہ: ۷ رکوع: ۵ سورۂ مائدہ جلالین ص: ۱۱۰)

③ ﴿ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ﴾ (پارہ: ۱۸ رکوع: ۱ سورۂ مؤمنون جلالین ص: ۲۸۷)

④ ﴿ أَتَدْعُونَ بَعْلًا وَتَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ ﴾

(پارہ: ۲۳ رکوع: ۸ سورۂ صافات جلالین ص: ۳۷۸) ✦

⑤ ﴿ بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُن لَّهُ صَاحِبَةٌ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ﴾

(پارہ: ۷ رکوع: ۱۹ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۲۲)

⑥ ﴿ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾

(پارہ: ۱۳ رکوع: ۸ سورۂ رعد جلالین ص: ۲۰۲)

تشریح تعارض

پہلی چار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ بھی بعض اشیاء کا خالق ہے جیسا کہ معتزلہ کا مسلک ہے کیونکہ پہلی دو آیتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ مٹی سے پرندہ پیدا کرتے تھے، خلق کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی

طرف کی گئی ہے جو اللہ کے بندے ہیں اور تیسری اور چوتھی آیت میں ہے "أَحْسَنُ
الْخَالِقِينَ" کہ حق تعالیٰ پیدا کرنے والوں میں سے بہترین پیدا کرنے والے ہیں،
اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ پیدا کرنے والے اللہ کے علاوہ اللہ کے بندے بھی
ہیں مگر حق تعالیٰ بہتر پیدا کرنے والے ہیں اور آخیر کی دو آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ
ہر چیز کے خالق اللہ تعالیٰ ہیں، جیسا کہ اہل سنت والجماعت رحمہم اللہ کا مسلک ہے،
پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ خلق کے معنی ایجاد و تکوین کے بھی آتے ہیں یعنی کسی شے کو عدم سے وجود میں
لانا اور خلق کا اطلاق تقدیر و تصویر اور تسویہ کے معنی پر بھی ہوتا ہے یعنی کسی شے کو ایک
اندازے کے ساتھ تیار کرنا، کسی شے کی صورت و شکل بنانا اور اس کو برابر درست کرنا،
خلق بمعنی ایجاد و تکوین تو حق تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے، اللہ کے علاوہ کوئی مکون و موجد
نہیں ہے اور خلق بمعنی التقدیر والتصویر کا اطلاق بندوں پر بھی درست ہے، اندازے
کے ساتھ کسی شے کی صورت و شکل بندہ بھی بنا لیتا ہے، پتھر، لکڑی وغیرہ سے مجسمے اور
صورتیں تراش لیتا ہے، ان کو شکل اور طرز پر درست اور برابر کر لیتا ہے، پس پہلی چار
آیتوں میں لفظ خلق اسی دوسرے معنی میں مستعمل ہے، ایجاد و تکوین مراد نہیں ہے،
قرینہ اس کا یہ ہے کہ ایجاد و تکوین بغیر مادہ کے ہوتا ہے، حق تعالیٰ بغیر مادہ کے ابتداءً
اشیاء کو عدم سے وجود بخش دیتے ہیں اور تصویر مادہ سے بنائی جاتی ہے اور ان آیات
میں مادہ طین کا ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مٹی لے کر اس سے پرندوں کی صورت
بناتے تھے، یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ خلق یہاں پر ایجاد و تکوین کے معنی میں نہیں بلکہ
تصویر کے معنی میں ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو اس سے پرندے کی صرف شکل و صورت بنا دیتے تھے جیسا کہ تخلق من الطین سے صاف ظاہر ہے اس میں روح اور جان پیدا کرنا حقیقی پرندہ بنانا یہ حق تعالیٰ کا کام تھا، چنانچہ آگے ارشاد ہے: فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللّٰهِ ایسے ہی آیت نمبر ۳ و ۴ میں احسن الخالقین کے معنی احسن المصورین و المقدرین ہیں کہ حق تعالیٰ تصویر بنانے والوں میں سے بہترین تصویر بنانے والے ہیں نہایت استحکام و حسن اور مناسب تصویر بناتے ہیں۔ اور اخیر کی دو آیتوں میں خلق بمعنی ایجاد و تکوین ہے کہ ہر شئے کے مکون و موجد حق تعالیٰ ہیں اس کے علاوہ اور کوئی مکون و موجد نہیں ہے۔ فاندفع التعارض بين تلك الآيات۔

(روح المعانی، تفسیر خازن، مظہری، ابن کثیر وغیرہ)

❷ دوسرا جواب صرف آیت نمبر ۳ و ۴ احسن الخالقین سے متعلق ہے کہ یہ علی سبیل الفرض کہا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ اگرچہ نفس الامر میں اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا خالق نہیں ہے لیکن اگر فرض کیا جائے کہ حق تعالیٰ کے علاوہ اور بھی دوسرے خالقین ہیں تو حق تعالیٰ ان سے بہترین خالق ہیں، پس آیت نمبر ۳ و ۴ میں غیر اللہ کو خالق علی سبیل الفرض کہا گیا ہے اور اخیر کی دو آیتوں میں ہر شئے کا خالق حق تعالیٰ کو نفس الامر کے اعتبار سے کہا گیا ہے۔ فلا تعارض بینہما۔ (تفسیر مظہری)

حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام کی تخلیق کس چیز سے ہوئی؟

پارہ نمبر: ۳، ۸، ۱۴، ۱۸، ۲۱، ۲۳، ۲۴

① ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ﴾ (پارہ ۳، رکوع ۱۴، سورۂ آل عمران، جلالین ص ۵۴)

② ﴿قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ﴾

(پارہ ۸، رکوع ۹، سورۂ اعراف، جلالین ص ۱۳۰)

③ ﴿وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ﴾ (پارہ ۲۱، رکوع ۱۴، سورۂ سجدہ، جلالین ص ۳۴۹)

④ ﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن طِينٍ﴾

(پارہ ۲۳، رکوع ۱۴، سورۂ ص، جلالین ص ۳۸۲)

⑤ ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ﴾

(پارہ ۱۸، رکوع ۱، سورۂ مؤمنون، جلالین ص ۲۸۷)

⑥ ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ﴾

(پارہ ۱۴، رکوع ۳، سورۂ حجر، جلالین ص ۲۱۳)

⑦ ﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ﴾ (پارہ ۱۴، رکوع ۳، سورۂ حجر، جلالین ص ۲۱۳)

⑧ ﴿قَالَ لَمْ أَكُن لِّأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ﴾

(پارہ ۱۴، رکوع ۳، سورۂ حجر، جلالین ص ۲۱۳)

(۹) ﴿إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ﴾ (پارہ ۲۳ رکوع: ۵ سورۃ صافات جلالین ص ۳۷۴)

(۱۰) ﴿خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۱۱ سورۃ رحمٰن جلالین ص: ۴۴۳)

تشریحِ تعارض

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کس چیز سے ہوئی اس بارے میں آیات متعارض ہیں، پہلی چار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مطلق مٹی سے پیدا کیا اور آیت نمبر ۵ میں ہے کہ مٹی کے خلاصہ اور جوہر سے پیدا کیا، سلالہ کے معنی کسی شے سے نکالا ہوا جوہر اور خلاصہ سللت الشیء من الشیء سے ماخوذ ہے، یعنی ایک چیز کو دوسری چیز سے نکالنا اور کھینچنا۔ سلالۃ من طین کا مطلب یہ ہوگا کہ مٹی میں سے خالص جوہر نکال کر اس سے آدم علیہ السلام کو بنایا، تفسیر ابوالسعود میں ہے خلق من صفوۃ سُلّت مِنْ طِيْنٍ، صفوۃ کے معنی ہر شے کا خالص اور عمدہ جز ہے۔ اور آیت نمبر ۶، ۷، ۸ میں فرمایا کہ ہم نے انسان کو یعنی آدم علیہ السلام کو بدبودار گارے کی کھن کھن بجنے والی مٹی سے پیدا کیا۔ صلصال کے معنی بجنے والی مٹی، یعنی جب اس پر چٹکی ماری جائے تو اس سے آواز نکلے، حماء کے معنی طین اسود کالی مٹی یعنی گارا، مسنون کے معنی متغیر اور بدبودار۔ اور آیت نمبر ۹ میں ہے کہ چپکنے والی مٹی سے پیدا فرمایا اور آیت نمبر ۱۰ میں ارشاد ہے کہ انسان (آدم) کو ٹھیکرے کی طرح بجنے والی مٹی سے پیدا کیا، فخار کے معنی آگ میں پکائی ہوئی مٹی یعنی ٹھیکرا، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ ان آیات سے اس طرف اشارہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مختلف اطوار و احوال کے ساتھ ہوئی ہے، سب سے پہلے حق

تعالیٰ نے زمین سے مٹی لی، اس کے اندر سے اس کا خالص حصہ اور جوہر یعنی خالص اور عمدہ جزء نکالا، اس کو پانی میں گوندھا۔ جس سے وہ طین لازب چپکنے والی مٹی ہو گئی جیسے آٹا گوندھنے کے بعد ہاتھوں پر چپکنے لگتا ہے، پھر اس کو کچھ عرصہ تک اسی طرح چھوڑے رکھا یہاں تک کہ حمأ مسنون بن گئی، یعنی اس کے رنگ و بو میں تغیر پیدا ہو گیا، پھر اس سے حضرت آدم علیہ السلام کا پتلا اور جسم تیار کیا جیسے توا، پیالہ وغیرہ دیگر برتن بنائے جاتے ہیں پھر اس کو ہوا میں سکھا دیا جس سے وہ صلصال کالفخار یعنی سخت ٹھیکرے کی مانند ہو گیا کہ اگر اس پر چٹکی ماری جائے تو آواز نکلے (یا یوں کہا جائے کہ اس جسم کو سکھا کر آگ میں پکا دیا جس سے وہ ٹھیکرے کی طرح ہو گیا جیسے مٹی کے برتن سکھانے کے بعد آگ میں پکا کر ان کو پختہ کر دیا جاتا ہے)، اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق عناصر اربعہ (مٹی، پانی، ہوا، آگ) سے ہوئی کہ مٹی کو پانی میں ملا کر ہوا میں سکھا کر آگ میں پکا دیا مگر چونکہ جزء غالب مٹی ہے اس لئے کہہ دیا جاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے جیسے مٹی کا لوٹا، پیالہ وغیرہ عناصر اربعہ سے بنایا جاتا ہے کہ مٹی کو پانی میں ملا کر برتن کی صورت بنا کر ہوا میں سکھانے کے بعد آگ میں پکایا جاتا ہے مگر جزء غالب مٹی ہونے کی وجہ سے مٹی کا لوٹا، مٹی کا پیالہ کہا جاتا ہے، یہ کوئی نہیں کہتا کہ یہ آگ، پانی، مٹی، ہوا کا لوٹا ہے۔

بہرحال حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مختلف احوال و اطوار کے ساتھ ہوئی ہے، پہلی چار آیات میں ابتدائی حالت اور آیت نمبر ۵، ۶، ۷، ۸، ۹ میں درمیانی حالت اور آیت نمبر ۱۰ میں حالت اخیرہ کو بیان کر دیا گیا۔ فلا تعارض بین تلک الآیات۔ (صاوی، جمل، وغیرہ)

کافر کی توبہ قبول ہوتی ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۳،۴

آیات

① ﴿لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

(پارہ: ۳ رکوع: ۱۷ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۵۶) ✦

② ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ﴾

(پارہ: ۳ رکوع: ۱۷ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۵۶)

③ ﴿وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْاٰنَ﴾ (پارہ: ۴ رکوع: ۱۳ سورۂ نساء جلالین ص: ۷۲)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کی توبہ قبول ہوجاتی ہے کیونکہ آیت میں پہلے تو کفار کے لئے عذاب کی وعید سنائی، پھر اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا الخ کہہ کر استثناء فرمایا کہ جو کفار توبہ کر لیتے ہیں اور اپنے عمل کی اصلاح کر لیتے ہیں ان کی حق تعالیٰ مغفرت فرما دیتے ہیں اور ان پر رحم فرماتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ کافر کی توبہ قبول ہوجاتی ہے اور آیت نمبر ۲ و ۳ میں لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ اور وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ الخ الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کی توبہ قبول نہیں ہوتی، پس بظاہر ان آیات میں تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ پہلی آیت اس صورت پر محمول ہے جب کہ کافر حضورِ موت اور حالتِ نزع سے پہلے پہلے توبہ کرے اس کی توبہ قبول ہوجاتی ہے اور دوسری و تیسری آیت میں مراد یہ ہے کہ جب موت کا وقت آجائے، نزع کی حالت طاری ہوجائے، عالمِ آخرت کی چیزیں نظر آنے لگیں اس وقت کافر کفر سے توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی جیسا کہ تیسری آیت میں تصریح ہے حَتّٰى إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ الخ پس قبولیتِ توبہ کا اثبات قبل حضور الموت پر اور قبولیت کی نفی عند حضورِ موت پر محمول ہے۔ فلا تعارض بینہما۔ (حاشیہ جلالین ص ۵۶)

❷ کافر اگر کفر سے توبہ کرے اور اسلام لے آئے تو قبول ہوجاتی ہے لیکن اگر کافر کفر پر رہتے ہوئے اپنے گناہوں سے توبہ کرے تو یہ قبول نہیں ہوتی اس لئے کہ توبہ عن المعاصی کے لئے ایمان شرط ہے جو کافر میں مفقود ہے، پس آیت اولیٰ توبہ عن الکفر پر محمول ہے اور آیت نمبر ۲ و ۳ توبہ عن المعاصی پر محمول ہیں۔ فلا تعارض بینہما۔

(مفہوم من بیان القرآن پارہ ۴)

حق تعالیٰ سے کتنا ڈرنا چاہیے؟

پارہ نمبر: ۴، ۲۸

آیات

① ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ﴾

(پارہ: ۴ رکوع: ۲ سورۃ آل عمران جلالین ص: ۵۷) ◆

② ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا﴾

(پارہ: ۲۸ رکوع: ۱۶ سورۃ تغابن جلالین ص: ۴۶۳)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں حکم دیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ سے اتنا ڈرو جتنا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے یعنی اس کی شایانِ شان اس کی عظمت وجلالت کے لائق تقویٰ اختیار کرو اور دوسری آیت میں فرمایا کہ تم حق تعالیٰ سے اتنا ڈرو جتنی تم میں طاقت ہے، پس دونوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے پانچ جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ، آیت ثانیہ سے منسوخ ہے، حق تعالیٰ نے اولاً تو اپنی شایانِ شان ڈرنے کا حکم دیا ہے مگر چونکہ یہ بات لوگوں پر شاق گذری اس لئے کہ حق تعالیٰ کی شان عظمت وجلالت کے لائق ڈرنے کا مطلب تو یہ ہے کہ بندہ ہر لمحہ اللہ کی اطاعت میں لگا رہے، ایک پلک جھپکنے کے برابر بھی اللہ کی نافرمانی نہ کرے، ہر وقت اللہ کا شکر کرتا رہے، کبھی ناشکری نہ کرے، ہر وقت اللہ کا ذکر کرتا رہے، کبھی غافل نہ ہو، اللہ کے

معاملے میں لومۃ لائم کا بالکل اندیشہ نہ کرے اور ہر چیز میں انصاف کرے، خواہ وہ اپنے یا اپنے باپ اور بیٹے کے خلاف کیوں نہ ہو اور ظاہر ہے کہ اتنا تقویٰ اختیار کرنا بندوں کی طرف سے ناممکن ہے اس کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم حق تقویٰ ادا کرنے کی کوشش کرتے اور پوری پوری رات عبادت میں گزارتے یہاں تک کہ ان کے پاؤں پر ورم آنے لگا، جب لوگوں پر یہ امر شاق گزرا تو حق تعالیٰ نے تخفیف فرمادی اور آیت ثانیہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ نازل فرما کر حکم اول کو منسوخ کردیا اور فرمایا کہ جتنی تم میں طاقت ہے اتنا تقویٰ اختیار کرو، سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے:

﴿عن سعید بن جبیر قال: لما نزلت اشتد علی القوم العمل. فقاموا حتی ورمت عراقیبهم وتقرحت جباههم. فانزل الله تعالیٰ تخفیفا علی المسلمین فاتقوا الله ما استطعتم. فنسخت الایة الاولی.﴾ (رواه ابن ابی حاتم، روح المعانی)

ترجمہ: "حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں پر عمل کرنا بھاری ہوگیا، لوگ اللہ کی عبادت میں کھڑے رہتے یہاں تک کہ ان کی رگوں پر ورم آنے لگا، ان کی پیشانیوں پر زخم ہوگئے تو اللہ نے مسلمانوں پر تخفیف فرماتے ہوئے آیت فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ نازل فرمائی، پس پہلی آیت منسوخ ہوگئی۔"

بہت سے حضرات نے اس آیت سے متعلق نسخ ہی کا دعویٰ کیا ہے۔ حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس سورت میں اس آیت کے علاوہ کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے نسخ کا دعویٰ کیا جائے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی نسخ کے قائل ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، قتادہ، ابن زید، اور علامہ سدی رحمۃ اللہ علیہم سے بھی یہی مروی ہے لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک

روایت ہے ولا تعارض بعد النسخ۔ (روح المعانی، خازن، مظہری)

❷ حَقَّ تُقَاتِہٖ میں "حق" حَقَّ الشَّیْءُ بمعنی ثبت ووجب سے ماخوذ ہے اور حق کی اضافت "تقاتہ" کی طرف اضافۃ الصفۃ الی الموصوف کے قبیل سے ہے، اصل اس کی یہ ہے کہ اتقوا اللّٰہ اتقاء حقاً ای ثابتا واجباً یعنی اللہ سے اتنا ڈرو جتنا ڈرنا اللہ کی طرف سے تم پر واجب ہے اور ڈرنا کتنا واجب ہے اس کو حق تعالیٰ نے دوسری آیت میں بیان کر دیا فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ کہ "تم پر حسب استطاعت تقویٰ واجب ہے" پس بقدر طاقت تم اللہ سے ڈرتے رہو، آیت ثانیہ آیت اولیٰ کا بیان ہے۔ پس کوئی تعارض نہیں ہے۔ (روح المعانی)

❸ فَاتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ کفر وشرک اور امور اعتقادیہ سے متعلق ہے اور فاتقوا اللّٰہ ما استطعتم کا تعلق اعمال سے ہے، مطلب یہ ہے کہ کفر وشرک اور امور اعتقادیہ میں تو حق تعالیٰ سے اتنا ڈرو جتنا حق ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کو واحد مانو، کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ بناؤ، اس کو ذات وصفات میں تمام عیوب ونقائص سے منزہ اور مقدس مانو، اور اعمال میں حسب استطاعت تقویٰ اختیار کرو، اگر وضو کی طاقت نہ ہو تو تیمم کر لیا کرو، اگر قیام پر قدرت نہ ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھ لیا کرو، اس توجیہ کو علامہ زرکشی نے البرہان میں شیخ ابوالحسن شاذلی سے نقل کیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے الفوز الکبیر میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ (الروض النضیر شرح الفوز الکبیر)

❹ اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ کا مطلب یہ ہے کہ تمام معاصی سے اجتناب کرو۔ اب یہ آیت نہ تو دوسری آیت سے منسوخ ہوگی کیونکہ جمیع معاصی سے اجتناب کے حکم کو منسوخ کرنے کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ بعض معاصی کے کرنے کی اجازت دی جا رہی ہے حالانکہ یہ باطل ہے اور نہ ہی یہ آیت دوسری آیت کے معارض ہوگی اس لئے کہ تمام معاصی سے بچنا انسان کی طاقت سے باہر نہیں، پس جو آدمی صلاح وعفت کے ساتھ زندگی گزارے، معاصی سے اجتناب کرتا رہے اس نے اتقوا اللّٰہ حق تقاتہ

اور فاتقوا اللہ ما استطعتم والی آیت پر عمل کرنا اور دونوں آیتوں کا مفہوم اس صورت میں متحد ہو گیا۔ فلا تعارض بینھما۔ (تفسیر کبیر)

❺ ابن عطاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلی آیت مقربین رحمہم اللہ کے حق میں ہے اور دوسری آیت ابرار کے حق میں ہے، حضرات مقربین رحمہم اللہ کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ وجود مجازی سے نکل کر وجود حقیقی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، حق تعالیٰ کے علاوہ ان کو کسی شے کا وجود نظر ہی نہیں آتا اور وہ لوگ لا موجود الا اللّٰہ کا نعرہ لگاتے ہیں، یہی حق تقویٰ ہے جو مقربین حضرات رحمہم اللہ ادا کرتے ہیں، یعنی آیت اولیٰ میں مقربین رحمہم اللہ کو خطاب ہے کہ تم لوگ حق تقویٰ ادا کرو، اور آیت ثانیہ میں عوام الناس کو خطاب ہے کہ تم لوگ بقدر وسعت و طاقت اللہ سے ڈرو، حق تقویٰ تم سے ادا نہیں ہو سکتا۔ فاندفع التعارض بینھما۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۰۱)

غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی امداد کے لئے کتنے فرشتے بھیجے گئے؟

پارہ نمبر: ۴، ۹

آیات

① ﴿إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَن يَكْفِيَكُمْ أَن يُمِدَّكُمْ رَبُّكُم بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُنزَلِينَ﴾ (پارہ ۴، رکوع ۳، سورۃ آل عمران، جلالین ص ۵۹، ۶۰)

② ﴿يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ﴾ (پارہ ۴، رکوع ۴، سورۃ آل عمران، جلالین ص ۶۰)

③ ﴿فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ﴾ (پارہ ۹، رکوع ۱۵، سورۃ انفال، جلالین ص ۱۴۸)

تشریح تعارض

غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی تعداد کم اور مشرکین کی تعداد زیادہ تھی، حق تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے مسلمانوں کی مدد فرمائی تھی لیکن فرشتوں کی تعداد کی متعلق آیات مختلف ہیں، پہلی آیت میں ہے کہ تین ہزار فرشتوں کو بھیج کر مدد فرمائی، دوسری آیت میں ہے کہ پانچ ہزار فرشتوں کے ذریعہ مدد فرمائی اور تیسری آیت میں ایک ہزار فرشتوں کا ذکر ہے، پس بظاہر ان میں تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو ایک ہزار فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ فرمایا، پھر

رفتہ رفتہ فرشتوں کی تعداد میں اضافہ فرما دیا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے جب دیکھا کہ مشرکین ایک ہزار کی تعداد میں ہیں اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم صرف تین سو ہیں، تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے قبلہ رو ہو کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور دعا فرمائی اے اللہ! آپ نے مجھ سے نصرت کا وعدہ کر رکھا ہے وہ پورا فرما دیجئے، اے اللہ! اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو روئے زمین پر کوئی تیری عبادت کرنے والا نہیں رہے گا۔ نہایت الحاح و زاری کے ساتھ آپ یہ دعا کرتے رہے یہاں تک کہ آپ کی چادر مبارک آپ کے شانہ مبارک سے نیچے گر گئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اٹھا کر آپ کے شانہ مبارک پر ڈالی اور پیچھے کی طرف سے آ کر آپ سے چمٹ گئے اور عرض کیا اے اللہ کے نبی! آپ کا حق تعالیٰ سے دعا کر لینا کافی ہے (آپ فکر نہ کریں) اب حق تعالیٰ وعدہ ضرور پورا فرمائیں گے۔ چنانچہ دعا قبول ہوئی اور ایک ہزار فرشتے بھیجنے کا وعدہ فرمایا کہ یکے بعد دیگرے ایک ہزار فرشتے آئیں گے، اسی کو سورۂ انفال کی آیت میں فرمایا گیا: فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ

چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام پانچ سو فرشتوں کے ساتھ نازل ہوئے اور مسلمانوں کے لشکر کے دائیں حصہ میں جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے شریک ہو کر قتال کیا اور پانچ سو فرشتے حضرت میکائیل علیہ السلام لے کر نازل ہوئے انہوں نے لشکر کے بائیں حصہ میں جس میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے شامل ہو کر قتال کیا، اس کے بعد مسلمانوں کو خبر ملی کہ مشرکین کی امداد کے لئے اور لوگ آ رہے ہیں، چنانچہ ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ اور ابن منذر رحمہ اللہ وغیرہ نے حضرت امام شعبیؒ کی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ مسلمانوں کو غزوۂ بدر میں یہ خبر پہنچی کہ کرز بن جابر محاربی مشرکین کی امداد کا ارادہ رکھتا ہے، اس سے مسلمانوں کو بے چینی ہوئی، حق تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی: اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلَافٍ مِّنَ

الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِیْنَ۔ جس میں تین ہزار فرشتے امداد کے لئے بھیجنے کا وعدہ فرمایا، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ اگر کفار نے ایک دم حملہ کردیا اور تم لوگ صبر و تقویٰ پر ثابت قدم رہے تو حق تعالیٰ پانچ ہزار فرشتے خاص نشانی کے ساتھ بھیج کر امداد فرمائیں گے چنانچہ سفید عمامے باندھے ہوئے فرشتے نازل ہوئے اور مسلمانوں کا ساتھ دیا اور حق تعالیٰ نے اس طرح مسلمانوں کو نصرت عطا فرمائی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اولاً ایک ہزار فرشتے نازل ہوئے، پھر دو ہزار فرشتے اور آئے، کل تین ہزار ہوگئے، پھر دو ہزار اور بھیجے گئے، کل پانچ ہزار ہوگئے۔ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے یہی مروی ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ اولاً ایک ہزار آئے، پھر مزید تین ہزار آئے، پھر ان کے علاوہ پانچ ہزار آئے، کل تعداد نو ہزار ہوئی اور اگر اس امداد کو غزوۂ احد کے واقعہ پر محمول کیا جائے تو کل تعداد آٹھ ہزار ہوتی ہے کیونکہ غزوۂ احد میں ایک ہزار والی پہلی امداد کا ذکر نہیں ہے۔ کمافی الخازن۔ اور روح المعانی میں جو تعداد کا مجموعہ آٹھ ہزار مذکور ہے وہ غزوۂ احد پر محمول کرنے کی صورت میں ہے۔ بہرحال اس تفصیل کے بعد ان آیات میں کوئی تعارض نہیں رہا۔

(روح المعانی، خازن، صاوی، تفسیر ابوالسعود، بیان القرآن، جمل وغیرہ)

تمام گناہوں کی مغفرت ہوگی یا بعض کی؟

پارہ نمبر: ۴، ۵، ۶، ۲۰، ۲۴، ۲۶، ۳۰

آیات

① ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ﴾ (پارہ: ۴، رکوع: ۴، سورۂ آل عمران، جلالین ص: ۶۰)

② ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ﴾ (پارہ: ۵، رکوع: ۱۵، سورۂ نساء، جلالین ص: ۸۷)

③ ﴿يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ﴾ (پارہ: ۶، رکوع: ۷، سورۂ مائدہ، جلالین ص: ۹۸)

④ ﴿يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (پارہ: ۶، رکوع: ۱۰، سورۂ مائدہ، جلالین ص: ۱۰۰)

⑤ ﴿يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ﴾ (پارہ: ۲۰، رکوع: ۱۲، سورۂ عنکبوت، جلالین ص: ۳۳۶)

⑥ ﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ﴾ (پارہ: ۲۶، رکوع: ۱۰، سورۂ فتح، جلالین ص: ۴۲۳)

⑦ ﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ (پارہ: ۲۴، رکوع: ۳، سورۂ زمر، جلالین ص: ۳۸۹)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ شرک کے علاوہ جن گناہوں کو چاہیں گے معاف فرمادیں گے، جن پر چاہیں گے عذاب دیں گے، مطلب یہ ہے کہ

تمام گناہوں کی مغفرت ضروری نہیں ہے بلکہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے، وہ عذاب دینا چاہیں گے تو عذاب بھی دیں گے اور آیت نمبر ۷ میں ارشاد ہے کہ اے حد سے تجاوز کرنے والو میرے گنہگار بندو! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بے شک اللہ تمام گناہوں کی مغفرت فرمادیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام گناہوں کی مغفرت یقینی ہے کسی گناہ پر عذاب نہیں ہوگا، پس یہ آیت پہلی چھ آیتوں کے بظاہر معارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

۱ پہلی چھ آیات قبل التوبہ پر محمول ہیں اور ساتویں آیت بعد التوبہ پر محمول ہے، مطلب یہ ہے کہ آدمی اگر گناہوں سے توبہ کئے بغیر مرگیا اگر وہ مشرک ہے تو اس کی مغفرت نہیں ہوگی اور اگر مؤمن عاصی ہے تو اس کے گناہوں کا مسئلہ حق تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے اگر چاہیں گے تو معاف فرمادیں گے، چاہیں گے تو عذاب دے دیں گے اور اگر کافر اپنے کفر و شرک سے توبہ کرلیتا ہے اور مشرف بہ اسلام ہوجاتا ہے تو حالت کفر میں کئے ہوئے تمام معاصی معاف ہوجاتے ہیں "ان الاسلام یھدم ما کان قبلہ" اور اگر مؤمن عاصی ہے اور وہ اپنے تمام گناہوں سے توبہ کرلیتا ہے اور اس کی توبہ شرائط صحت پر پوری اترتی ہے تو حق تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرما دیتے ہیں، کسی گناہ پر عذاب نہیں دیں گے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (جمل)

۲ آیت نمبر ۷ میں اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا مقید ہے لمن یشآء کی قید کے ساتھ، قرینہ اس کا یہ ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قراءت میں اس کی تصریح وارد ہوئی ہے، پس اس آیت میں بھی پہلی چھ آیات کی طرح مغفرت، اللہ کی مشیت پر موقوف ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (روح المعانی)

جنت پیدا شدہ ہے یا قیامت کے بعد پیدا کی جائے گی؟

پارہ: ۴، ۲۷، ۲۰

① ﴿وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ﴾ (پ۴، ع۵، سورۂ آل عمران، جلالین ص ۶۰)

② ﴿سَابِقُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ﴾
(پارہ: ۲۷، رکوع ۱۹، سورۂ حدید، جلالین ص ۴۵۱)

③ ﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا﴾ (پارہ: ۲۰، رکوع ۱۲، سورۂ قصص، جلالین ص ۳۳۳)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ و ۲ میں جنت کے متعلق اُعِدَّتْ صیغۂ ماضی استعمال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت پیدا کی جا چکی ہے جیسا کہ اہل سنت والجماعت رحمہم اللہ کا مسلک ہے اور آیت نمبر ۳ میں جنت کے متعلق ارشاد ہے کہ یہ آخرت کا گھر ہم اس کو ان لوگوں کے لئے بنائیں گے جو زمین میں تکبر اور فساد کا ارادہ نہیں رکھتے، اس میں نَجْعَلُهَا مضارع کا صیغہ ہے جو اس بات پر دال ہے کہ جنت ابھی پیدا نہیں کی گئی ہے بلکہ قیامت کے بعد پیدا کی جائے گی جیسے کہ معتزلہ کا مسلک ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ صیغۂ مضارع فقط استقبال ہی کے لئے نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ حقیقۃً تو حال کے لئے ہے اور مجازاً استمرار کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے جس میں ماضی، حال و استقبال تینوں داخل ہیں جیسے يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَمَافِي الْاَرْضِ میں یسبح صیغۂ مضارع استمرار کے لئے مستعمل ہے، ایسے ہی نجعلها میں صیغۂ مضارع استمرار کے لئے ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ جنت پیدا کی جاچکی ہے اور اب بھی موجود ہے، آئندہ بھی موجود رہے گی، پس یہ آیت اُعِدَّتْ والی آیتوں کے معارض نہیں ہے۔

(الخبراس)

❷ نجعلها میں جعل خلق کے معنی میں مستعمل نہیں ہے جو متعدی بیک مفعول ہوتا ہے بلکہ یہ تملیک کے معنی میں ہے جو متعدی بدو مفعول ہوتا ہے، مفعول اول "ها" ضمیر ہے اور مفعول ثانی للذین الخ ہے، معنی یہ ہوں گے کہ ہم مالک بنادیں گے جنت کا ان لوگوں کو جو زمین میں تکبر و فساد نہیں کرتے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جنت اسی وقت پیدا کی جائے گی بلکہ جنت تو پہلے ہی پیدا کی جاچکی ہے، البتہ اب تک اہل جنت کو جنت کا مالک نہیں بنایا گیا ہے، قیامت کے بعد مالک بنایا جائے گا، پس مضارع استقبال کے معنی میں ہونے کے باوجود یہ آیت پہلی دونوں آیتوں کے معارض نہیں رہی۔ (الخبراس)

مومنین کے لئے آخرت میں رسوائی ہوگی یا نہیں؟

پارہ ۴، ۲۸

آیات

① ﴿رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ﴾

(پارہ ۴، رکوع ۱۱، سورۂ آل عمران جلالین ص: ۶۷)

② ﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾

(پارہ ۲۸، رکوع ۲۰، سورۂ تحریم جلالین ص: ۴۶۶)

تشریحِ تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ جس کو بھی جہنم میں داخل فرمائیں گے اس کو رسوا اور ذلیل فرمائیں گے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جن گنہگار مومنین کو حق تعالیٰ اپنی مشیت کے مطابق جہنم میں داخل کریں گے وہ بھی رسوا اور ذلیل ہوں گے اور دوسری آیت میں ہے کہ اللہ نبی اور مومنین کو رسوا نہیں فرمائیں گے، پس دونوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے چار جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ میں ادخال فی النار سے مراد ہمیشہ کے لئے داخل کرنا ہے، یعنی حق تعالیٰ جس کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں داخل کریں گے اس کو رسوا فرمائیں گے اور ہمیشہ کے لئے داخل ہونے والے کفار ہیں، پس یہ آیت کفار کے متعلق ہے کہ یہ لوگ جہنم میں رسوا اور ذلیل ہوں گے اور دوسری آیت مومنین کے لئے ہے کہ ان کو رسوائی اور

ذلت نہیں ہوگی، حضرت انس رضی اللہ تعالٰی عنہ، سعید بن المسیب، قتادہ، اور ابن جریج رحمہم اللہ تعالٰی سے یہی منقول ہے اور اختلاف اشخاص کے بعد کوئی تعارض نہیں رہتا۔

(صاوی، روح المعانی)

❷ اختلاف اشخاص ہی پر محمول ہے بایں طور کہ آیت ثانیہ میں آمنوا معہ سے مراد صحابہ ہیں کہ جو آپ صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے ان کو آپ کی معیت اور صحبت نصیب ہوئی ان کو رسوا نہیں فرمائیں گے اور آیت اولی میں کفار اور عصاۃِ مؤمنین مراد ہیں، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (روح المعانی)

❸ آیتِ ثانیہ میں دائمی رسوائی کی نفی مقصود ہے کہ حق تعالٰی مؤمنین کو ہمیشہ کے لئے رسوا نہیں کریں گے، اگر بعض عصاۃِ مؤمنین کو جہنم میں داخل کر کے رسوائی ملے گی تو وہ ہمیشہ کے لئے نہیں ہوگی، بلکہ ایک عرصہ تک عذاب ہونے کے بعد جہنم سے نکال کر جنت میں بھیج دیا جائے گا اور رسوائی سے نجات مل جائے گی، پس آیت اولی میں اثبات مؤمنین کے حق میں خزی غیر دائمی کا ہے اور آیتِ ثانیہ میں نفی خزی دائمی کی ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (روح المعانی)

❹ لفظ اخزاء مشترک ہے دو معنی کے درمیان ایک تخجیل (شرمندہ کرنا) دوسرے اہلاک (ہلاک کر دینا) آیت اولی میں اثباتِ اخزاء بمعنی تخجیل کا ہے اور آیت ثانیہ میں نفی اخزاء بمعنی اہلاک ہے، مطلب یہ ہوگا کہ حق تعالٰی عصاۃ مؤمنین کو شرمندہ تو فرمائیں گے مگر ہلاک نہیں کریں گے، جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں، جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں۔ فلا تعارض بینہما۔ (روح المعانی)

انسان اپنی ازواج متعددہ کے مابین عدل و مساوات کرسکتا ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر ۴، ۵

آیات

① ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً﴾ (پارہ ۴ رکوع ۱۲ سورۂ نساء جلالین ص ۶۹)

② ﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ﴾

(پارہ ۵ رکوع ۱۶ سورۂ نساء جلالین ص ۸۸)

تشریح تعارض

اللہ جل شانہ نے مرد کو ایک سے لے کر چار عورتوں تک سے شادی کرنے کی اجازت دی ہے، اس کے ساتھ ساتھ بیویوں کے مابین عدل و مساوات قائم کرنا واجب قرار دیا اور یہ بھی فرمایا: فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً یعنی (اگر تمہیں یقین ہے کہ متعدد بیویوں کے مابین عدل و مساوات قائم کرسکو گے تو متعدد عورتوں سے نکاح کی اجازت ہے) اور اگر یہ اندیشہ ہو کہ ان کے مابین عدل و انصاف نہیں ہوسکے گا تو صرف ایک عورت سے شادی کرو، متعدد عورتوں سے نکاح کی اجازت نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اگر چاہے تو متعدد بیویوں کے مابین عدل و انصاف کر سکتا ہے، پس اگر عدل کرسکے تو متعدد شادیاں کرے ورنہ ایک کی اجازت ہے متعدد کی نہیں، اور آیت ثانیہ میں قطعی طور پر فرمادیا گیا کہ تم متعدد عورتوں کے درمیان ہرگز عدل و مساوات نہیں کرسکتے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ متعدد شادیاں کرنے کے متعلق اجازت نہیں ہے، فقط ایک سے شادی کرے، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض

ہو رہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ آیتِ اُولیٰ میں ان امور میں مساوات مراد ہے جو انسان کے اختیار میں ہیں جیسے نان ونفقہ میں مساوات کرنا، رات گزارنے میں برابری کرنا وغیرہ کہ ان امور میں عدل و مساوات بین النساء واجب ہے، اگر ان چیزوں میں مساوات کرنے کا یقین ہے تو متعدد شادیاں کر سکتا ہے اور اگر عدمِ مساوات کا اندیشہ ہے تو تعدد کی اجازت نہیں فقط ایک شادی کرے اور آیتِ ثانیہ میں جو مساوات پر قدرت کی نفی کی گئی ہے یہ امورِ غیر اختیاریہ کے بارے میں ہے جیسے محبت اور قلبی میلان اور جماع کرنا، چنانچہ امام بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عبیدہ سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد لَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا ذٰلِكَ فِي الْحُبِّ وَالْجِمَاعِ ہے، ابن منذر نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت جماع کے بارے میں ہے، ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن رحمہ اللہ سے اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ یہ محبت سے متعلق ہے، ابن ابی شیبہ اور ابن جریر نے ابو ملیکہ سے نقل کیا ہے کہ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں نازل ہوئی کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم بہ نسبت دیگر ازواجِ مطہرات کے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے زیادہ محبت رکھتے تھے

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے:

﴿كان النبي صلى الله تعالى عليه وآله وسلم يقسم بين نسائه، فيعدل، ثم يقول: اللهم هذا قسمي فيما أملك، فلا تلمني فيما تملك ولا أملك. يعني القلب اي عشق رسول الله صلى الله تعالى عليه وآله وسلم بما تملك

المحبة وميل القلب الغير الاختياري)۔

(رواہ احمد و ابو داود والترمذی وغیرہم۔ روح المعانی ص ۱۹۳)

ترجمہ: "نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اپنی عورتوں کے درمیان تقسیم کرتے تو عدل فرماتے تھے، پھر ارشاد فرماتے کہ اے اللہ یہ میری تقسیم ہے اس چیز میں جس کا میں مالک ہوں، پس جس چیز کا تو مالک ہے اور میں مالک نہیں ہوں یعنی قلبی محبت، سو اس میں (اگر مجھ سے کچھ کمی بیشی ہوجائے) تو مجھے ملامت نہ فرمانا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ملک سے محبت اور قلب کا غیر اختیاری میلان مراد لیا ہے۔"

بہرحال محبت، جماع اور قلبی میلان میں مساوات کرنا انسان کے اختیار کی بات نہیں، اس میں انسان مجبور و معذور ہوتا ہے، اس کے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا "وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ" کہ تم غیر اختیاری امور میں مساوات نہیں کر سکتے یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے، پس متعدد بیویوں میں سے اگر قلبی میلان کسی ایک کی طرف ہوجائے تو کوئی مؤاخذہ نہیں ہے، البتہ اس کا ضرور خیال رکھو کہ دوسری عورت کو بالکل نظر انداز نہ کرو، "فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ" ایک ہی کی طرف بالکل مائل نہ ہو جاؤ کہ بیچاری دوسری کو معلق کرکے چھوڑ دو، وہ نہ ادھر کی رہے نہ ادھر کی، کہ شوہر نہ تو اس کو طلاق ہی دیتا ہے کہ جس سے وہ دوسری جگہ شادی کرے اور نہ اس کی خبر گیری اور خیال رکھتا ہے، بلکہ تم کو چاہئے کہ قلبی محبت و میلان ایک طرف ہونے کے باوجود نان و نفقہ و شب باشی سب کا برابر خیال رکھو، پس ان دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

(روح المعانی، معارف القرآن)

رازق صرف اللہ ہے یا بندے بھی رازق ہیں؟

پارہ نمبر: ۴، ۷، ۱۷، ۲۲، ۲۷

آیات

① ﴿وَارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا﴾

(پارہ: ۴ رکوع: ۱۲ سورۂ نساء جلالین ص: ۶۹)

② ﴿وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا﴾ (پارہ: ۴ رکوع: ۱۲ سورۂ نساء جلالین ص: ۷۰)

③ ﴿وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾ (پارہ: ۷ رکوع: ۵ سورۂ مائدہ جلالین ص: ۱۱۰)

④ ﴿وَإِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾ (پارہ: ۱۷ رکوع: ۱۵ سورۂ حج جلالین ص: ۲۸۴)

⑤ ﴿وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾

(پارہ: ۲۲ رکوع: ۱۱ سورۂ سبا جلالین ص: ۳۶۴) ✦

⑥ ﴿إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۲ سورۂ ذاریات جلالین ص: ۴۳۴)

تشریحِ تعارض

پہلی دو آیتوں میں "ارزقوھم" کہہ کر رزق عطا کرنے کی نسبت بندوں کی طرف کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندے بھی رزق عطا کرتے ہیں، اسی طرح آیت نمبر ۳، ۴ و ۵ میں حق تعالیٰ کی صفت خیر الرازقین بیان کی گئی ہے کہ حق تعالیٰ رزق دینے والوں میں سے بہتر رزق عطا کرنے والے ہیں، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کے علاوہ بندے بھی رازق ہیں، خلاصہ یہ ہوا کہ ان پانچوں آیتوں

میں صفتِ رزاقیت حق تعالیٰ اور بندوں کے درمیان عام کر دیا گیا ہے اور آیت نمبر ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ رزاقیت حق تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے کیونکہ اِنَّ کے اسم و خبر کے درمیان جو ضمیر لائی گئی ہے جو حصر و اختصاص پر دال ہوتی ہے۔ پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ رازقیت کا عموم بین اللہ والعباد ایصال کے اعتبار سے ہے اور اختصاص بہ خلق کے اعتبار سے ہے، یعنی رزق پیدا کرنے والے تو صرف حق تعالیٰ ہیں بندے نہیں اور رزق پہنچانے والے اللہ بھی ہیں اور بندے بھی، بندہ بھی اللہ کی پیدا کی ہوئی اور عطا کی ہوئی رزق میں سے دوسروں تک رزق پہنچاتا ہے، کہا جاتا ہے فلان یرزق عائلتہ "فلاں شخص اپنے بال بچوں کو رزق دیتا ہے" یعنی ان کے لئے رزق مہیا کرتا ہے اور ان کو پہنچاتا ہے، ان کو کھلاتا پلاتا ہے، بہرحال جہتِ خلق و ایصال کا فرق ہونے کے بعد تعارض نہیں رہا۔ (صاوی، جمل وغیرہ)

❷ عموم رازقیت کا ہے اور اختصاص رزاقیت کا ہے، یعنی رازق تو حق تعالیٰ بھی ہیں اور بندے بھی، البتہ رزاق صرف حق تعالیٰ ہیں۔ رزاق مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی تمام مخلوق کو رزق عطا کرنے والا اور بہت زیادہ رزق دینے والا اور ظاہر ہے کہ یہ صفت حق تعالیٰ کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ (صاوی)

زنا کاری کی سزا کیا ہے؟

پارہ نمبر: ۴، ۱۸

آیات

① ﴿ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴾ (پارہ:۴، رکوع:۱۳، سورۂ نساء، جلالین ۷۲) ✦

② ﴿ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ﴾ (پارہ:۴، رکوع:۱۳، سورۂ نساء، جلالین ۷۲) ✦

③ ﴿ اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ﴾

(پارہ:۱۸، رکوع:۷، سورۂ نور، جلالین ۲۹۳)

تشریح تعارض

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زانیہ عورت کا زنا جب چار گواہوں کے ذریعے ثابت ہوجائے تو اس کی سزا یہ ہے کہ اس کو گھر میں روک لیا جائے، باہر نکلنے نہ دیا جائے یہاں تک کہ وہ مرجائے یا اس کے لیے اللہ کوئی اور راستہ نکال دے اور آیت نمبر۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا کرنے والے مرد و عورت کی سزا یہ ہے کہ ان کو تکلیف پہنچائی جائے (یعنی اس کو شرمندہ کیا جائے اور پٹائی کی جائے) اگر وہ توبہ کرلیں اور اپنا عمل درست کرلیں تو ان کو چھوڑ دیا جائے، کوئی سزا نہ دی جائے اور آیت نمبر۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ زانی اور زانیہ (اگر غیر شادی شدہ ہوں تو ان) کے ۱۰۰/۱۰۰ کوڑے مارے جائیں، پس ان تینوں آیات میں بظاہر تعارض ہورہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ دوسری آیت پہلی آیت سے منسوخ ہے، پھر پہلی آیت تیسری آیت سے منسوخ ہو چکی ہے، چنانچہ حضرت حسن رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے زنا کی سزا ایذا رسانی نازل ہوئی کہ جو مرد و عورت زنا کر لیں ان کو تکلیف پہنچاؤ، ایذا کی تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تعییر اور ضرب بالنعال کے ساتھ منقول ہے کہ ان کو شرمندہ کرو (مثلاً یوں کہو کہ تمہیں زنا کرتے ہوئے شرم نہیں آئی، خدا کا خوف نہیں آیا؟ تم نے بہت بری حرکت کی ہے، وغیرہ وغیرہ) اور جوتوں سے پٹائی کرو، حضرت قتادہ، مجاہد اور سدی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ایذا کی تفسیر فقط تعییر اور توبیخ کے ساتھ کی ہے کہ ان کو شرم دلاؤ اور ڈانٹو۔ اس کے بعد یہ آیت منسوخ ہو گئی اور آیت اولیٰ والتی یاتین الفاحشة الخ نازل ہوئی، جس میں زنا کی سزا امساك في البيوت بیان فرمائی کہ جو عورت زنا کرے اس کو گھر میں قید کر دو، باہر نہ نکلنے دو یہاں تک کہ اس کو موت آجائے یا اللہ کوئی دوسرا حکم نازل فرما دیں، اس لئے کہ عورت عام طور سے زنا میں جو مبتلا ہوتی ہے وہ باہر نکلنے اور مردوں کے سامنے آنے کی وجہ سے ہوتی ہے، جب وہ گھر میں محبوس رہے گی تو زنا کاری سے بچی رہے گی، پھر یہ حکم بھی منسوخ ہو گیا اور دوسرا حکم نازل ہو گیا، چنانچہ سورۂ نور کی آیت اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ نازل ہوئی کہ زانی اور زانیہ کے (جب کہ وہ غیر شادی شدہ ہوں) ۱۰۰/۱۰۰ کوڑے لگاؤ، لاتعارض بعد النسخ۔ (مدارک، مظہری وغیرہ)

❷ ابو مسلم اصفہانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پہلی آیت سحاقات کے بارے میں ہے سحاقات وہ عورتیں کہلاتی ہیں، جو آپس میں ایک عورت دوسری عورت سے استمتاع کر کے اپنی شہوت پوری کر لیتی ہیں ان عورتوں کی سزا یہ بیان فرمائی کہ ان کو گھروں میں روک لو، مراد یہ ہے کہ ایسی عورتوں کا آپس میں اختلاط نہ ہونے دو، ان کے

درمیان تفریق اور جدائی کر کے ان کو اپنے اپنے گھروں میں محبوس کر دو، ایک کو دوسری کے پاس جانے نہ دو اور آیت نمبر ۲ لواطت کرنے والے مردوں کے بارے میں ہے، ان کی سزا یہ بیان کی کہ ان کو ایذا رسانی کرو، ان کم بختوں کو شرم دلاؤ اور ان کی پٹائی کرو اور تیسری آیت زنا کرنے والوں کے بارے میں ہے کہ ان کی سزا سو کوڑے لگانا ہے (اور اگر شادی شدہ ہوں تو رجم کرنا ہے جیسا کہ آیت منسوخۃ التلاوۃ "اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجِمُوْهُمَا اَلْبَتَّةَ نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ" سے، نیز حدیث سے ثابت ہے) اور جب تینوں آیتوں کا مصداق جدا جدا ہے، تو کوئی تعارض نہیں رہا۔

(تفسیر کبیر، روح المعانی)

❸ ابو سلیمان خطابی رحمۃ اللہ علیہ معالم السنن میں فرماتے ہیں کہ آیت اولیٰ منسوخ نہیں ہے بلکہ یہ تو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عورتوں کا گھروں میں مقید کرنا اس وقت تک ممتد ہے جب تک کہ اللہ ان کے بارے میں کوئی اور راستہ نکال دے، مطلب یہ ہے کہ ابھی ان عورتوں کو گھروں میں روکے رکھو، ہم ان کے بارے میں عنقریب کوئی سبیل نکالیں گے، اب وہ سبیل کیا ہے اس کو مجمل رکھا گیا، پھر حق تعالیٰ نے آیت نور "الزانیۃ والزانی الخ" نازل فرما کر اس سبیل کو بیان کر دیا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "خذوا عنی، خذوا عنی قد جعل اللّٰہ لھن سبیلاً۔ (رواہ مسلم)

پس آیت نور اور یہ حدیث، آیت اولیٰ کے اجمال کا بیان ہے، نہ کہ ناسخ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی الفوز الکبیر میں اسی کو اختیار کیا ہے، اور اجمال کے بعد بیان کر دینے کو تعارض نہیں کہا جاتا، مگر اس پر سوال یہ ہے کہ پہلی آیت میں امساك فی البیوت اور دوسری آیت میں ایذا کا حکم ہے ان میں تطبیق کیسے ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ امساک فی البیوت ثیبہ کے بارے میں ہے اور ایذا باکرہ کے حق میں ہے۔ (مظہری، روح المعانی، خازن، الفوز الکبیر)

وراثت اقرباء کے لئے ہے یا مولی الموالاۃ کے لئے؟

پارہ نمبر: ۲۱،۱۰،۵

(۱) ﴿وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا﴾ (پارہ: ۵ رکوع: ۳ سورۂ نساء جلالین ص ۷۵) ✦

(۲) ﴿وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ (پارہ: ۱۰ رکوع: ۶ سورۂ انفال جلالین ص ۱۵۴)

(۳) ﴿وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَائِكُمْ مَعْرُوفًا﴾

(پارہ: ۲۱ رکوع: ۱۷ سورۂ احزاب جلالین ص: ۳۵۱)

تشریح تعارض

آیت نمبر ا میں ارشاد ہے کہ جن لوگوں سے تمہارے معاہدے ہو چکے ہیں ان کو میراث کا حصہ دو، یعنی اجنبی لوگ جو ایک دوسرے کے رشتہ دار نہ ہوں اگر آپس میں یہ معاہدہ کرلیں کہ ہم ایک دوسرے کے مددگار رہیں گے، اگر ہم میں سے کسی پر کوئی دیت واجب ہوگی تو دوسرا اس کو ادا کردے گا، اگر ہم میں سے کوئی مرگیا تو دوسرا اس کے مال کا وارث ہو جائے گا ایسے معاہدہ کرنے والے شخص کو مولی الموالاۃ کہا جاتا ہے: ایسی صورت میں شرعی حکم آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے درمیان وراثت جاری ہوگی، ان کو میراث کا حصہ دیا جائے گا اور اخیر کی دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ

وراثت رشتہ داروں میں جاری ہوتی ہے، آدمی کے مرنے کے بعد اس کے مال کی میراث اس کے اقرباء میں تقسیم کی جائے گی، جس کی تفصیل آیاتِ میراث میں موجود ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ آیت نمبر ۱، اخیر کی دونوں آیتوں سے منسوخ ہے، زمانہ جاہلیت میں لوگ آپس میں اس طرح کا معاہدہ کرلیا کرتے تھے اور ان میں وراثت جاری ہوتی تھی، ابتداء اسلام میں جب تک اکثر لوگوں کے رشتہ دار مسلمان نہیں ہوئے تھے یہی حکم رہا کہ مرنے والے کی ساری میراث اس کے معاہدہ کرنے والے حلیف کو دیدی جاتی تھی، جب اکثر لوگ مسلمان ہوگئے تو کچھ ترمیم فرمادی کہ حلیف کو ساری میراث تو نہیں البتہ مال کا چھٹا حصہ دیدیا کرو، اسی کو آیت نمبر ۱ میں بیان کیا گیا ہے، پوری آیت اس طرح ہے "وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ" کہ ہم نے ہر شخص کے لئے اس کے والدین اور رشتہ داروں کے ترکہ میں وارثین مقرر کردیئے ہیں اور جن لوگوں کے ساتھ تمہارے پہلے سے معاہدے ہوچکے ہیں ان کو ان کا حصہ یعنی سدس مال دیدیا کرو، نصیب سے مراد سدس (چھٹا حصہ) ہے، پھر دوسری اور تیسری آیت نازل فرماکر مولی الموالاۃ کے حصہ کو بالکل ہی منسوخ کردیا گیا۔ (معین بیان القرآن)

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی کے قریب قریب نقل کیا ہے۔

﴿عن قتادة قال: كان الرجل يعاقد الرجل في الجاهلية، فيقول: دمي دمك، وهدمي هدمك، وترثني وأرثك، وتطلب بي وأطلب

بك، فيجعل له السدس من جميع المال في الاسلام، ثم يقسم اهل الميراث ميراثهم، فنسخ ذلك بعد في سورة الانفال بقوله سبحانه وتعالى: واولوا الارحام بعضهم اولى ببعض في كتاب الله. (اخرجه ابن جرير وغيره، روح المعاني ج٥ ص٢٣)

ترجمہ: "حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ایک شخص دوسرے شخص سے معاہدہ کر لیتا تھا کہ اگر کسی نے میرا خون کر دیا تو گویا تمہارا خون کر دیا اور میری آبرو ریزی کی تو گویا تمہاری عزت پر دھبہ لگایا، تم میرے وارث ہو گے میں تمہارا وارث ہوں گا، تم میرے خون کا مطالبہ کرنا میں تمہارے خون کا مطالبہ کروں گا۔ اسلام میں ایسے شخص کو میت کے کل مال میں سے چھٹا حصہ دیا جاتا تھا، پھر باقی مال میں سے اہل میراث کو ان کی میراث تقسیم کی جاتی تھی، اس کے بعد سورۂ انفال کی آیت: وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ الآیۃ سے یہ حکم منسوخ کر دیا گیا۔"

خلاصہ یہ ہوا کہ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ منسوخ ہے اور اخیر کی دونوں آیتیں اس کے لئے ناسخ ہیں۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے یہ ہے کہ ناسخ اس کے لئے آیت کا جزء اول "وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ" ہے۔ (روح بحوالہ قرطبی، کذا فی الجمل)

بہتر یہ ہے کہ تینوں ہی اس کے لئے ناسخ ہیں، اس آیت کا جزء اول بھی اور اخیر کی دونوں آیتیں بھی جیسا کہ علامہ صاوی نے اختیار کیا ہے، بہرحال نسخ کے بعد تعارض نہیں رہتا، یعنی آیت نمبر ۱ آیت نمبر ۲ و ۳ سے معارض نہیں ہے۔

(روح معانی، جمل، صاوی)

❷ جواب اول میں تو "وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ" میں عقد سے مراد عقد محالفت

اور موالاۃ ہے جس کا ذکر کیا گیا ہے، دوسرا جواب یہ ہے کہ عقد سے مراد عقد مواخاۃ فی الدین ہے جو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ابتداء ہجرت میں مہاجرین وانصار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان قائم فرمادی تھی اور "نصیبھم" سے مراد حصۂ میراث نہیں بلکہ نصرت وامداد اور خیر خواہی ہے، دراصل مہاجرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اپنا وطن، اپنے اعزاء واقارب کو چھوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی، لوگ تنہا تنہا مسلمان ہوئے تھے، ان کے کنبے قبیلے کے لوگ کافر تھے جو مکہ میں تھے، مدینہ میں حضرات مہاجرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی کسی سے قرابت داری نہیں تھی تو اس وقت آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین وانصار مدینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مابین مواخاۃ قائم فرمادی تھی، ان میں سے دو دو آدمیوں (ایک مہاجر اور ایک انصاری) کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا تھا، اُخوت ایمانی کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے، جب مہاجرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دوسرے رشتہ دار بھی مسلمان ہو کر مدینہ آ گئے تو ایمان وہجرت والی وراثت کو حق تعالیٰ نے منسوخ کر کے وراثت بالقرابۃ کا حکم نازل فرما دیا اور سورۂ نساء کی آیت وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ الخ نازل ہوئی کہ ہم نے ہر ایک کے لئے اس کے والدین اور اقرباء کے ترکہ میں وارثین مقرر کر دیئے ہیں، ان ہی کو میراث کا مال تقسیم کیا جائے، مواخاۃ فی الدین کی وجہ سے کسی کو وراثت نہیں ملے گی، البتہ ایمانی اور دینی بھائیوں کے لئے آگے فرمادیا "وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ" یعنی جن لوگوں کے ساتھ تمہارے بھائی چارگی کے تعلقات قائم ہو گئے ہیں ان کے ساتھ نصرت وامداد اور خیر خواہی کا معاملہ کرتے رہو ان کے لئے کوئی وصیت کر جاؤ یا ان کی بطور تبرع واحسان کے امداد کرو، "نصیبھم" سے مراد حصۂ میراث نہیں بلکہ نصرت وامداد اور خیر خواہی کرنا ہے، آیت اولیٰ کی یہ مذکورہ تفسیر بخاری شریف وغیرہ کی روایت میں موجود ہے۔

﴿عن ابن عباس رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ قال: کان المهاجرون لما قدموا المدينة يرث المهاجر الانصاری دون ذوی رحمه للاخوة التی آخی النبی صلی اللّٰہ تعالٰی علیه وآله وسلم بينهم، فلما نزلت ولكل جعلنا موالی الخ نسخت، ثم قال، والذين عقدت ايمانكم فاتوهم نصيبهم من النصر والرفادة والنصيحة، وقد ذهب الميراث ويوصی له.﴾

(اخرجه البخاری وابوداؤد والنسائی وغیرہ ـ روح المعانی ج۵:ص۲۰)

ترجمہ: ”حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ مہاجرین جب مدینہ آتے تو مہاجر اپنے قرابت داروں کے بجائے انصاری کا وارث ہوتا تھا اس اخوت کی وجہ سے جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے مابین قائم فرمادی تھی، پس جب آیت ”وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ الخ نازل ہوئی تو یہ وراثت بالاخوۃ والدین منسوخ ہوگئی، پھر حق تعالیٰ نے (موالی فی الدین یعنی دینی بھائیوں اور دوستوں کے بارے میں) فرمادیا ”وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ“ کہ جن لوگوں کے ساتھ تمہارے دینی تعلقات قائم ہوگئے ہیں ان کو ان کا حصہ دو یعنی ان کی نصرت وامداد اور خیر خواہی کرو، ان کی میراث ختم ہوگئی اب ان کے لئے وصیت کی جاسکتی ہے۔“

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی کے مثل مروی ہے، اس تفسیر سے یہ بات سامنے آئی کہ آیت مذکورہ کا مضمون دو حصوں پر مشتمل ہے، حکم اول یہ کہ وراثت اعزاء و اقارب میں جاری ہوگی، یہ تو آیت کے جزء اول ”وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ“ میں مذکور ہے۔ حکم دوم یہ کہ موالی فی الدین کے ساتھ نصرت و امداد اور خیر خواہی کا معاملہ کیا جائے یہ آیت کے جزء ثانی ”وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ

اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ الخ" میں بیان کیا گیا ہے۔ یہی مضمون اخیر کی دونوں آیتوں کا ہے۔ آیت ثانیہ میں "وَاُولُوا الْاَرْحَامِ اَوْلٰى بَعْضُهُمْ بِبَعْضٍ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ" کہہ کر حکم اول کو بیان کیا گیا ہے کہ اہلِ قرابت آپس میں وارث بننے میں اجنبی سے اولیٰ و مقدم ہیں۔ اجنبی کو تو ضرورت کی وجہ سے ان میں مواخاۃ فی الدین قائم کر کے وارث بنا دیا گیا تھا، جب ضرورت مرتفع ہوگئی تو وراثت بالاخوۃ الدینیۃ کو منسوخ کر کے وراثت بالقرابۃ کو جاری کر دیا گیا، اور آیت ثالثہ میں دونوں حکموں کی تصریح ہے "وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ" میں حکم اول اور "اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا" میں حکم ثانی کا بیان ہے کہ اپنے دینی دوستوں اور بھائیوں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو جب تینوں آیتوں کا مضمون متحد و مساوی ہوگیا تو کوئی تعارض نہیں رہا۔

(٣) تیسرا جواب یہ ہے کہ آیت نمبر ۱ میں جو مولی الموالاۃ کو حصہ میراث دینے کا حکم دیا گیا ہے یہ اس حالت پر محمول ہے جب کہ میت کے اقارب اولوا الارحام اور عصبات نہ ہوں، ایسی حالت میں میراث مولی الموالاۃ (یعنی جس سے معاہدہ و محالفہ ہوگیا ہو جو جواب اول میں ذکر کیا گیا ہے) کو ملے گی اور آیت نمبر ۲ و ۳ اس حالت پر محمول ہیں جبکہ میت کے اقارب موجود ہوں ایسی صورت میں اقارب مقدم ہوں گے مولی الموالاۃ پر، اس لئے کہ اخیر کی آیتوں میں مولی الموالاۃ کو مطلقاً میراث دینے کی نفی نہیں ہے بلکہ اولوا الارحام کو مقدم و اولیٰ بتایا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اقارب اور مولی الموالاۃ دونوں ہوں تو اقارب کو مقدم رکھا جائے گا، مولی الموالاۃ کو وراثت نہیں ملے گی اور اگر اقارب موجود نہ ہوں تو مولی الموالاۃ کو میراث دی جائے گی۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے ہاتھ پر مسلمان ہو اور دونوں آپس میں ایک دوسرے کے وارث بنیں اور ایک دوسرے کی

دیت ادا کرنے کا معاہدہ کر لیں تو یہ درست ہے، ایسی صورت میں اگر میت کا اس حلیف کے علاوہ کوئی اور قرابتی وارث نہ ہو تو وراثت بھی حلیف کو ملے گی، اس توجیہ پر نہ تو آیت اولیٰ منسوخ ہوئی اور نہ ان آیات میں کوئی تعارض رہا، اس لئے کہ یہ علیحدہ علیحدہ حالتوں پر محمول ہیں۔ (روح المعانی وغیرہ)

مشرکین قیامت کے دن کوئی بات چھپائیں گے یا نہیں؟

پارہ نمبر ۵، ۷

آیات

(۱) ﴿وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا﴾ (پارہ: ۵ رکوع: ۳ سورۂ نساء، جلالین ص ۷۷)

(۲) ﴿ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ (۱) إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ﴾
(پارہ ۷ رکوع ۹ سورۂ انعام جلالین ص ۱۱۳)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین قیامت کے دن اللہ کے سامنے کوئی بات نہیں چھپائیں گے، ہر بات سچ سچ بتادیں گے اور آیت نمبر ۲ میں ہے کہ جب حق تعالیٰ قیامت کے دن مشرکین سے فرمائیں گے "أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ" تمہارے وہ شرکاء کہاں ہیں جن کے بارے میں تم اللہ کے شرکاء ہونے کا گمان کرتے تھے تو مشرکین کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں ہوگا کہ وہ یوں کہیں گے "وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ" ہمارے خدا نے پروردگار کی قسم ہم تو کسی کو بھی آپ کا شریک نہیں ٹھہراتے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین اللہ کے سامنے جھوٹی قسم کھا کر اپنا شرک چھپائیں گے پس دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے کیونکہ آیت اولیٰ میں کتمان کی نفی اور دوسری میں کتمان کا اثبات ہے۔

(۱) فتنہ سے مراد معذرت ہے چونکہ سبب ابتلاء فتنہ ہے اس لئے فتنہ سے تعبیر کیا گیا ہے یا اس لئے کہ یہ جواب کذب ہے، والکذب فتنة۔ (جمل)

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ اختلافِ اوقات پر محمول ہے، ایک وقت تو وہ اپنا شرک چھپائیں گے لیکن دوسرے وقت میں چھپا نہیں پائیں گے بلکہ صحیح صحیح بیان کر دیں گے، یعنی ابتداء تو وہ جھوٹی قسم کھا کر اپنا شرک چھپائیں گے مگر جب حق تعالیٰ ان کی زبانوں پر مہر لگا کر ان کے اعضاء و جوارح سے گواہی دلوائیں گے، تو اعضاء و جوارح ان کا کفر و شرک صحیح صحیح بیان کر دیں گے، اس وقت یہ لوگ کوئی بات چھپا نہیں پائیں گے، اعضاء و جوارح کی گواہی کے وقت وہ کسی بات کو چھپانے اور انکار کرنے پر قادر ہی نہیں ہوں گے یہ توجیہ بخاری شریف کی روایت سے ثابت ہے۔

﴿عن ابن عباس رضي الله تعالى عنه في قوله تعالى: "ولا يكتمون الله حديثا" وقوله تعالى: "والله ربنا ما كنا مشركين"، انه قال: ان المشركين لما رأوا يوم القيامة ان الله يغفر لاهل الاسلام، ويغفر الذنوب، ولا يغفر الشرك جحد واوجاه ان يغفرلهم، فقالوا: والله ربنا ما كنا مشركين. فيختم الله على افواههم، وتكلمت ايديهم وارجلهم بما كانوا يعملون، فعند ذلك يود الذين كفروا وعصوا الرسول لوتسوى بهم الارض، ولايكتمون الله حديثا﴾ (رواہ البخاری وفیہ تفسیر طبری)

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اللہ کے قول "وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا" اور اللہ کے قول "وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ" کے بارے میں روایت ہے، فرمایا کہ مشرکین جب قیامت کے دن دیکھیں گے کہ حق تعالیٰ اہلِ اسلام کی مغفرت فرما رہے ہیں اور

گناہوں کو بخش رہے ہیں مگر شرک کی مغفرت نہیں فرما رہے ہیں تو مشرکین! اس امید پر کہ ان کی مغفرت ہو جائے اپنے شرک کا انکار کر دیں گے اور کہہ دیں گے اللہ کی قسم ہمارے رب کی قسم! ہم مشرک نہیں تھے۔ پس حق تعالیٰ ان کی زبانوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ پاؤں بولیں گے، ان کا کفر و شرک اور ان کے اعمال صحیح صحیح بیان کر دیں گے، پس اس وقت کفار اور رسول کے نافرمان تمنا کریں گے کہ کاش ہم کو زمین کی مٹی میں ملا کر زمین کو ہموار کر دیا جاتا اور اس وقت وہ لوگ اللہ سے کوئی بات چھپا نہیں پائیں گے۔"

بخاری شریف کی ایک روایت ہے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قرآن کی چند آیات کے درمیان تعارض کے متعلق سوال کیا جن میں سے دو آیتیں یہی ہیں تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہی جواب دیا جو ابھی اوپر گزرا۔

(تفسیر مظہری)

نعمت ومصیبت سب اللہ کی طرف سے ہے یا مصیبت بندہ کی جانب سے ہے؟

پارہ نمبر ۵

آیات

(۱) ﴿وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾

(پارہ ۵ رکوع ۸ سورۃ نساء جلالین ص: ۸۱) ✦

(۲) ﴿مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾

(پارہ ۵ رکوع ۸ سورۃ نساء جلالین ص: ۸۲)

تشریح تعارض

مدینہ میں منافقین کو جب خوشحالی پیش آتی تھی تو کہتے تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے آتی ہے اور جب کوئی مصیبت اور بدحالی پیش آتی تھی تو اس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کہتے تھے کہ یہ مصیبت اور بدحالی نعوذ باللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نحوست سے آئی ہے، حق تعالیٰ نے فرمایا "قل کل من عند اللہ" کہ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ نعمت ومصیبت سب اللہ کی طرف سے آتی ہے میرا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نعمت ومصیبت، راحت وتکلیف سب اللہ کی طرف سے آتی ہیں اور آیت ثانیہ میں ارشاد ہے کہ راحت ونعمت تو اللہ کی طرف سے ہے اور مصیبت وپریشانی خود بندہ کی طرف سے آتی ہیں، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

دفعِ تعارض

آیت اولیٰ میں اجمال اور دوسری آیت میں اس کی تفصیل ہے اور تفصیل بعد الاجمال کو تعارض نہیں کہا جاتا ہے، وضاحت اس کی یہ ہے کہ آیت اولیٰ میں یہ بتایا گیا ہے کہ خوش حالی و بدحالی ہر چیز کا خلق و ایجاد حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، البتہ خوش حالی تو حق تعالیٰ بلا واسطہ محض اپنے فضل سے عطا فرماتے ہیں اور بدحالی بواسطہ معاصی عموماً نازل فرماتے ہیں لیکن بلاواسطہ اور بالواسطہ کی تفصیل اس آیت میں بیان نہیں کی گئی بلکہ "قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ" کہہ کر اس کو مجمل طور پر ذکر کر دیا، آیت ثانیہ میں اس کی تفصیل بیان فرما دی "مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ" کہ جو نعمت و خوش حالی تم کو پہنچتی ہے وہ بلا واسطہ محض اللہ کے فضل و کرم سے پہنچتی ہے اور "مَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ" جو مصیبت و بدحالی آتی ہے یہ تمہارے گناہوں کے واسطہ سے آتی ہے، حقیقت یہی ہے کہ نعمتوں اور راحتوں کے نزول میں بندوں کی عبادات کو کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی نعمتیں تو اس قدر ہیں کہ بندہ اپنی تمام عبادات سے ان کا حق شکر ادا نہیں کر سکتا، حق تعالیٰ نے بندہ کو وجود بخشا اور اس کو عبادت کرنے کی توفیق عطا فرمائی، یہ وجود اور توفیق عبادت خود اتنی بڑی بڑی نعمتیں ہیں کہ بندہ کی تمام عبادات و طاعات ان ہی کی مکافات نہیں کر سکتی ہیں چہ جائیکہ دیگر نعمتوں کا حق ادا کر سکیں، بلکہ حق تو یہ ہے کہ بندہ کی پوری زندگی کے اعمال حسنہ اور عبادتیں خدا کی ایک چھوٹی سی چھوٹی نعمت کا حق ادا نہیں کر سکتیں، پس معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہر لحظہ اور ہر آن، جو بندوں پر نعمتوں اور رحمتوں کی بارشیں ہوتی رہتی ہیں اس کا سبب بندوں کی عبادات نہیں ہیں، بلکہ یہ محض اللہ کا فضل و احسان ہے، اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَنْ يُدْخِلَ أَحَدًا عَمَلُهُ الْجَنَّةَ، قِيْلَ: وَلَا أَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!

قَالَ: وَلَا أَنَا إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ مِنْهُ بِفَضْلٍ وَرَحْمَةٍ. ﴾

(رواہ البخاری و مسلم عن ابی ہریرۃ ، روح المعانی)

ترجمہ: ”کسی شخص کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا، عرض کیا گیا، یا رسول اللہ، آپ بھی (اپنے عمل کی وجہ سے داخل) نہیں (ہوں گے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور میں بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ مجھے اپنے فضل و رحمت میں چھپا لیں۔“

البتہ مصائب و آلام کا آنا بندوں کی بد اعمالیوں کا نتیجہ ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ نے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا ہے ”مَآ أَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ“ حدیث میں بھی یہی مضمون وارد ہوا ہے:

﴿عن أبي موسى رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لاتصيب عبدا نكبة فما فوقها وما دونها إلا بذنب، وما يعفوا أكثر. ﴾ (رواہ ترمذی، مظہری)

ترجمہ: ”حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ کو جو کوئی تنگی یا سخت مصیبت لاحق ہوتی ہے تو وہ اس کے گناہوں کی وجہ سے ہوتی ہے اور جن گناہوں کو اللہ معاف فرما دیتے ہیں وہ زیادہ ہیں۔“

قرآن پاک میں تعارض واختلاف ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر ۵، ۱۵، ۲۳

آیات

(۱) ﴿لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾

(پارہ ۵، رکوع ۸، سورۂ نساء، جلالین ص: ۸۲)

(۲) ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾

(پارہ ۱۵، رکوع ۱۳، سورۂ کہف، جلالین ص: ۲۴۰)

(۳) ﴿قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾

(پارہ ۲۳، رکوع ۱۵، سورۂ زمر، جلالین ص: ۳۸۷)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ میں ارشاد ہے کہ اگر یہ قرآن اللہ کے علاوہ کسی اور کا بنایا ہوا ہوتا تو اس میں اختلاف کثیر پایا جاتا، اس کے مضامین میں، الفاظ و معانی میں فصاحت و بلاغت میں بہت اختلاف و تناقض ہوتا، لیکن اس میں اختلاف کثیر نہیں ہے، پس معلوم ہوا کہ یہ غیر اللہ کا کلام نہیں ہے بلکہ منزل من اللہ ہے، اس آیت میں قرآن میں اختلاف کثیر کی نفی کی گئی ہے اور کثیر کی نفی سے قلیل کی نفی نہیں ہوتی بلکہ قلیل کا اثبات رہتا ہے، جس سے یہ لازم آتا ہے کہ قرآن میں اختلاف کثیر تو نہیں البتہ اختلاف قلیل ہے اور آیت نمبر ۲، ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں کسی قسم کا بالکل کوئی اختلاف و تناقض نہیں ہے، نہ قلیل و کثیر، کیونکہ دونوں آیتوں میں عوج نکرہ تحت

لائے نفی استعمال ہوا ہے جو عموم نفی کا فائدہ دیتا ہے کہ کسی بھی قسم کی بالکل نفی اور اختلاف و تعارض نہیں ہے اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ قرآن پاک ہر قسم کے عیوب سے محفوظ ہے یعنی قلیل ہو یا کثیر منزہ و مقدس ہے پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ میں کثیرا کی قید احترازی نہیں ہے کہ کثیر کی نفی سے قلیل کا اثبات مقصود ہو بلکہ یہ قید مبالغہ اور ترقی کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ قرآن غیر اللہ کا کلام ہوتا تو اس میں صرف اختلاف قلیل ہی نہیں بلکہ اختلاف کثیر ہوتا اور قرآن میں تو قلیل اختلاف بھی نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ منزل من اللہ کلام ہے۔ پس اس آیت سے بھی نفی مطلق اختلاف کی ہو رہی ہے لہٰذا یہ آیت دوسری اور تیسری آیت کے معارض نہیں ہوگی۔ (جمل وصاوی)

❷ کثرت کی قید احترازی نہیں بلکہ مضامین کی کثرت کی وجہ سے یہ قید لگائی گئی ہے ورنہ نفی مطلق اختلاف ہی کی مقصود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ قرآن غیر اللہ کا کلام ہوتا تو اس کے مضامین میں بہت کچھ اختلاف ہوتا (اور چونکہ اس کے مضامین کثیر ہیں، ہر ہر مضمون میں ایک ایک اختلاف پائے جانے کی وجہ سے اختلاف بھی کثیر ہو جاتا) لیکن اس میں کچھ بھی اختلاف نہیں ہے، کسی مضمون میں بھی تعارض و تناقض نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ غیر اللہ کا کلام نہیں ہے بلکہ اللہ کا کلام ہے۔

(جواب ۲ حضرت مولانا اشرف علی صاحب التھانوی رحمۃ اللہ علیہ فی بیان القرآن)

اس توجیہ سے واضح ہو گیا کہ مطلق اختلاف کی نفی ہے۔ پس اس آیت کا اخیر کی دونوں آیتوں سے کوئی تعارض نہیں ہے۔ تینوں آیات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن میں کسی قسم کا کوئی اختلاف، تعارض اور تناقض نہیں اور آیات قرآنیہ میں جو تعارض نظر

آتا ہے وہ ظاہر نظر میں ہے ... مگر غور و نظر عمیق کے بعد کوئی تعارض نہیں ہے

آپ کے زیر مطالعہ ہمارا یہ رسالہ ''آیاتِ متعارضہ اور ان کا حل'' اسی مضمون پر تالیف کیا گیا ہے، اس رسالہ میں دفع تعارض کی جو توجیہات و تحقیقات پیش کی گئی ہیں ان کے سامنے آنے کے بعد بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ آیاتِ قرآنیہ تعارض و تناقض سے منزہ و مقدس ہیں۔

قابضِ روح حق تعالیٰ ہیں یا ملک الموت یا دیگر ملائکہ ہیں؟

پارہ نمبر: ۵، ۷، ۸، ۱۰، ۱۴، ۲۴، ۲۶

آیات

① ﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ﴾

(پارہ ۵، رکوع ۱۱، سورۂ نساء، جلالین ص: ۸۵)

② ﴿حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا﴾

(پارہ ۷، رکوع ۱۴، سورۂ انعام، جلالین ص: ۱۱۵)

③ ﴿حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ﴾ (پارہ ۸، رکوع ۱۱، سورۂ اعراف، جلالین ص: ۱۳۲)

④ ﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ﴾ (پارہ ۱۰، رکوع ۳، سورۂ انفال، جلالین ص: ۱۵۲)

⑤ ﴿الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ﴾

(پارہ ۱۴، رکوع ۱۰، سورۂ نحل، جلالین ص: ۲۱۸)

⑥ ﴿الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ﴾ (پارہ ۱۴، رکوع ۱۰، سورۂ نحل، جلالین ص: ۲۱۹)

⑦ ﴿فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ﴾

(پارہ ۲۶، رکوع ۷، سورۂ محمد (القتال)، جلالین ص: ۴۲۲) ✦

⑧ ﴿وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفَّاكُمْ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ﴾

(پارہ ۱۴، رکوع ۱۵، سورۂ نحل، جلالین ص: ۲۲۳)

⑨ ﴿اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا﴾ (پارہ ۲۴، رکوع ۲، سورۂ زمر، جلالین ص: ۳۸۸) ✦

(۱۰) ﴿قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ﴾ (پارہ:۲۱، رکوع:۱۴، سورۂ سجدہ، جلالین ص ۳۴۹)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو جب موت آتی ہے تو اس کی روح کئی فرشتے آکر قبض کرتے ہیں، کیونکہ ان آیات میں "ملائکۃ" اور "رسلنا" صیغۂ جمع کے ساتھ ہے اور آیت نمبر ۸ و ۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ خود روح قبض کرتے ہیں اور آیت نمبر ۱۰ اس بات پر دال ہے کہ صرف ایک فرشتہ (ملک الموت) روح قبض کرتا ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

۱ جب کسی کی موت کا وقت آتا ہے تو حق تعالیٰ ملک الموت (حضرت عزرائیل علیہ السلام) کو اس کی روح قبض کرنے کا حکم دیتے ہیں، ملک الموت کے ساتھ چند فرشتے معاونین کی حیثیت سے جاتے ہیں، ملائکہ معاونین انسان کے بدن کی رگوں سے روح کو کھینچتے ہیں، جب روح حلق تک پہنچ جاتی ہے اور نکلنے کے قریب ہوتی ہے تو پھر ملک الموت اس کو قبض کرکے بالکل باہر نکال دیتا ہے، پس حق تعالیٰ قبض روح کے آمر ہوئے، اور رگوں سے نکال کر حلقوم تک پہنچانے والے اور تعاون کرنے والے ملائکہ ہوئے، اور حلقوم سے باہر نکالنے والے ملک الموت ہوئے۔

پہلی سات آیات میں نسبت معاونین کی طرف کردی گئی ہے کیونکہ فعل کی نسبت معاون و شریک کی طرف بھی کردی جاتی ہے، جیسے کسی کو قتل کرنے والا شخص واحد ہو اور دوسرے لوگوں نے تعاون کیا ہو تو کہا جاتا ہے "قتلوا قتيلا" کہ اس مقتول کو سب نے قتل کیا ہے اور آیت نمبر ۸، ۹ میں آمر حقیقی حق تعالیٰ کی طرف نسبت

کر دی گئی ہے، اس لئے اس فعل کی نسبت آمر کی طرف بھی کر دی جاتی ہے، کہا جاتا ہے "بنی الأمیر القصر" بادشاہ نے محل بنایا، یعنی بنانے کا حکم دیا اور آیت نمبر ۱۰ میں قابض یعنی ملک الموت کی طرف نسبت کر دی گئی، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

(روح المعانی وتفسیر خازن)

❷ ملک الموت تو ارواح کو قبض کرتا ہے، دیگر ملائکہ اس کا تعاون کرتے ہیں، ملک الموت کے حکم پر عمل کرتے ہیں، پھر حق تعالیٰ روح کو کھینچ کر بدن سے بالکل باہر نکال دیتے ہیں چونکہ قبض روح میں شرکت سب کی ہوتی ہے اس لئے بعض آیات میں حق تعالیٰ کی طرف، بعض میں ملک الموت کی طرف، بعض میں ملائکہ رسل کی طرف نسبت کر دی گئی۔ فلا تعارض۔ (روح البیان بحوالہ حاشیہ جلالین ص ۳۳۹)

❸ اختلاف اشخاص پر محمول ہے، یعنی بعض لوگوں کی روحیں خود حق تعالیٰ قبض کرتے ہیں، بعض کی ملک الموت اور بعض کی دیگر ملائکہ قبض کرتے ہیں، چنانچہ شہداء بحر کے بارے میں روایت میں آیا ہے کہ ان کی ارواح ان کے اعزاز و اکرام میں حق تعالیٰ خود ہی قبض فرماتے ہیں، ملک الموت کے حوالے نہیں فرماتے:

﴿عن أبي أمامة رضي الله عنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إن الله وكل ملك الموت بقبض الأرواح إلا شهداء البحر، فإنه سبحانه يتولى قبض أرواحهم.﴾ (رواہ ابن ماجہ، روح المعانی)

ترجمہ: "حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو ارواح کے قبض کرنے پر مقرر کیا ہے، مگر پانی میں غرق ہو کر شہید ہو جانے والے لوگوں کی ارواح حق تعالیٰ خود قبض فرماتے ہیں۔"

مؤمن عاصی جہنم میں داخل ہوگا یا نہیں؟

پارۂ نمبر: ۵،۳۰

آیات

① ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾
(پارہ: ۵ رکوع: ۵ سورۂ نسا، جلالین ص: ۸۷) ✦

② ﴿لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَشْقَى الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ﴾
(پارہ: ۳۰ رکوع: ۱ سورۂ لیل جلالین ص: ۵۰۱)

تشریح تعارض

آیت نمبر ا میں ارشاد ہے کہ شرک کی تو مغفرت نہیں ہوگی شرک کے علاوہ مؤمن عاصی کے گناہوں پر حق تعالیٰ سزا بھی دے سکتے ہیں، معاف بھی کر سکتے ہیں اور آیت نمبر ۲ میں ارشاد ہے کہ جہنم میں صرف ایمان سے روگردانی کرنے والا اور تکذیب کرنے والا بد بخت کافر ہی داخل ہوگا اور کوئی نہیں کیونکہ نفی واستثناء کے ساتھ کلام کرنا حصر کے لئے مفید ہوتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن عاصی جہنم میں داخل نہیں ہوگا، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

دوسری آیت میں دخول جہنم سے مراد دخول ابدی ہے کہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں، صرف کافر ہی داخل ہوگا، مؤمن عاصی کو اگر حق تعالیٰ عذاب دینا چاہیں گے تو کچھ مدت تک عذاب دینے کے بعد جہنم سے نکال کر جنت میں داخل فرمادیں گے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (جلالین)

تمام عزتیں اللہ کے لئے ہیں یا رسول اور مومنین کے لئے بھی ہیں؟

پارہ نمبر ۵، ۱۱، ۲۲، ۲۸

① ﴿أَيَبْتَغُونَ عِندَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا﴾

(پارہ ۵ رکوع ۱۷ سورۃ نساء جلالین ص ۸۹)

② ﴿إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾

(پارہ ۱۱ رکوع ۱۳ سورۃ یونس جلالین ص ۱۷۹)

③ ﴿مَن كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا﴾

(پارہ ۲۲ رکوع ۱۴ سورۃ فاطر جلالین ص ۳۶۵)

④ ﴿وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ﴾

(پارہ ۲۸ رکوع ۱۳ سورۃ منافقون جلالین ص ۴۶۲)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱، ۲، ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام عزتیں اللہ کے لئے ہیں اور آیت نمبر ۴ میں ہے کہ عزت اللہ اور اس کے رسول اور مومنین سب کے لئے ہے، لہٰذا ان میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی تین آیات میں عزت بالذات اور بلا واسطہ مراد ہے

اور آیت نمبر ۳ میں رسول اور مومنین کے لئے عزت بالواسطہ مراد ہے، فلا تعارض، حاصل یہ ہے کہ بلاواسطہ اور حقیقۃً تو تمام عزتیں دنیا و آخرت کی، حق تعالیٰ کے لئے ہیں، پھر تعلق مع اللہ اور قرب الی اللہ کے واسطے سے رسول کو عزت حاصل ہوئی، پھر رسول کی اتباع اور اطاعت کے واسطے سے مومنین کو عزت حاصل ہوتی ہے۔

(روح المعانی)

پس جو شخص عزت کا طالب ہو وہ اللہ سے تعلق قائم کرے، اس کی اطاعت کرے۔ تمام عزتیں اسی کے ہاتھ میں ہیں، وہی تمام عزتوں کا مالک ہے۔ اہل دنیا اور کفار و مشرکین کے پاس ہرگز ہرگز عزت حاصل نہیں ہو سکتی۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "ایبتغون عندھم العزۃ" کیا یہ لوگ کفار کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں "فان العزۃ للہ جمیعا" عزتیں تو تمام کی تمام اللہ کے ہاتھ میں ہے "من کان یرید العزۃ فللہ العزۃ جمیعا" جو شخص عزت کا طالب ہو تو تعلق مع اللہ قائم کرے اس کی اطاعت کرے عزت نصیب ہوجائے گی۔ "وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین" رسول کو جو عزت حاصل ہوتی ہے وہ تعلق مع اللہ اور قرب الی اللہ کے واسطے سے ہوئی پھر اتباع رسول اور اطاعت رسول کے واسطے سے مومنین کو عزت ملی پس غیروں کے یہاں عزت تلاش کرنا حماقت اور بے وقوفی ہے۔

وضو میں پاؤں کا غسل واجب ہے یا مسح؟

پارہ نمبر: ۶

آیات

① ﴿وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾

(بقراءۃ النصب) (پارہ: ۶، رکوع: ۶، سورۃ مائدہ مع جلالین ص: ۹۵)

② ﴿وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾

(بقراءۃ الجر) (پارہ: ۶، رکوع: ۶، سورۃ مائدہ جلالین ص: ۹۵)

تشریحِ تعارض

قرآن پاک کی متعدد قراءتیں متعدد آیات کے درجے میں ہوتی ہیں، پس جس طرح ایک آیت دوسری آیت کے بظاہر معارض نظر آتی ہے اسی طرح بسا اوقات قرآن کی دو مختلف قراءتوں میں بھی بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔ آیت مذکورہ میں لفظ "ارجلکم" میں دو قراءتیں ہیں، نافع، ابن عامر، کسائی، یعقوب، اور حفص کی قراءت میں "ارجلَکُمْ" بنصب اللام ہے اور ابن کثیر، ابو عمرو، عاصم، حمزہ اور ابو بکر کی قراءت میں "ارجلِکم" بجر اللام ہے، پہلی صورت میں ارجلکم کا عطف وجوھکم پر ہے اور مطلب یہ ہے کہ واغسلوا ارجلکم الی الکعبین کہ پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھوؤ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وضو میں پاؤں کا حکم غسل ہے اور جر والی قراءت میں ارجلِکُمْ کا عطف رؤسکم پر ہوگا یعنی وامسحوا برؤسکم و امسحوا بارجلکم اپنے سروں کا اور اپنے پاؤں کا مسح

مگر دوسری قراءت سے معلوم ہوتا ہے کہ وضوء میں پاؤں پر مسح کیا جائے گا، چنانچہ دونوں قراءتوں میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ قراءت ثانیہ جر جوار پر محمول ہے، یعنی برؤسکم کے مجاور اور متصل ہونے کی وجہ سے ارجلکم کو مجرور پڑھ دیا گیا ہے ورنہ در حقیقت یہ منصوب ہے، رؤسکم کے تناسب کی رعایت کرتے ہوئے نصب ظاہر نہیں کیا گیا ہے اور جب در حقیقت یہ منصوب ہی ہے تو کوئی تعارض نہیں رہا، دونوں قراءتوں سے غسل رجلین ہی کا ثبوت ہو رہا ہے مگر یہ توجیہ بعید ہے اس لئے کہ جر جوار ضرورت شعری کی وجہ سے اختیار کیا جاتا ہے اور قرآن کریم ضرورت شعری سے منزہ ہے، نیز جر جوار صفت میں مستعمل ہے نہ کہ عطف میں اور ارجلکم معطوف ہے نہ کہ صفت۔ (جمل، صاوی، روح المعانی)

❷ اختلاف احوال پر محمول ہے، نصب والی قراءت حالت غیر تخفف پر محمول ہے اور جر والی قراءت حالت تخفف پر محمول ہے، یعنی اگر آدمی موزے پہنے ہوئے ہو تو پاؤں پر یعنی خفین پر مسح کرے ورنہ پاؤں کا غسل واجب ہے، ولا تعارض عند اختلاف الاحوال۔ (روح المعانی وغیرہ)

❸ قراءت جریہ قراءت اولیٰ سے منسوخ ہے، ابتدا میں مسح رجلین کا حکم تھا، پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا اور غسل رجلین کا حکم دے دیا گیا، ولا تعارض بعد النسخ۔

(جمل، روح المعانی)

اہلِ کتاب کے نزاعات کا فیصلہ کرنا واجب ہے یا نہ کرنے کا بھی اختیار ہے؟

پارہ ۶ مائدہ

آیات

① ﴿فَإِنْ جَآءُوكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ﴾

(پارہ ۶، رکوع ۱۰، سورۂ مائدہ، جلالین ص ۱۰۰) ✦

② ﴿فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ﴾

(پارہ ۶، رکوع ۱۱، سورۂ مائدہ، جلالین ص ۱۰۱)

③ ﴿وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ﴾

(پارہ ۶، رکوع ۱۱، سورۂ مائدہ، جلالین ص ۱۰۱)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ا میں ارشاد ہے کہ اگر اہلِ کتاب آپ کے پاس اپنے نزاعات کا فیصلہ کرانے کے لئے آئیں تو آپ کو اختیار ہے خواہ ان کے درمیان فیصلہ فرمادیں یا ان سے اعراض کریں کہ وہ اپنے دینی حکام سے فیصلہ کرالیں۔ اور اخیر کی دو آیتوں میں ارشاد ہے کہ آپ اللہ کے نازل شدہ قانون کے مطابق فیصلہ کریں، ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔ پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ فیصلہ کرنے اور نہ کرنے کا اختیار ہے اور اخیر کی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا فیصلہ کرنا واجب ہے، اعراض کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ اخیر کی دونوں آیتوں سے منسوخ ہے۔ ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا گیا تھا کہ فیصلہ کریں یا نہ کریں، بعد میں یہ حکم منسوخ فرما کر فیصلہ کرنا واجب کر دیا گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اکثر سلف (عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ، عطا رحمۃ اللہ علیہ، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم) سے یہی مروی ہے۔ امام ابوجعفر نحاس رحمۃ اللہ علیہ اور قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب بھی یہی نقل کیا ہے کہ اہل کتاب اور اہل ذمہ کے تنازعات کا اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ کرنا واجب ہے، اعراض کرنا اور ان کو خود ان کے حکام کے حوالہ کر دینا جائز نہیں، یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول اصح ہے۔
ولا تعارض بعد النسخ۔ (بیان القرآن، روح المعانی، جلالین وحاشیہ)

❷ آیت اولیٰ منسوخ نہیں بلکہ محکم ہے اور اب بھی یہ حکم ہے کہ اہل کتاب واہل ذمہ کا فیصلہ کرنے اور نہ کرنے کا حاکم کو اختیار ہے۔ امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ، امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ، ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ، سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہی مذہب ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کے قائل ہیں، ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو صحیح کہا ہے۔ صاحب تفسیر مظہری نے حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہی نقل کیا ہے۔

رہی اخیر کی دونوں آیتیں تو وہ اس کے معارض نہیں ہیں اس لئے کہ فاحکم بینهم بما انزل اللہ کا مطلب یہ ہے کہ ان اخترت الحکم فاحکم بینهم بما انزل اللہ کہ آپ پر فیصلہ کرنا واجب تو نہیں ہے لیکن اگر فیصلہ کرنا چاہیں تو اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ کریں، ان کی خواہشات کی پیروی نہ

کر لیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے الفوز الکبیر میں اسی کو اختیار کیا ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ پہلی آیت میں آگے ارشاد ہے وان حکمت فاحکم بینہم بالقسط "کہ اگرچہ آپ کو اعراض کرنے کا بھی اختیار ہے لیکن اگر آپ فیصلہ کرنا چاہیں تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کریں۔ پس اخیر کی آیتوں میں بھی فیصلہ کو واجب نہیں کیا گیا بلکہ قانون اسلامی کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (تفسیر مظہری، وحاشیہ جلالین، والفوز الکبیر)

۲ اختلاف اشخاص پر محمول ہے، یعنی آیت اولیٰ غیر ذمیوں کے بارے میں ہے کہ ان کے فیصلہ کرنے، نہ کرنے کا اختیار ہے اور اخیر کی دونوں آیتیں ذمیوں سے متعلق ہیں کہ ان کا فیصلہ کرنا واجب ہے، اہل ذمہ پر بیوع، مواریث اور تمام عقود میں اسلامی احکام جاری ہوتے ہیں علاوہ خمر وخنزیر کی بیع کے کہ وہ ان میں اپنی شریعت کے مطابق فیصلہ کر سکتے ہیں۔ (روح المعانی)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر واجب ہے یا صرف اپنی اصلاح کر لینا کافی ہے؟

پارہ نمبر: ۷، ۹

آیات

① ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ (پارہ: ۷، رکوع: ۴ سورۃ المائدہ جلالین ص: ۱۰۸)

② ﴿وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً﴾

(پارہ: ۹، رکوع: ۱۷ سورۃ انفال جلالین ص: ۱۴۹)

تشریح تعارض

پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ اے ایمان والو! تم پر اپنی اصلاح کرنا واجب ہے جب تم راہ راست پر آجاؤ گے تو دوسرے گمراہ لوگوں کی گمراہی اور غلط راہ روی سے تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن پر اپنی اصلاح واجب ہے دوسروں کی اصلاح اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب نہیں آدمی اگر خود راہ راست پر ہو تو گمراہوں کی گمراہی اور گناہ گاروں کی بے راہ روی سے اس کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ اس عذاب سے ڈرو جو خاص کر ظالموں اور گناہ گاروں ہی کو نہیں پہنچے گا بلکہ ان نیک لوگوں کو بھی وہ عذاب گھیر لے گا جو گناہ گاروں کو گناہ سے نہیں روکتے ان کو وعظ و نصیحت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہیں کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اصلاح کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی واجب ہے۔ دوسروں کی اصلاح کرنا ان پر روک ٹوک کرنا ضروری

ہے کہ جو عذاب گناہ گاروں پر نازل ہوگا اس کی زد میں وہ نیک لوگ بھی آجائیں گے جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہیں کیا کرتے، یعنی دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

1 آیت اولیٰ میں اِذَا اهْتَدَيْتُمْ میں اهتداء سے مراد امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے، حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ سے اهتداء کی تفسیر یہی منقول ہے، ہدایت کی تکمیل ہی اس وقت ہوتی ہے جب آدمی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے، اس تفسیر پر آیت اولیٰ سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ترک کی اجازت پر دلالت نہیں ہوتی کیونکہ مطلب آیت کا اس وقت یہ ہوگا کہ جب تم لوگ اپنی اصلاح کرلو اور دوسروں کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے رہو تو کسی کی گمراہی اور گناہ گاری سے تم کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ معلوم ہوا کہ اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور دوسروں کی اصلاح بھی واجب ہے، یعنی یہ آیت دوسری آیت کے معارض نہیں ہے، اس کی تائید حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خطبے سے ہوتی ہے۔

عن قيس بن ابي حازم رحمة الله عليه قال: صعد ابوبكر رضي الله عنه منبر رسول الله صلى الله عليه وسلم، فحمد الله واثنى عليه، ثم قال: ايها الناس، انكم لتتلون آية من كتاب الله سبحانه وتعدونها رخصة، والله ما انزل الله تعالى في كتابه اشد منها يا ايها الذين آمنوا عليكم انفسكم الآية والله لتامرن بالمعروف،

ولتنهون عن المنكر او ليعمنكم الله تعالىٰ منه بعقاب. (اخرجه ابن جرير، درمنثور ۲/۳۵۹)

ترجمہ: ”حضرت قیس بن ابی حازم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر چڑھ کر خطبہ دیا، اللہ کی حمد وثنا بیان کی، پھر ارشاد فرمایا اے لوگو! تم کتاب اللہ کی یہ آیت ”یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ“ تلاوت کرتے ہو اور اس کو ترکِ امر بالمعروف والنہی عن المنکر کی رخصت واجازت پر محمول کرتے ہو، خدا کی قسم! اللہ نے اپنی کتاب میں اس سے زیادہ سخت آیت نازل نہیں فرمائی۔ اللہ کی قسم! تم ضرور بالضرور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے رہو ورنہ اللہ کی طرف سے آنے والا عذاب تم کو بھی عام ہوجائے گا۔“

ایک اور روایت میں ہے:

☆ عن قيس بن ابي حازم رضي الله تعالىٰ عنه عن ابي بكر رضي الله عنه انه قال: يا ايها الناس، انكم تقرؤون هذه الاية، ولا تضعونها موضعها، ولا تدرون ما هي واني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ان الناس اذا رأوا ظالمًا، فلم ياخذوا على يديه اوشك ان يعمهم الله بعقاب منه. ☆ (اخرجه الترمذي وابوداؤد، تفسير قرطبي ۶/۳۴۴)

ترجمہ: ”حضرت قیس بن حازم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا اے لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو اور اس کو اس کے صحیح محل پر نہیں رکھتے اور اس کا مطلب نہیں جانتے حالانکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم

علیہ وسلم فرماتے تھے کہ لوگ جب کسی ظالم کو دیکھیں اور اس کی
اس وقت گرفت نہ کریں تو اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا عذاب سب پر عام
کردیں گے۔

ابوبکر بن محمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے

﴿خطب ابوبکر الصدیق رضی اللّٰہ عنہ، فکان فی خطبتہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یا ایہا الناس لا تتکلوا علی ھذہ الآیۃ یا ایہا الناس اٰمنوا علیکم انفسکم الخ ان الداعر لیکون فی الحی فلا یمنعونہ فیعمھم اللّٰہ تعالٰی بعقاب.﴾ (اخرجہ ابن مردویہ۔ روح المعانی ج ۷ ص ۴۳)

ترجمہ: "حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا، آپ کے خطبہ میں یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! اس آیت پر بھروسہ کرکے نہ بیٹھ جانا، قبیلہ میں ایک آدمی اگر شریر و خبیث ہو اور لوگ اس کو نہ روکیں تو اللہ اپنا عذاب سب پر عام کردیتے ہیں۔"

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوکر سامنے آگئی کہ دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں، دونوں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب اور اس کے ترک پر عذاب و ضرر کا لاحق ہونا ثابت ہورہا ہے۔

❷ آیت اول سے اگرچہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا عدم وجوب اور ترک کی اجازت و رخصت معلوم ہوتی ہے مگر یہ اس زمانہ میں ہے جب کہ فسق و فجور کا اتنا غلبہ ہوجائے کہ کوئی شخص وعظ و نصیحت قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو، آدمی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتا ہے مگر نہ فسق کی وجہ سے کوئی باز نہیں آتا اور کسی پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایسے حالات میں آدمی فقط اپنی اصلاح کرتا رہے اور راہ راستہ پر قائم رہتے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر چھوڑ دے اس کو کوئی عذاب و ضرر لاحق نہیں ہوگا۔ حضرت عبد

اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔

﴿عن الحسن ان ابن مسعود رضی اللّٰہ عنہ سالہ رجل عن هذه الآیة، فقال: ایها الناس انه لیس بزمانها، ولکنه قد اوشک ان یأتی زمان تأمرون بالمعروف فیُصنع بکم کذا وکذا، اوقال: فلا یقبل منکم، فحینئذٍ علیکم انفسکم لایضرکم من ضل اذا اهتدیتم۔﴾

(اخرجہ عبد الرزاق وابن الشیخ والطبرانی وغیرہم، روح المعانی ۷/۴۲)

ترجمہ: "حضرت حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے اس آیت کے متعلق سوال کیا، تو فرمایا: اے لوگو! یہ حکم اس آیت کے زمانہ (نزول) میں نہیں ہے لیکن عنقریب ایسا زمانہ آئے گا کہ تم لوگ امر بالمعروف (ونہی عن المنکر) کروگے تو اس کے جواب میں تمہارے ساتھ ایسا ویسا معاملہ کیا جائے گا (یعنی لوگ تمہارے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئیں گے) یا یوں فرمایا کہ تمہاری بات کوئی قبول نہیں کرے گا، اس وقت تم لوگوں پر اپنی اصلاح واجب ہے، تم راہِ راست پر رہے تو تم کو کوئی ضرر لاحق نہیں ہوگا۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے کہا کہ اگر اس زمانہ میں آپ بیٹھے رہیں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر نہ کریں تو کیا حرج ہے، اللہ نے تو رخصت دی ہے "علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل الخ" تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

﴿لیست لی ولاصحابی، لان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: الا فلیبلغ الشاهد الغائب، فکنا نحن الشهود، وانتم الغیب، ولکن هذه الآیة لاقوام یجیئون من بعدنا ان

وصیت کرنے میں گواہوں کا مسلمان ہونا ضروری ہے یا کافر بھی گواہ بن سکتا ہے؟

پارہ نمبر ۷ و ۲۸

آیات

(۱) ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِیْنَ الْوَصِیَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِكُمْ﴾

(پارہ نمبر ۷، سورۃ مائدہ، ترجمہ بیان القرآن ص ۱۰۶)

(۲) ﴿وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ (پ ۲۸، رکوع ۱۷، سورۃ طلاق، بیان القرآن ص ۳۶۳)

تشریح تعارض

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان مرتے وقت کسی کو اپنا مال وغیرہ حوالہ کرے تو وہ عادل مخصوص لوگوں کو گواہ بنانا مناسب و بہتر ہے مگر ان گواہوں کا مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے، اگر مسلمان نہ ملیں جیسے سفر وغیرہ میں اتفاق ہو جاتا ہے تو غیر مسلموں کو بھی گواہ بنایا جا سکتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے "ذوا عدل منکم او آخران من غیرکم" فرمایا ہے کہ دو دو عادل آدمی تم میں سے ہوں (یعنی مسلمانوں میں سے) یا تمہارے علاوہ (غیر مسلموں) میں سے ہوں۔ اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ گواہوں کا مسلمان ہونا ضروری ہے، پس دونوں میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ پہلی آیت دوسری آیت سے منسوخ ہے، ابتداء میں جب کہ مسلمان کی قلت تھی خصوصاً سفر کی حالت میں غیر مسلموں کو گواہ بنانے کی اجازت دیدی گئی تھی، پھر اس کو منسوخ کر دیا گیا اور گواہوں کا مسلمان ہونا ضروری قرار دیا گیا۔

(تفسیر ماجدی، ماخوذ الخ)

❷ پہلی آیت میں منکم اور من غیرکم سے مراد من اقاربکم اور من غیر اقاربکم ہے، حضرت حسن، حضرت عکرمہ اور امام زہری رحمہم اللہ تعالیٰ سے یہی تفسیر منقول ہے، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی الفوز الکبیر میں ایک توجیہ یہی ذکر فرمائی ہے، مطلب یہ ہے کہ گواہوں کا مسلمان ہونا تو ضروری ہے اور اپنے اقارب اور رشتہ داروں میں سے ہونا ضروری نہیں، اپنے اقارب نہ ہوں تو غیر اقارب کو گواہ بنایا جاسکے گا، پس پہلی آیت آیت ثانیہ سے منسوخ نہیں ہوئی۔

(روح المعانی، الفوز الکبیر)

حق تعالیٰ کفار کے مولیٰ ہیں یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۷، ۱۱، ۲۶

آیات

(۱) ﴿ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ﴾ (پارہ: ۷، رکوع: ۱۳، سورۂ انعام، جلالین ص: ۱۱۷)

(۲) ﴿وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ﴾

(پارہ: ۱۱، رکوع: ۸، سورۂ یونس، جلالین ص: ۱۷۳) ✦

(۳) ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ﴾

(پارہ: ۲۶، رکوع: ۵، سورۂ محمد (قتال) جلالین ص: ۴۲۰)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت میں "ردوا" کی ضمیر فاعل مطلق مخلوق کی طرف راجع ہے، جس میں مومنین و کفار سب داخل ہیں، ترجمہ یہ ہے کہ پھر ساری مخلوق کو لوٹایا جائے گا اللہ کی طرف جو ان کا مولائے حق ہے۔ اور دوسری آیت کفار کے متعلق ہے جیسا کہ آیت کے سیاق "وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ" سے معلوم ہوتا ہے، ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ مومنین و کفار سب کے مولیٰ اور مددگار ہیں، اور تیسری آیت میں ارشاد فرمایا کہ خداوند قدوس صرف مومنین کے مولیٰ و مددگار ہیں، کفار کا کوئی مولیٰ و مددگار نہیں، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

پہلی دو آیتوں میں مولیٰ بمعنی مالک و خالق ہے اور تیسری آیت میں مولیٰ بمعنی ناصر و مددگار ہے، خداوند قدوس مالک و خالق تو مومنین و کفار سب کے ہیں مگر ناصر و مددگار صرف مومنین کے ہیں، کفار کے نہیں۔ (جمل)

تبلیغ رسالت پر اجرت کے مطالبہ سے منع کیا گیا ہے یا اجازت دی گئی ہے؟

پارہ نمبر: ۷، ۱۹، ۲۲، ۲۳، ۲۵، ۲۷

① ﴿قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ﴾

(پارہ ۷، رکوع ۱۷، سورۃ انعام، جلالین ص ۱۲۰)

② ﴿قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَاۗءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا﴾

(پارہ ۱۹، رکوع ۳، سورۃ فرقان، جلالین ص ۳۰۰)

③ ﴿قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ﴾

(پارہ ۲۲، رکوع ۱۲، سورۃ سبا، جلالین ص ۳۶۳)

④ ﴿قُلْ مَآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ﴾

(پارہ ۲۳، رکوع ۱۳، سورۃ ص، جلالین ص ۳۸۵)

⑤ ﴿اَمْ تَسْـَٔــلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ﴾

(پارہ ۲۷، رکوع ۳، سورۃ طور، جلالین ص ۴۳۶)

⑥ ﴿قُلْ لَّآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾

(پارہ ۲۵، رکوع ۴، سورۃ شوریٰ، جلالین ص ۴۰۳)

پہلی چھ آیتوں میں حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ لوگوں میں اعلان کر دیجیے کہ میں تبلیغ رسالت اور دعوت ایمان پر تم سے کسی قسم کی

اجرت اور معاوضہ کا سوال نہیں کرتا، اس کا اجر اور معاوضہ تو مجھے حق تعالیٰ عطا فرمائیں گے۔ اور آیت نمبر ۵ میں ارشاد ہے کہ کیا آپ ان سے اجرت کا سوال کرتے ہیں جس سے کہ ان لوگوں پر تاوان کا بوجھ پڑ رہا ہے؟ یہ استفہام انکاری ہے، مطلب یہ ہے کہ آپ ان لوگوں سے کسی قسم کی اجرت کا سوال نہیں کرتے ہیں، ان پانچوں آیات میں تبلیغ رسالت پر ہر قسم کے اجرت کے مطالبہ کی نفی کی گئی ہے کیونکہ اجرًا نکرہ تحت النفی داخل ہے جو مفید عموم ہوتا ہے، یعنی کسی بھی قسم کی اجرت کا مطالبہ نہیں ہے اور آیت نمبر ۶ میں ہے کہ آپ کہہ دیجئے میں تم سے کسی اجرت کا سوال نہیں کرتا مگر مودة فی القربیٰ کا سوال کرتا ہوں کہ میری قرابت داری کا کچھ لحاظ رکھو۔ اس میں الا المودة فی القربیٰ کا اجرًا سے استثناء کیا گیا ہے اور استثناء میں اصل اتصال ہے جس میں مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ میں داخل ہوتا ہے اور اس کی جنس سے ہوتا ہے، اس سے یہ لازم آتا ہے کہ مودة فی القربیٰ بھی اجرت اور معاوضہ میں داخل ہے اور اس کی جنس سے ہے، آیت کا مطلب یہ ہوا کہ میں تم سے کسی اجرت کا مطالبہ نہیں کرتا سوائے اس اجرت کے کہ تم میری قرابت داری کا لحاظ رکھو، پس اس آیت میں تبلیغ رسالت پر ایک قسم کی اجرت یعنی مودة فی القربیٰ کے مطالبہ اور سوال کا اثبات ہے، لہٰذا یہ آیت پہلی پانچ آیتوں کے بظاہر معارض ہوئی جن میں ہر قسم کی اجرت کے سوال کی بالکلیہ نفی کی گئی ہے، کوئی استثناء نہیں کیا گیا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ الا المودة فی القربیٰ۔ استثناء منقطع ہے جس میں مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ میں داخل اور اس کی جنس سے نہیں ہوتا اور الا، لکن کے معنی میں ہوتا ہے، اس صورت میں مودة فی القربیٰ اجر اور معاوضہ میں داخل ہی نہیں ہے، "قل لا اسئلکم علیہ اجرًا" پر

کلام تام ہو چکا ہے کہ میں تم سے کسی قسم کی اجرت اور معاوضہ کا سوال نہیں کرتا۔ آگے "الا المودۃ فی القربیٰ" سے مستقل دوسرا کلام ہے! جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم میری نبوت و رسالت کو تسلیم نہیں کرتے تو نہ سہی، لیکن میرا ایک انسانی اور خاندانی حق بھی تو ہے جس کا تم انکار نہیں کر سکتے کہ تمہارے اکثر قبائل میں میری رشتہ داری اور قرابتیں ہیں، قرابت کے حقوق صلہ رحمی وغیرہ کا تو کم از کم خیال رکھو، میرے ساتھ ایذا رسانی کا معاملہ نہ کرو، بات کا ماننا نہ ماننا تو خیر تمہارے اختیار میں ہے مگر یہ قرابت داری تو کم از کم عداوت و دشمنی سے مانع ہونی چاہئے۔ بہر حال خلاصہ یہ ہوا کہ مودۃ فی القربیٰ اجر نہیں ہے، بلکہ اس آیت میں بھی مطلق اجر کے سوال کی نفی مقصود ہے، لہٰذا یہ آیت پچھلی پانچ آیتوں کے معارض نہیں ہے۔ (ماخوذ از معارف القرآن وغیرہ)

استثناء متصل ہے اور مودۃ فی القربیٰ اجر میں داخل ہے مگر مودۃ فی القربیٰ کو مجازاً اجر میں داخل مانا گیا ہے، ورنہ در حقیقت یہ اجر و معاوضہ نہیں ہے بلکہ قرابت داری کی وجہ سے محبت رکھنا تو اخلاقی اور انسانی فریضہ ہے، میں تبلیغ و تعلیم کروں یا نہ کروں مودۃ فی القربیٰ کا فریضہ ہر حال میں تم پر عائد ہوتا ہے، تم اگر مودۃ فی القربیٰ کو معاوضہ سمجھتے ہو تو یہ تمہاری غلطی ہے، اس صورت میں یہ کلام تاکید المدح بما یشبہ الذم کے قبیل سے ہے، یعنی کسی کی مدح اور تعریف کو ایسی شے کے ذریعہ مؤکد کرنا جو مذمت اور برائی کے مشابہ ہے یعنی بظاہر اس کو مذمت اور عیب سے تعبیر کیا جا رہا ہے ورنہ حقیقۃً مقصود مذمت نہیں بلکہ مدح و تعریف کو مؤکد اور پختہ کرنا ہے، عربی اور بھی ہر زبان میں اس کا استعمال موجود ہے، جیسے کسی شاعر ایک قوم کی شجاعت و بہادری بیان کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

لَا عَيْبَ فِيْهِمْ غَيْرَ أَنَّ سُيُوْفَهُمْ
بِهِنَّ فُلُوْلٌ مِنْ قِرَاعِ الْكَتَائِبِ

ترجمہ: "کہ ان لوگوں میں کوئی عیب اور برائی نہیں ہے سوائے اس عیب

کیونکہ دشمنوں کے لشکروں میں تلواریں زیادہ چلانے کی وجہ سے ان کی تلواروں میں دندانے پڑ گئے ہیں، تلواروں کی دھاریں خراب ہوگئی ہیں۔"

اور ظاہر ہے کہ کثرت حرب و ضرب کی وجہ سے تلواروں کی دھاریں خراب ہو جانا درحقیقت بہادروں کے لئے کوئی عیب نہیں بلکہ ہنر اور کمال کی بات ہے مگر اس کو بظاہر عیب کہہ دیا گیا ہے، اس سے مدح و تعریف میں تاکید پیدا ہوگئی ہے۔

ہماری اردو زبان کے محاورہ میں بھی اس کا استعمال پایا جاتا ہے جیسے کسی شریر طالب علم کو استاد نے بار بار اس کی شرارت پر ٹوکا، اس کو وعظ و نصیحت کی، سمجھایا مگر وہ بجائے ماننے کے متنفر ہو کر مدرسہ سے بھاگ گیا، استاد صاحب سے معلوم کیا گیا کہ آخر آپ نے اس کو کیا کہہ دیا تھا جس سے وہ فرار ہو گیا؟ تو استاد صاحب نے جواب دیا کہ میں نے اس لڑکے کی شان میں اور کوئی غلطی و گستاخی نہیں کی سوائے اس غلطی کے کہ میں نے اس کی شرارتوں پر اس کو تنبیہ کر دی تھی، اس کو سمجھا دیا تھا، اب تم اس کو غلطی و گستاخی سمجھو یا محبت و ہمدردی۔ ظاہر ہے کہ طالب علم کو اس کی شرارتوں اور غلط حرکتوں پر روک ٹوک کرنا، اس کو سمجھانا یہ کوئی غلطی اور ظلم نہیں ہے بلکہ عین محبت و شفقت ہے مگر اس کو مجازاً غلطی سے تعبیر کر دیا گیا، اردو شعر کا ایک مصرعہ ہے ؎

مجھ میں ایک عیب بڑا ہے کہ وفادار ہوں میں

اس میں شاعر نے وفاداری کو عیب سے تعبیر کیا ہے، ورنہ درحقیقت وفاداری عیب نہیں بلکہ خوبی کی بات ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ اس صورت میں مودۃ فی القربیٰ حقیقۃً اجرت و معاوضہ نہیں ہے، پس اس آیت میں بھی مطلق اجر کی نفی ہے، لہٰذا یہ آیت پہلی پانچ آیت سے معارض نہیں ہے۔ (تفسیر خازن، مدارک، معارف القرآن وغیرہ)

(۳) حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ اور حسین بن فضل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے، دراصل یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی تھی جب کہ مشرکین مکہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچاتے تھے تو حق تعالیٰ نے یہ آیت "قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى" نازل فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت اور صلہ رحمی کا حکم دیا تھا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے اور حضرات انصار نے محبت ونصرت کا معاملہ کیا تو حق تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء سابقین کے ساتھ لاحق کرنا چاہا کہ جس طرح حضرت انبیاء سابقین علیہم السلام نے تبلیغ ورسالت پر کسی قسم کی اجرت کا مطالبہ نہیں کیا، نہ ان کا اور نہ مودۃ فی القربیٰ کا، اسی طرح آپ کو حکم دیا گیا اور آیت نازل فرمائی "قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ."

اس آیت نے الا المودۃ فی القربیٰ والی آیت کو منسوخ کر دیا، ولا تعارض بعد النسخ مگر یہ توجیہ غیر پسندیدہ ہے، اس لئے کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وران کے اقارب کے ساتھ محبت والفت کا معاملہ کرنا اور ایذا رسانی سے باز آنے کا حکم ابتداء میں تھا، بعد میں منسوخ ہو گیا، حالانکہ یہ غلط ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے محبت رکھنا تو فرائض دین میں سے ہے، ایمان کا جزو لازم ہے، اس لئے نسخ کی توجیہ کرنا درست نہیں ہے۔ (تفسیر خازن)

حق تعالیٰ کی رؤیت ہوگی یا نہیں؟

پارۂ نمبر: ۷، ۲۹، ۳۰

آیات

(۱) ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾

(پارہ: ۷ رکوع: ۱۹ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۲۲)

(۲) ﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾

(پارہ: ۲۹ رکوع: ۱۷ سورۂ قیامۃ جلالین ص: ۴۸۲) ✦

(۳) ﴿كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوبُونَ﴾

(پارہ: ۳۰ رکوع: ۸ سورۂ تطفیف جلالین ص: ۴۹۳)

تشریحِ تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ نگاہیں اللہ کا ادراک نہیں کرتی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی رؤیت نہیں ہوگی اور دوسری، تیسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رؤیت ہوگی، چنانچہ دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ بہت سے بارونق چہرے قیامت کے دن اپنے رب کو دیکھیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین کو قیامت کے روز اللہ کا دیدار نصیب ہوگا اور تیسری آیت میں ارشاد ہے کہ قیامت کے دن کفار اپنے رب کے دیدار سے محروم رہیں گے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین دیدار سے محروم نہیں ہوں گے، ان کو حق تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دیدار سے محرومی کفر کی وجہ سے ہوگی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان کی وجہ سے دیدار نصیب ہوگا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر قیامت کے

روز مومنین کو رؤیت نصیب نہ ہوتی تو کفار کو محرومی کے ساتھ عار نہ دلائی جاتی، کفار کو دیدار سے محرومی کی عار دلانا اس بات کی دلیل ہے کہ مومنین کو دیدار نصیب ہوگا۔

(کما فی تفسیر الخازن)

بہر حال ان آیات میں بظاہر تعارض ہے کہ پہلی آیت سے رؤیت باری تعالیٰ کی نفی ہوتی ہے اور آخر کی دونوں آیتوں سے اثبات ہوتا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے چند جواب ہیں:

① نفی دنیا میں ہے اور اثبات آخرت میں ہے، یعنی لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ فِي الدُّنْيَا، دنیا میں آنکھیں اللہ کا ادراک نہیں کرتی ہیں یعنی دنیا میں حق تعالیٰ کی رؤیت نہیں ہوتی ہے، البتہ آخرت میں رؤیت ہوتی، اخیر کی دونوں آیتوں میں یَوْمَئِذٍ کی قید سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اثبات رؤیت آخرت سے متعلق ہے، یہ توجیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے، فرماتے ہیں "لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ فِي الدُّنْيَا وَهُوَ يُرٰى فِي الْاٰخِرَةِ" اثبات و نفی کا محل مختلف ہونے کی وجہ سے کوئی تعارض نہیں رہا۔ (تفسیر خازن)

② آیت اولیٰ میں نفی ادراک کی ہے اور اخیر کی دو آیتوں میں اثبات نظر و رؤیت کا ہے، ادراک اور رؤیت میں فرق ہے، ادراک کہتے ہیں کہ کسی شئے کو اس طور پر دیکھنا کہ اس کی حدود و جوانب کا احاطہ ہوجائے اور معلوم ہوجائے کہ طول اتنا ہے، عرض و عمق کی مقدار اتنی ہے، اور یہ اس کی شکل و صورت ہے۔ اور رؤیت کہتے ہیں کسی شئے کا بغیر احاطہ کے معاینہ اور مشاہدہ کرلینے کو، حق تعالیٰ چونکہ حدود و جوانب، صورت و شکل اور جہات وغیرہ سے منزہ و مقدس ہے اس لئے حق تعالیٰ کا ادراک نہیں ہوگا، البتہ رؤیت ہوجائے گی کیونکہ رؤیت بغیر احاطہ حدود و جوانب کے ہوجاتی ہے۔

جمہور مفسرین رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسی توجیہ کو اختیار کیا ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک تفسیر یہی نقل کی ہے "قَالَ: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ لَا يُحِيْطُ بَصَرُ اَحَدٍ بِالْمَلِكِ تَعَالٰى" پس جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں اور جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

(تفسیر خازن، مدارک، روح المعانی)

❸ قیامت کے دن اللہ کا دیدار اللہ کی اجازت پر موقوف ہوگا، جب تک حق تعالیٰ ادراک کی اجازت نہیں دیں گے اس وقت تک نگاہیں ادراک نہیں کر پائیں گی اور جب اجازت مل جائے گی تو ادراک ہوگا، پس پہلی آیت میں نفی ادراک قبل الاذن پر محمول ہے اور اخیر کی آیتوں میں اثبات ادراک بعد الاذن پر محمول ہے، فلا تعارض۔

(روح المعانی)

❹ حضرت ضرار بن عمرو الکوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آیت اولیٰ میں آنکھوں کے ذریعہ ادراک و رؤیت کی نفی کی گئی ہے کہ آنکھیں ان کا ادراک نہیں کریں گی، ہوسکتا ہے حق تعالیٰ قیامت کے دن حواسِ خمسہ کے علاوہ کوئی حاسہ سادسہ پیدا فرمادیں جس سے اللہ کا دیدار کیا جائے، پس نفی رؤیت بحاسۃ البصر کی ہے اور اثبات رؤیت بحاسۃ غیر البصر کا ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

❺ اختلاف اشخاص پر محمول ہے، آیت اولیٰ کفار سے متعلق ہے کہ کفار کی نگاہوں کو اللہ کی رؤیت نصیب نہیں ہوگی اور دوسری دونوں آیتیں مومنین کے حق میں ہیں کہ ان کی نگاہیں اللہ کا دیدار کریں گی، اس کی تائید تیسری آیت "كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ" سے ہوتی ہے کہ کفار اس دن اپنے رب کے دیدار سے محروم رہیں گے اور اختلاف اشخاص کے بعد کوئی تعارض نہیں رہتا۔

(بحوالہ مستفاد من حاشیہ جلالین رقم الحاشیہ ۲۲ التوفیق و دفع الاختلاف ج۲)

❻ الابصار جمع کا صیغہ ہے جس پر الف لام داخل ہے اور صیغۂ جمع پر الف لام کا

دخول مفید استغراق و عموم ہوتا ہے، پس لاتدرکہ الابصار کا مطلب لاتدرکہ جمیع الابصار ہوگا کہ تمام آنکھیں اللہ کا ادراک نہیں کریں گی اور مجموعہ کا سلب بعض کے لئے ثبوت پر دلالت کرتا ہے جیسے کہا جاتا ہے "اِنَّ زَیْدًا مَا ضَرَبَهٗ کُلُّ النَّاسِ" زید کو سب لوگوں نے نہیں مارا، اس کا مطلب یہ نکلا ہے کہ بعض نے مارا ہے، پس اسی طرح آیت شریفہ میں جب کہا گیا کہ سب آنکھیں اللہ کا ادراک نہیں کریں گی، اس سے یہ ثابت ہوا کہ بعض آنکھیں ادراک کریں گی، پس آیت اولیٰ میں مجموعہ کی نفی ہے اور دوسری دو آیتوں میں بعض کے لئے اثبات ہے، جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

(تفسیر کبیر)

گناہ کی سزا اس کے مثل ملے گی یا زیادہ؟

پارہ نمبر: ٨، ١١، ١٢، ١٩، ٢٤، ٢٥

آیات

(١) ﴿وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَلَا یُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا﴾

(پارہ ٨، رکوع [illegible] سورۃ الانعام، آیت نمبر [illegible])

(٢) ﴿وَالَّذِیْنَ كَسَبُوا السَّیِّاٰتِ جَزَآءُ سَیِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا﴾

(پارہ ١١، [illegible])

(٣) ﴿مَنْ عَمِلَ سَیِّئَةً فَلَا یُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا﴾

(پارہ ٢٤، [illegible])

(٤) ﴿وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ﴾

(پارہ ٢٥، [illegible]) ◆

(٥) ﴿یُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ مَا كَانُوْا یَسْتَطِیْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا یُبْصِرُوْنَ﴾ (پارہ ١٢، [illegible])

(٦) ﴿یُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ (پارہ ١٩، [illegible])

تشریح تعارض

آیت نمبر ١ تا ٤ سے معلوم ہوتا ہے کہ برائی کی سزا اس کے مثل دی جائے گی اور آیت نمبر ٥ و ٦ سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کا عذاب بڑھا کر دیا جائے گا، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

① جرم اور سزا میں مماثلت کمیت کے اعتبار سے ہے اور تضاعف و زیادتی کیفیت کے اعتبار سے ہے اور جب دو متعارض چیزوں کی جہت بدل جائے تو تعارض نہیں رہتا۔ مطلب یہ ہے کہ ایک گناہ کی سزا کمیت اور مقدار کے اعتبار سے برابر ملے گی، ایسا نہیں ہوگا کہ ایک گناہ کو دو گناہ شمار کر کے دوگنی سزا دی جائے، البتہ کیفیت کے اعتبار سے وہ ایک ہی سزا بہت شدید ہوگی۔ (بیان القرآن)

② اختلاف اشخاص پر محمول ہے، مماثلت مومن کے حق میں ہے اور تضاعف کافر کے لئے، مومن کو ایک جرم کی سزا اس کے برابر ملے گی اور کافر کے گناہوں کی سزا کفر کی وجہ سے بڑھا دی جائے گی۔ (روح المعانی و خازن)

یہ پہلی تین آیات اور اخیر کی دونوں آیتوں کے مابین تعارض کے جواب ہیں، رہی چوتھی آیت "وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ الخ" سو یہ تو معارض ہی نہیں ہے اس لئے کہ یہ آخرت کی سزا سے متعلق نہیں بلکہ دنیا میں اگر کوئی کسی کے ساتھ برائی کرے تو اس کو اس کے مثل برائی کر کے انتقام لینے کی اجازت دی گئی ہے جیسا کہ آیت کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے۔

گناہ گار قیامت کے روز صرف اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے گا یا دوسروں کا بھی؟

پارہ نمبر: ۸، ۱۴، ۱۵، ۲۰، ۲۲، ۲۳، ۲۷

آیات

① ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ (پارہ: ۸ رکوع: ۷ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۲۹)

② ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ (پارہ: ۱۵ رکوع: ۲ سورۂ اسراء جلالین ص: ۲۳۱)

③ ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ (پارہ: ۲۲ رکوع: ۱۵ سورۂ فاطر جلالین ص: ۳۶۵)

④ ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ (پارہ: ۲۳ رکوع: ۱۵ سورۂ زمر جلالین ص: ۳۸۶)

⑤ ﴿اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۷ سورۂ نجم جلالین ص: ۴۳۹)

⑥ ﴿لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (پارہ: ۱۴ رکوع: ۹ سورۂ نحل جلالین ص: ۲۱۷)

⑦ ﴿وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ﴾

(پارہ: ۲۰ رکوع: ۱۳ سورۂ عنکبوت جلالین ص: ۳۳۶)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ گار صرف اپنے گناہ کا بوجھ اٹھائے گا، دوسرے کے گناہوں کا نہیں، اور اخیر کی دو آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ گار لوگ اپنے گناہوں کے ساتھ دوسروں کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ پہلی پانچ آیات اس شخص کے بارے میں ہیں جو خود گناہ کرتا ہے مگر دوسروں کو گناہوں پر نہیں ابھارتا، ایسے لوگ صرف اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائیں گے اور اخیر کی دو آیتیں ان لوگوں کے حق میں ہیں جو خود بھی گمراہ ہوں اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں، ایسے لوگ اپنی گمراہی کے بوجھ کے ساتھ ساتھ دوسروں کو گمراہ کرنے کا بوجھ بھی اٹھائیں گے۔

اضلالِ غیر چونکہ خود اس کا فعل ہے اور گناہ ہے تو اس کا بوجھ بھی خود اس کو اٹھانا پڑے گا اور یہ اپنے ہی گناہ کا بوجھ ہوا دوسرے کے گناہ کا نہیں، دوسرا آدمی جو اس کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہوا وہ اپنی گمراہی کا بوجھ خود اٹھائے گا، پس پہلی پانچ آیتوں اور اخیر کی دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ (بیان القرآن، صاوی)

قیامت کے دن لوگوں سے سوال کیا جائے گا یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۸، ۱۴، ۲۰، ۲۳، ۲۵، ۲۷

آیات

① ﴿فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ﴾

(پارہ ۸ رکوع ۱ سورۂ اعراف جلالین ص ۱۲۹)

② ﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

(پارہ ۱۴ رکوع ۶ سورۂ حجر جلالین ص ۲۱۵)

③ ﴿تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ﴾ (پارہ ۱۴ رکوع ۱۳ سورۂ نحل جلالین ص ۲۲۰)

④ ﴿وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (پارہ ۱۴ رکوع ۱۹ سورۂ نحل جلالین ص ۲۲۵)

⑤ ﴿وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ﴾ (پارہ ۲۳ رکوع ۶ سورۂ صافات جلالین ص ۳۷۴)

⑥ ﴿سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ﴾

(پارہ ۲۵ رکوع ۸ سورۂ زخرف جلالین ص ۴۰۶)

⑦ ﴿وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ﴾

(پارہ ۲۰ رکوع ۱۱ سورۂ قصص جلالین ص ۳۳۳)

⑧ ﴿فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ﴾

(پارہ ۲۷ رکوع ۱۲ سورۂ رحمٰن جلالین ص ۴۴۴)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں سے ان کے اعمال

وغیرہ کے متعلق سوال کیا جائے گا اور آیت نمبر ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کسی انسان و جن سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے چار جواب ہیں:

❶ سوال دو قسم کا ہوتا ہے:

① سوال استعلام (یعنی کسی نامعلوم شے کو معلوم کرنے کے لئے سوال کرنا)۔

② سوال توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکانے کے طور پر سوال کرنا) پہلی چھ آیتوں میں سوال توبیخ کا اثبات مراد ہے اور اخیر کی دو آیتوں میں سوال استعلام کی نفی ہے، یعنی معلوم کرنے کے لئے کسی سے کوئی سوال نہیں ہوگا اس لئے کہ حق تعالیٰ کو ساری مخلوق کے اعمال و افعال کا علم ہے، معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں البتہ زجر و توبیخ کے طور پر حق تعالیٰ مخلوق سے سوال کریں گے کہ تم نے فلاں گناہ کیوں کیا فلاں نیکی کیوں نہیں کی وغیرہ وغیرہ۔ (بیضاوی وغیرہ)

نیز پہلی آیت میں جو "ولنسئلن المرسلین" فرمایا گیا ہے کہ ہم رسولوں سے بھی سوال کریں گے، وہ سوال یہ ہوگا کہ جب تم نے اپنی قوم کو دعوت ایمان دی تو تمہاری قوم نے کیا جواب دیا؟ تمہارا کہنا مانا یا نہیں اور اس سوال سے مقصود رسولوں کو توبیخ کرنا نہیں ہوگا بلکہ ان کی امتوں کے کفار کو زجر و توبیخ کرنا مقصود ہوگا۔

(روح المعانی)

❷ اختلاف اوقات پر محمول ہے، قیامت کا دن بہت طویل ہوگا، ایک وقت ایسا ہوگا کہ کسی سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا، پھر دوسرے وقت میں سوالات شروع ہو جائیں گے، پس کوئی تعارض نہیں ہے۔ (جلالین شریف)

۳ اختلاف مکان پر محمول ہے، یعنی میدان حشر میں ایک موقف میں تو کسی سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا، جب دوسرے موقف یعنی موقف حساب میں پہنچیں گے وہاں سوال کیا جائے گا، حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہی توجیہ فرمائی ہے۔ (روح المعانی)

۴ اخیر کی دونوں آیتوں سے سوال عن الاعمال کی نفی مراد ہے اور جن آیات میں سوال کا ذکر ہے وہاں سوال عن الدواعی والموانع مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اعمال کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا بلکہ دواعی الی الاعمال السیئة اور موانع عن الاعمال الحسنة کے متعلق سوال ہوگا کہ کونسا داعیہ پیدا ہوا تھا جو تم نے فلاں گناہ کیا، اور کونسا مانع پیش آگیا تھا جو تم نے فلاں عمل صالح نہیں کیا، پس کوئی تعارض نہیں کیونکہ جس سوال کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں، جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر)

❶ آخری دو آیتوں میں دعا سے مراد بتوں سے دعا کرنا ہے، کہ کافر اگر خدا سے دعا کرے تو قبول ہو جاتی ہے اور اگر بتوں سے دعا کرے تو ضائع اور باطل ہے اس کا کوئی نفع نہیں۔ (روح المعانی)

❷ پہلی آیت میں امورِ دنیا سے متعلق دعا کرنا اور آخری دو آیتوں میں امورِ آخرت سے متعلق دعا کرنا مراد ہے یعنی کافر اگر دنیا سے متعلق دعا کرے تو وہ قبول ہو جاتی ہے جیسے کہ ابلیس کی دعا حیاتِ دنیوی سے متعلق تھی اس لئے قبول ہو گئی اور اگر امورِ آخرت سے متعلق مثلاً مغفرت یا رفعِ عذاب و تخفیفِ عذاب کی دعا کرتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتی جیسا کہ آیتِ ثالثہ کے سیاق "یُخَفِّفْ عَنَّا یَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ" سے معلوم ہوتا ہے۔ (روح المعانی وغیرہ)

❸ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ کہنا قبولیتِ دعا نہیں ہے بلکہ یہ تو ابلیس کی تقدیر اور قضا کا بیان ہے، یعنی ہم نے تیری تقدیر میں قیامت تک زندگی پہلے ہی سے لکھ دی ہے، اگر تو دعا بھی نہ کرتا تب بھی قیامت تک زندہ رہتا۔ انک من المنظرین جملہ اسمیہ لانا پھر اس کو اِنَّ کے ساتھ مؤکد کرنا اسی پر دال ہے، اگر یہ جواب قبولیتِ دعا کے طور پر ہوتا تو "قد انظرتک" جملہ فعلیہ کے ساتھ ہونا چاہئے تھا کہ میں نے تجھ کو مہلت دیدی ہے، تیری دعا قبول کر لی گئی ہے، بجائے اس کے "انک من المنظرین" ارشاد فرمایا، مطلب یہ ہے کہ تو تو منظرین میں سے ہے ہی، معلوم ہوا کہ قبولیتِ دعا نہیں ہے پس یہ آیت آخری دونوں آیتوں کے معارض نہیں ہے۔

(روح المعانی، ہامش، شرح مختصر)

سماوات و ارض کی تخلیق چھ دن میں ہوئی یا آٹھ دن میں؟

پارہ نمبر: ۸، ۱۱، ۱۲، ۱۹، ۲۱، ۲۴، ۲۶، ۲۷

آیات

(۱) ﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ﴾

(پارہ ۸، رکوع ۱۴، سورۃ الاعراف، آیت نمبر ۵۴)

(۲) ﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ﴾

(پارہ ۱۱، رکوع ۶، سورۃ یونس، آیت نمبر ۳)

(۳) ﴿وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ﴾

(پارہ ۱۲، رکوع ۱، سورۃ ہود، آیت نمبر ۷)

(۴) ﴿الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ﴾

(پارہ ۱۹، رکوع ۳، سورۃ الفرقان، آیت نمبر ۵۹)

(۵) ﴿اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ﴾ (پارہ ۲۱، رکوع ۱۴، سورۃ السجدۃ، آیت نمبر ۴)

(۶) ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِن لُّغُوبٍ﴾ (پارہ ۲۶، رکوع ۱۷، سورۃ ق، آیت نمبر ۳۸)

(۷) ﴿وَالَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ﴾

(پارہ ۲۷، رکوع ۱۷، سورۃ الحدید، آیت نمبر ۴)

(۸) ﴿قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ ۔۔۔ إِلَىٰ أَنْ قَالَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ ۔۔۔ إِلَىٰ أَنْ قَالَ فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ﴾

(پارہ ۲۴، رکوع ۱۶، سورۃ حم السجدۃ (فصلت)، آیت نمبر ۹ تا ۱۲)

شرحِ تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۷ سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں، زمینوں اور مابینہما کی تخلیق چھ دن میں فرمائی اور آیت نمبر ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ دن میں پیدا کیا، چنانچہ آیت نمبر ۸ میں ارشاد ہے کہ دو دن میں زمین کو پیدا کیا اور چار دن میں پہاڑوں اور کھانے پینے کی چیزوں کو پیدا کیا، اس کے بعد دو دن میں سات آسمان بنائے، کل مجموعہ آٹھ دن ہو جاتا ہے، پس یہ آیت پہلی سات آیتوں کے بظاہر معارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

۱ آیت نمبر ۸ میں في اربعة ايام میں تمام مضاف محذوف ہے، اي في تتمة اربعة ايام جیسا کہ علامہ زجاج نے اس کی تصریح کی ہے۔ یعنی زمین اور پہاڑوں وغیرہ کی پیدائش پورے چار دن میں ہوئی اس طور پر کہ دو دن میں زمین اور دو دن میں پہاڑ وغیرہ پیدا کئے، کل چار دن ہوگئے، اس کو حق تعالیٰ نے یوں فرما دیا کہ دو دن میں زمین اور چار دن میں جبال واقوات کو پیدا کیا، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ محاورات میں بولا جاتا ہے "سرت من البصرة الى بغداد في عشرة و الكوفة في خمس عشرة" کہ میں بصرہ سے دس دن میں بغداد پہنچا اور پندرہ دن میں کوفہ پہنچا، اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ پندرہ دن دس دن کے علاوہ ہیں اور کوفہ پہنچنے تک پچیس دن ہو گئے۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ پندرہ دن پہلے دس دن ملا کر ہوئے ہیں کہ دس دن بغداد پہنچنے میں صرف ہوئے اور پانچ دن کوفہ پہنچنے میں، کل ملا کر پندرہ دن ہوگئے۔

(تفسیر مدارک)

یا جیسا کہ یوں کہا جاتا ہے کہ دو سالوں میں تو میں لڑکے کا دودھ چھڑایا اور چار

سال میں مکتب میں بٹھا دیا۔ ظاہر ہے کہ مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ان دو سالوں کے علاوہ چار سال مراد ہیں جس سے کل چھ سال ہو جائیں۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ دودھ چھڑانے کے دو سال بعد جب لڑکا چار سال کا ہو گیا تو مکتب میں بٹھا دیا۔ یہاں یہ چار سال پہلے دو سال کو ملا کر مراد ہوتے ہیں، اسی طرح آیت شریفہ میں اربعة ایام تخلیق ارض کے دو دنوں کو ملا کر مراد ہیں۔ (تفسیر بیان القرآن)

❷ علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ نے توجیہ بیان کی ہے کہ "اربعة ایام" جعل مذکور کا ظرف نہیں ہے بلکہ کائن محذوف سے متعلق ہو کر مبتدا مقدر کی خبر واقع ہے، عبارت اس طرح ہے "وکل ذلک من خلق الارض ومابعده کائن فی اربعة ایام" اور یہ درحقیقت تفصیل کا خلاصہ ہے جیسے حساب کرنے کے بعد آخر میں کل میزان لگا دی جاتی ہے، ایسا ہی یہاں پر ہے کہ دو دن میں زمین کو پیدا کیا اور دو دن میں جبال واقوات کو ان سب ایام کی کل میزان اربعة ایام ہو گی، لیکن سوال یہ ہے کہ جب چند اعداد کی میزان نکالی جاتی ہے تو ان سب اعداد کی تصریح کرنا ضروری ہوتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے "سرت من البصرة الی واسط فی یومین، ومن واسط الی الکوفة فی یومین، فذلک اربعة ایام" میں بصرہ سے واسط تک دو دن میں پہنچا اور واسط سے کوفہ تک دو دن میں، یہ کل ملا کر چار دن ہو گئے اور آیت شریفہ میں صرف ارض کے متعلق یومین کی تصریح ہے، جبال واقوات کے متعلق یومین نہیں فرمایا تو آخر میں میزان نکالنا کیسے درست ہو گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ میزان لگانے میں دونوں عددوں کا علم کافی ہوتا ہے، الفاظ میں تصریح ضروری نہیں ہے۔

(تفسیر روح المعانی)

بہرحال ان دونوں توجیہوں کے سامنے آنے کے بعد واضح ہو گیا کہ اس آیت نمبر ۹ میں بھی چھ ایام ہی مراد ہیں، یعنی یہ آیت آیات سابقہ کے معارض نہیں رہی۔

حضرت لوط علیہ الصلاۃ والسلام کی نصیحت پر ان کی قوم نے کیا جواب دیا؟

پارہ نمبر: ۸، ۱۹، ۲۰

آیات

(۱) ﴿وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ﴾

(پارہ: ۸، رکوع: ۱۷، سورۂ اعراف، جلالین ص: ۱۳۶)

(۲) ﴿فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ﴾

(پارہ: ۱۹-۲۰، رکوع: ۱۹، سورۂ نمل، جلالین ص: ۳۲۲)

(۳) ﴿فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ﴾

(پارہ: ۲۰، رکوع: ۱۵، سورۂ عنکبوت، جلالین ص: ۳۳۷)

تشریحِ تعارض

پہلی دو آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو نصیحت کی اور لواطت سے منع کیا تو قوم کا جواب صرف یہ تھا کہ حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی آل کو بستی سے نکال دو، اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا جواب نہیں دیا تھا کیونکہ نفی و استثناء کے ساتھ کلام کرنا مفید حصر ہوتا ہے، یعنی جواب قوم منحصر ہے آلِ لوط کو بستی سے نکالنے میں اور آیت نمبر ۳ میں فرمایا کہ قوم کا جواب صرف یہ تھا کہ اگر آپ سچے ہیں تو ہمارے اوپر اللہ کا عذاب نازل کرا دیجئے، اس کے علاوہ کوئی دوسرا جواب نہیں تھا، پس ان دونوں حصروں میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

(۱) اختلاف زمان پر محمول ہے، حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو بار بار نصیحت و توبیخ فرمائی، پہلی مرتبہ جب نصیحت فرمائی تو قوم نے صرف یہ جواب دیا "ائتنا بعذاب اللّٰہ ان کنت من الصّٰدقین" جو کہ آیت نمبر ۳ میں مذکور ہے، اس کے بعد جب دوبارہ نصیحت و توبیخ کی تو قوم نے صرف یہ جواب دیا، "اَخْرِجُوْھُمْ مِنْ قَرْیَتِکُمْ الخ" امام ابو حیان رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کی اتباع میں علامہ ابوالسعود رحمۃ اللہ علیہ نے یہی توجیہ فرمائی ہے، دلیل اس توجیہ کی یہ ہے کہ جب کسی کو وعظ و نصیحت اور زجر و توبیخ کی جاتی ہے تو پہلے نمبر پر تو وہ تکذیب و استہزاء کرتا ہے اور ان کا قول "ائتنا بعذاب اللّٰہ ان کنت من الصادقین" تکذیب و استہزاء ہی کے قبیل سے ہے، اس کے بعد جب دوبارہ وعظ و توبیخ کی جاتی ہے تو آدمی غصہ ہو کر اور تنگ آ کر انتقام و تعذیب پر آمادہ ہوتا ہے کہ اس ناصح کو بستی سے نکال دینا چاہئے، یا قتل کر دینا چاہئے اور قوم لوط علیہ الصلاۃ والسلام کا یہ قول "اخرجوھم من قریتکم" انتقام و تعذیب ہی کے قبیل سے ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

(۲) اختلاف از مان ہی پر محمول ہے مگر صورت یہ ہے کہ جس وقت حضرت لوط علیہ السلام قوم کو نصیحت کرتے تھے اس وقت تو وہ لوگ ان کو صرف یہ جواب دیتے تھے کہ "ائتنا بعذاب اللّٰہ ان کنت من الصادقین" اور جب آپس میں بیٹھ کر مشورہ کرتے تھے اور ایک دوسرے سے معلوم کرتے تھے کہ ان کا کیا کرنا چاہئے تو آپس میں ان کا جواب صرف یہ ہوتا تھا "اَخْرِجُوْھُمْ مِنْ قَرْیَتِکُمْ اِنَّھُمْ اُنَاسٌ یَّتَطَھَّرُوْنَ" پس پہلی دو آیتیں مشورہ کے وقت پر محمول ہیں اور تیسری آیت حضرت لوط علیہ السلام کے نصیحت کرنے کے وقت پر محمول ہے۔ (روح المعانی)

۳ اختلافِ اشخاص پر محمول ہے، یعنی ان دونوں جوابوں میں سے ایک جواب تو قوم کے امراء اور سرداروں کا ہوتا تھا اور دوسرا جواب عوام الناس دیا کرتے تھے، یا تو کہا جائے کہ امراء اور خواص تو "ائتنا بعذاب اللّٰہ" کہتے تھے اور عوام الناس "اخرجوھم من قریتکم" کہا کرتے تھے، یا اس کے برعکس۔ (روح المعانی)

قومِ ثمود پر کون سا عذاب آیا؟

پارہ نمبر: ۸، ۱۲، ۱۴، ۲۴، ۲۷، ۲۹

آیات

① ﴿فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ﴾

(پارہ ۸، رکوع ۱۷، سورۃ اعراف، جلالین ص ۱۳۶) ✦

② ﴿وَأَخَذَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ﴾

(پارہ ۱۲، رکوع ۶، سورۃ ہود، جلالین ص ۱۸۵)

③ ﴿فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ﴾ (پارہ ۱۴، رکوع ۶، سورۃ حجر، جلالین ص ۲۱۳)

④ ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ﴾

(پارہ ۲۷، رکوع ۹، سورۃ قمر، جلالین ص ۴۴۳)

⑤ ﴿فَأَمَّا ثَمُودُ فَأُهْلِكُوا بِالطَّاغِيَةِ﴾ (پارہ ۲۹، رکوع ۵، سورۃ حاقہ، جلالین ص ۴۷۰) ✦

⑥ ﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ﴾

(پارہ ۲۴، رکوع ۲۰، سورۃ حم سجدہ، جلالین ص ۳۹۷)

⑦ ﴿فَأَخَذَتْهُمْ صَاعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُونِ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾

(پارہ ۲۴، رکوع ۱۶، سورۃ حم سجدہ، جلالین ص ۳۹۸)

⑧ ﴿فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُونَ﴾

(پارہ ۲۷، رکوع ۱، سورۃ ذاریات، جلالین ص ۴۳۴)

ان آیات میں قومِ ثمود پر آنے والے عذاب کو بیان فرمایا ہے مگر عذاب کی

نوعیت کیا تھی؟ اس بارے میں یہ آیات بظاہر متعارض ہیں، آیت نمبر ۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ رجفہ سے ہلاک کیا گیا، جس کے معنی زلزلہ شدیدہ کے آتے ہیں اور آیت نمبر ۲ و۳ و۴ و۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ صیحہ اور طاغیہ سے ہلاک کیا گیا، صیحہ اور طاغیہ کے معنی صوت شدید اور چیخ کے آتے ہیں۔ طاغیۃ طغی یطغو سے ماخوذ ہے بمعنی سرکشی کرنا، حد سے تجاوز کرنا۔ مراد اس سے ایسی آواز جو شدت میں تمام آوازوں سے تجاوز کر جانے والی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے طاغیہ کی تفسیر صیحہ سے منقول ہے اور آیت نمبر ۶ و ۷ و ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ صاعقہ سے ہلاک کیا گیا، صاعقہ کے معنی آسمان سے گرنے والی بجلی کے آتے ہیں، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ قوم ثمود پر جب عذاب آیا تو اولاً حضرت جبرئیل علیہ الصلاۃ والسلام نے آسمان سے ایک چیخ ماری، اس چیخ کی وجہ سے زمین میں زلزلہ پیدا ہوا جس سے یہ لوگ ہلاک ہو گئے، پس ہلاکت کا سبب رجفہ اور رجفہ کا سبب صیحہ ہے، پس کہیں تو سبب قریب یعنی رجفہ کو ذکر کر دیا اور کسی جگہ سبب بعید یعنی صیحہ کو ذکر فرما دیا اور صاعقہ کے معنی لغت میں مطلق عذاب کے بھی آتے ہیں اس لئے بعض آیات میں اس کو صاعقہ سے تعبیر فرما دیا اور چونکہ یہ عذاب حد سے متجاوز تھا اس لئے آیت نمبر ۵ میں اس کو طاغیہ سے تعبیر کر دیا گیا، پس کوئی تعارض نہیں۔

(روح المعانی، صاوی وغیرہ)

حضرت شعیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قوم کون سے عذاب سے ہلاک ہوئی؟

پارہ نمبر: ۹، ۱۲، ۱۹، ۲۰

آیات

(۱) ﴿فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ﴾

(پ ۹، ر ۱، سورۃ الاعراف، جلالین ص ۱۳۴)

(۲) ﴿فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ﴾ (پ ۲۰، ر ۱۶، سورۃ العنکبوت، جلالین ص ۳۳۸)

(۳) ﴿وَأَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ﴾

(پ ۱۲، ر ۸، سورۃ ہود، جلالین ص ۱۸۷)

(۴) ﴿فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ﴾ (پ ۱۹، ر ۱۰، سورۃ الشعراء، جلالین ص ۳۱۳)

تشریحِ تعارض

ان آیات میں حضرت شعیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قوم پر آنے والے عذاب کا ذکر ہے مگر نوعیتِ عذاب میں چاروں آیات بظاہر متعارض ہیں۔ آیت نمبر ۱ اور ۲ میں رجفہ (زلزلہ شدیدہ) کا ذکر ہے۔ آیت نمبر ۳ میں ہے کہ صیحہ (چیخ) سے ہلاک کیا گیا اور آیت نمبر ۴ میں ہے کہ یوم الظلہ کے عذاب نے ان کو پکڑا۔ ظلہ کے معنی سائبان کے آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سائبان کے عذاب سے ہلاک کیا گیا، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس مقام پر بھی وہی توجیہ جاری ہوگی جو اوپر قوم ثمود کے بارے میں ذکر کی گئی

کہ حضرت جبریل علیہ السلام کی چیخ سے زلزلہ پیدا ہوا جس سے یہ لوگ ہلاک ہو گئے، پہلی دو آیتوں میں سبب قریب اور آیت نمبر ۳ میں سبب بعید کی طرف نسبت کر دی گئی۔ رہی چوتھی آیت جس میں عذاب یوم الظلۃ کا ذکر ہے تو یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی دوسری قوم اصحاب الایکہ کے بارے میں ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت شعیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اصحاب الایکہ اور اہل مدین دونوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اہل مدین تو صیحہ اور رجفہ سے ہلاک ہوئے اور اصحاب ایکہ کو ظلہ کے عذاب سے ہلاک کیا۔ ظلہ کے معنی سائے کے ہیں۔ سایہ سے مراد بادل کا سایہ ہے جو آگ بن کر ان پر برس پڑا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ سے روایت ہے کہ اصحاب ایکہ پر اللہ نے شدید گرمی نازل فرمائی جس سے ان کا دم گھٹنے لگا تو وہ گھروں میں داخل ہو گئے، گرمی گھروں کے اندر گھس گئی، وہ وہاں سے نکلے اور بھاگ کر جنگل میں چلے گئے تو اللہ نے ایک بادل بھیجا، جس نے ان پر سایہ کر لیا، ان کو ٹھنڈک اور لذت محسوس ہوئی تو ایک نے دوسرے کو پکارا کہ یہاں آ جاؤ، یہاں راحت ہے، سب لوگ اس بادل کے سائے کے نیچے جمع ہو گئے تو اللہ نے اس بادل کو آگ بنا کر ان پر نازل کر دیا، وہ آگ ان سب کو کھا گئی۔

(اخرجہ عبد بن حمید وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم والحاکم، روح المعانی، مظہری، جمل، صاوی وغیرہ)

حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کا عصا بطورِ معجزہ باریک اور چھوٹا سانپ تھا یا بڑا اژدھا؟

پارہ نمبر: ۹، ۱۶، ۱۹، ۲۰

آیات

(۱) ﴿فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ﴾ (پارہ ۹ رکوع ۳ سورۂ اعراف جلالین ص ۱۳۸)

(۲) ﴿فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ﴾

(پارہ ۱۹ رکوع ۲ سورۂ شعراء جلالین ص ۳۱۰)

(۳) ﴿فَأَلْقَاهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَىٰ﴾ (پارہ ۱۶ رکوع ۱۰ سورۂ طٰہٰ جلالین ص ۲۶۱)

(۴) ﴿فَلَمَّا رَآهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَلَّىٰ مُدْبِرًا﴾

(پارہ ۱۹ رکوع ۱۶ سورۂ نمل جلالین ص ۳۱۷)

(۵) ﴿فَلَمَّا رَآهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَلَّىٰ مُدْبِرًا﴾

(پارہ ۲۰ رکوع ۷ سورۂ قصص جلالین ص ۳۲۹)

تشریحِ تعارض

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا معجزہ کے طور پر جو سانپ بن جاتا تھا اس کو آیت نمبر ۱ و ۲ میں تو ثعبان سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی بڑے سانپ کے آتے ہیں، جس کو اژدھا کہا جاتا ہے اور آیت نمبر ۳ میں حیۃ فرمایا جس کے معنی مطلق سانپ خواہ بڑا ہو یا چھوٹا، اور آیت نمبر ۴ و ۵ میں جان سے تعبیر فرمایا جس کے معنی پتلے اور چھوٹے سانپ کے آتے ہیں، لیکن ان میں سے تیسری آیت تو معارض نہیں ہے کیونکہ لفظ حیۃ تو ثعبان اور جان دونوں کو شامل ہے البتہ آیت نمبر ۱ و ۲ اور آیت نمبر

میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ اختلافِ احوال یا ازمان پر محمول ہے یعنی ابتداء میں تو وہ چھوٹا سانپ بنا جو عصا کے بقدر موٹا تھا، پھر وہ پھولتا گیا اور بڑا ہوتا گیا یہاں تک کہ بہت بڑا اژدھا بن گیا، حالت ابتداء کے اعتبار سے جانّ کہہ دیا گیا اور حالت انتہاء کے اعتبار سے ثعبان سے تعبیر کر دیا گیا۔ (بیضاوی، خازن، مدارک وغیرہ)

❷ اختلافِ جہت پر محمول ہے، جثہ اور ہیئت کے اعتبار سے وہ بڑا اژدھا تھا اور سرعتِ مشی (تیز دوڑنے) کے اعتبار سے پتلے سانپ کی طرح تھا، پتلا سانپ بہ نسبت موٹے سانپ کے تیز دوڑتا ہے، پس وہ سانپ ثعبان تھا من جهة الجثة و الهيئة اور جانّ تھا من جهة سرعة المشي، ولاتعارض بعد اختلاف الجهات۔ (خازن، مدارک، جلالین وغیرہ)

جادوگروں نے ایمان لاتے وقت "آمنا برب موسیٰ وہارون" کہا تھا یا "برب ہارون وموسیٰ"؟

پارہ ۱۶، طٰہٰ: ۲۰، ۱۲، ۱۹

آیات

① ﴿قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ﴾

(پارہ ۹، رکوع ۴، سورۃ الاعراف، جلالین ص ۱۳۸)

② ﴿قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ﴾

(پارہ ۱۹، رکوع ۳، سورۃ الشعراء، جلالین ص ۳۱۱)

③ ﴿قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى﴾ (پارہ ۱۶، رکوع ۱۲، سورۃ طٰہٰ، جلالین ص ۲۶۴)

تشریحِ تعارض

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کرنے والے جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کی حقانیت کو پہچان لیا تو ایک دم سجدہ میں گر گئے اور مشرف بایمان ہو گئے، انہوں نے ایمان کا اظہار کن الفاظ میں کیا، اس بارے میں پہلی دو آیتوں میں تو فرمایا کہ انہوں نے کہا "اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ" یعنی موسیٰ علیہ السلام کو ہارون علیہ السلام پر مقدم کیا اور تیسری آیت میں ہے کہ انہوں نے کہا "اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى" یعنی ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر مقدم کر کے کہا، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ ساحرین کا مقولہ تو "رَبِّ مُوْسٰی وَهَارُوْنَ" ہی ہے، انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مقدم کیا اس لئے کہ وہ حضرت ہارون علیہ السلام سے اشرف ہیں اور نبوت ورسالت میں اصل ہیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام ان کے تابع اور وزیر ومعین تھے مگر سورۂ طٰہٰ میں حق تعالیٰ نے رعایت فاصلہ کی وجہ سے "رَبِّ هَارُوْنَ وَمُوْسٰی" فرما دیا، رعایت فاصلہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلام اللہ کے چند جملوں کے آخری حروف میں توافق پیدا ہوجائے، چنانچہ اس آیت سے پہلی اور بعد کی آیات کے اخیر میں اعلی، اتی، ابقی، کے الفاظ آئے ہیں اس مناسبت سے رَبِّ هَارُوْنَ وَمُوْسٰی کہہ دیا گیا تاکہ ان سب آیات کے آخری کلمات میں توافق پیدا ہوجائے اگر رَبِّ مُوْسٰی وَهَارُوْنَ کہا جاتا تو توافق پیدا نہ ہوتا۔ (روح المعانی)

❷ ساحرین کا مقولہ رَبِّ هَارُوْنَ وَمُوْسٰی تھا، یعنی انہوں نے ہارون کو موسیٰ پر مقدم کرکے کہا تھا، یا تو اس وجہ سے کہ ہارون علیہ السلام عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے، یا اس وجہ سے کہ اگر رب موسیٰ وہارون کہتے تو رب موسیٰ کا لفظ سنتے ہی اول وہلہ میں فرعون یہ سمجھتا کہ یہ جادوگر مجھ پر ایمان لارہے ہیں اس لئے کہ فرعون موسیٰ علیہ السلام کا مجازی رب یعنی پرورش کرنے والا تھا، پس ہارون علیہ السلام کہنے سے پہلے پہلے فرعون یہ خیال کرتا کہ رب موسیٰ سے مراد میری ذات ہے اور یہ لوگ مجھ پر ایمان لارہے ہیں، اگرچہ وَهَارُوْنَ کہنے کے بعد یہ وہم دور ہوجاتا ہے مگر اول امر میں ایک لمحہ کے لئے تو اس کو یہ وہم باطل ہو ہی جاتا، اس لئے جادوگروں نے اول وہلہ ہی سے اس کے توہم باطل کو ختم کرنے کے لئے ہارون علیہ السلام کو مقدم کیا اور رب ہارون وموسیٰ کہا تاکہ اس لعین ومردود کو ایک لمحہ کے لئے بھی توہم باطل کا موقع نہ ملے۔

بہرحال ساحرین کا مقولہ تو رَبِّ هَارُوْنَ وَمُوْسٰی تھا، مگر حق تعالیٰ نے سورۂ اعراف اور سورۂ شعراء میں ان کے مقولہ کو نقل کرتے وقت موسیٰ کو ان کے اشرف اور

فصل ہونے کی وجہ سے یا رعایتِ فاصلہ کی وجہ سے مقدم کر کے رَبِّ هَارُوْنَ وَ مُوْسٰى فرما دیا کیونکہ اعراف اور شعراء میں اس آیت سے پہلی اور بعد کی آیات کا اختتام نون کے ساتھ ہے۔ (روح المعانی)

❷ علامہ ابوحیان رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دونوں مقولوں کے قائلین جدا جدا ہیں، جادوگروں کی ایک جماعت نے رب موسیٰ و ہارون کہا تھا اور دوسری جماعت نے رب ھارون وموسیٰ کہا تھا اور جب دو متعارض مقولوں کے قائلین جدا جدا ہوں تو کوئی تعارض نہیں رہتا، لیکن سوال یہ ہے کہ جب قائلین جدا جدا ہیں تو قال بعضھم قال بعضھم کہنا چاہئے تھا، ہر مقولہ کی نسبت سب کی طرف کر کے دونوں جگہ قالوا کیسے کہہ دیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں مقولوں کا مقصود و مفہوم چونکہ متحد تھا کہ موسیٰ و ہارون دونوں کے رب پر ایمان لانا مقصود تھا نہ کہ تقدیم و تاخیر اس لئے ہر مقولہ کی نسبت سب کی طرف کر دی گئی۔ (روح المعانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر شیطانی وسوسے کا اثر ہوتا تھا یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۹، ۱۴

آیات

① ﴿وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾
(پارہ: ۹، رکوع: ۱۴، سورۂ اعراف، جلالین ص: ۱۴۶ و ۱۴۷)

② ﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ﴾
(پارہ: ۱۴، رکوع: ۳، سورۂ حجر، جلالین ص: ۲۱۳)

③ ﴿إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾
(پارہ: ۱۴، رکوع: ۱۹، سورۂ نحل، جلالین ص: ۲۲۶)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیجئے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں شیطان وسوسہ ڈال سکتا ہے اور آیت نمبر ۲ میں حق تعالیٰ نے شیطان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے مخلص[1] بندوں پر تیرا تسلط نہیں ہے، (تو ان کے قلوب میں وساوس نہیں ڈال سکتا، ان کو ضلالت و معصیت پر آمادہ نہیں کر سکتا) اسی طرح آیت نمبر ۳ میں ارشاد

---

(۱) إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ میں عباد کی اضافت یائے متکلم کی طرف اضافت عہدیہ ہے، مراد عباد مخصوصین ہیں، جن کا ذکر اس سے اوپر کی آیت إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ میں آیا ہے اس لئے ترجمہ "مخلص بندوں" کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از حاشیہ بیان القرآن)

ہے کہ اہلِ ایمان اور اہلِ توکل پر شیطان کو تسلط حاصل نہیں ہے۔ ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے مخلص و متوکل بندوں پر شیطان کا کوئی تسلط و تصرف نہیں چلتا جن میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اوّل درجہ میں داخل ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین مخلصین اور اہلِ توکل وساوسِ شیطانیہ سے محفوظ رہتے ہیں، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے پانچ جواب ہیں:

❶ آیت نمبر ۱ میں "وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ" علی سبیل الفرض والتقدیر کہا گیا ہے کہ اگر بالفرض آپ پر شیطانی وسوسہ آنے لگے تو استعاذہ کیجئے مگر اس کا کبھی وقوع نہیں ہوا، آپ کا قلب مبارک شیطانی وساوس سے بالکل محفوظ رہا، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک جگہ ارشاد ہے: "لَئِنۡ اَشۡرَکۡتَ لَیَحۡبَطَنَّ عَمَلُکَ" اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اگر بفرضِ محال آپ نے شرک کر لیا تو آپ کے سارے اعمال بے کار ہو کر رہ جائیں گے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرک کا صدور محال ہے، پس یہ آیت وقوعِ وسوسہ پر دلالت نہیں کرتی، لہٰذا یہ ظاہری دونوں آیتوں کے معارض نہیں ہوئی۔

(تفسیر کبیر، روح المعانی، تفسیر خازن)

❷ نزغِ شیطان سے مراد مجازاً غصہ و غضب کا جوش آ جانا ہے، شیطانی وسوسہ و تصرف مراد نہیں ہے کہ اگر آپ کو کبھی غصہ لاحق ہو جائے تو آپ اس کے مقتضیٰ پر عمل نہ کیجئے، بلکہ استعاذہ کیجئے اس سے غصہ دور ہو جائے گا، غصہ لاحق ہونے کو مجازاً نزغِ شیطان سے تعبیر کر دیا گیا، اس کی تائید اس آیت کے شانِ نزول سے ہوتی ہے جو تفسیرِ مظہری میں مذکور ہے، حضرت عبد الرحمن بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب "خُذِ الۡعَفۡوَ وَاۡمُرۡ بِالۡعُرۡفِ الخ" نازل ہوئی جس میں آپ کو معاف کرنے کو

غصہ دیا گیا تو آپ نے حق تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا "کَیْفَ یَارَبِّ وَالْغَضَبُ" کہ اے رب اگر غصہ آجائے تو کیا کروں؟ تو یہ آیت نازل ہوئی "وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ" کہ اگر غصہ آجائے تو استعاذہ کیجئے، حق تعالیٰ غصہ دور فرما دیں گے، معلوم ہوا کہ آیت میں نزغ شیطان سے مراد غضب ہے، پس یہ آیت اخیرہ کی دونوں آیتوں کے معارض نہیں ہے۔ (روح المعانی، مدارک، تفسیر مظہری)

۲ آیت نمبر ۳ میں جو شیطان کے تسلط کی نفی کی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کو یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اولیاء مخلصین و مؤمنین سے کوئی گناہ کرا دے، ہاں گناہ کی رائے دے سکتا ہے مگر حق تعالیٰ نے ان حضرات کو اس کی رائے اور وسوسے کو قبول کرنے سے محفوظ و معصوم کر دیا ہے، پس آیت نمبر ۱ میں وسوسۂ شیطان سے مراد گناہ کی رائے دینا ہے نہ کہ گناہ کرانا، لہٰذا اثبات گناہ کی رائے دینے کا ہوا اور نفی تسلط علی اصدار الذنب کی ہے۔ فلا تعارض۔

البتہ اس صورت میں شیطان سے مراد وہ شیطان قرین نہیں ہے جو ہر شخص کے ساتھ رہ کر اس کو بری باتوں کا حکم کرتا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شیطان قرین آپ کو گناہ کی رائے بھی نہیں دیتا ہے بلکہ نیکی اور خیر کا حکم کرتا ہے جیسے کہ مسلم شریف کی روایت میں تصریح ہے:

عن ابن مسعود رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: "ما منکم من احد الا وقد وکل بہ قرینہ من الجن، وقرینہ من الملائکۃ۔" قالوا: وایاک یارسول اللّٰہ؟ قال: "وایای، الا ان اللّٰہ اعاننی علیہ، فاسلم فلا یامرنی الا بخیر۔"

(رواہ مسلم، ج۲: ص۲۷۳)

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں ہر شخص کے ساتھ ایک ساتھی

شیاطین میں سے اور ایک ساتھی ملائکہ میں سے مقرر کیا گیا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کے ساتھ بھی (شیطان) رہتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں میرے ساتھ بھی، مگر اللہ نے اس پر میری مدد فرمائی ہے، پس میرا ساتھی شیطان[1] مسلمان ہو گیا ہے، وہ مجھ کو خیر کی بات ہی کا حکم کرتا ہے، (گناہ کا حکم نہیں کرتا)۔"

لہٰذا آیت شریفہ میں شیطان سے مراد یہ شیطان قرین نہیں ہو سکتا، بلکہ شیطان معروف مراد ہے۔ اور شیطان معروف کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس احیاناً آ جانا کوئی محال نہیں ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ایک بار شیطان ایک آگ کا شعلہ لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچانے کے لئے آیا تھا۔ پس شیطان آپ کے پاس آ کر آپ کو کسی گناہ کی رائے بھی دے سکتا ہے مگر حق تعالیٰ اس کی رائے قبول کرنے سے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں، شیطان کو یہ قدرت اور تسلط نہیں ہے کہ آپ سے گناہ کرا دے۔ (بیان القرآن، تفسیر خازن)

● آیت اولیٰ میں اگرچہ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر مراد آپ کا غیر ہے، مطلب یہ ہے "وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ أَيُّهَا الْإِنسَانُ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ" اور عوام الناس پر خصوصاً گناہ گاروں پر شیطانی وساوس کا جاری ہونا اور شیطان کا ان پر تسلط ہونا محال نہیں بلکہ واقع ہے جیسا کہ آیت نمبر ۲ میں ارشاد ہے "إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ" اور دوسری جگہ ارشاد ہے "إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ" شیطان سے دوستی رکھنے والوں اور گمراہوں پر شیطان کا تسلط چلتا ہے۔ (خازن وغیرہ)

[1] یہ ترجمہ اس وقت ہوگا جب کہ حدیث میں فاسلم کو میم کے فتح کے ساتھ صیغہ ماضی پڑھا جائے تو قاضی عیاض نے اسی کو ترجیح دی ہے اس کی تائید حدیث کے "فلا یأمرنی الا بخیر" سے ہوتی ہے کیونکہ خیر اور نیکی کا حکم قرین مسلم ہی کر سکتا ہے نہ کہ شیطان کافر، اور دوسرا احتمال میم کے ضمہ کے ساتھ صیغہ مضارع ہونے کا ہے اور علامہ خطابی نے اسی کو ترجیح دی ہے، اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ میں اس کے شر و فتنہ سے سلامت و محفوظ رہتا ہوں۔ (تفسیر خازن)

۵ آیت اولیٰ میں شیطانی وسوسے کے مؤثر ہونے سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خلاف اولیٰ وخلاف افضل امر کا صادر ہو جانا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وسوسہ شیطان کبھی کبھی صرف اتنی حد تک مؤثر ہو سکتا ہے کہ ترک اولیٰ وافضل کا صدور ہو جائے، اس کے متعلق فرمایا کہ اگر کبھی ایسا ہو جائے تو استعاذہ کر لیا کیجئے۔ پس آیت نمبر ا میں اثبات خلاف اولیٰ وافضل کے صدور سے متعلق وسوسہ کا ہے اور آیت نمبر ۲ و ۳ میں نفی صدور ذنب وخطاء سے متعلق تسلط کی ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔

(تفسیر کبیر)

مؤمنین کے قلوب اللہ کے ذکر سے خوف زدہ ہوتے ہیں یا مطمئن؟

پارہ نمبر ۹، ۱۳

آیات

① ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾

(پارہ ۹، رکوع ۱۵: سورۃ انفال، جلالین ص ۱۴۷) ◆

② ﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِکْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (پارہ ۱۳، رکوع ۱۰: سورۃ رعد، جلالین ص ۲۰۳)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ذکر سے مؤمنین کے قلوب پر خوف طاری ہو جاتا ہے، وجلت، وجل سے ماخوذ ہے بمعنی خوف، اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے، اور خوف و اطمینان دو متعارض چیزیں ہیں، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

① آیت نمبر ۱ میں ذکرِ عقاب اور آیت نمبر ۲ میں ذکرِ رحمت مراد ہے، یعنی مؤمن بندوں کا حال یہ ہے کہ اللہ کے عقاب کا ذکر سن کر ان کے قلوب پر خوف طاری ہو جاتا ہے اور اللہ کی رحمت کے ذکر سے ان کے قلوب مطمئن ہو جاتے ہیں جیسا کہ دوسری

جبکہ ارشاد ہے: اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ "اللہ نے بڑا عمدہ کلام نازل کیا ہے جو باہم ملتی جلتی کتاب ہے، بار بار دہرائی گئی ہے (یعنی وعدہ وعید اور عذاب و رحمت کے مضامین کو بار بار ذکر کیا گیا ہے) اس (کے اندر بیان کئے ہوئے وعید کے مضامین کے ذکر) سے ان لوگوں کی کھالیں کانپ جاتی ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر (جب وعدہ رحمت کا ذکر آتا ہے) ان کی کھالیں اور قلوب اللہ کے ذکر (رحمت) سے نرم (اور مطمئن) ہو جاتے ہیں۔" صاحب جلالین نے اس آیت کی یہی تفسیر فرمائی ہے، بہر حال خوف و اطمینان کا طاری ہونا دو مختلف اعتبارات سے ہوا، اس لئے کوئی تعارض نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر، روح المعانی، جلالین)

❷ آیت نمبر ۲ میں اطمینان سے مراد قلب کی ٹھنڈک اور توحید و معرفت کے نور سے شرح صدر ہو جانا ہے اور جب یہ شئے انسان کو حاصل ہوتی ہے تو حق تعالیٰ کی عظمت و جلالت کا خوف اس کے قلب پر ہر وقت طاری رہتا ہے، پس یہ اطمینان خوف کے منافی نہیں ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (تفسیر خازن، روح المعانی)

❸ اطمینان بذکر اللہ سے مراد اللہ کی قسم کھانے سے اطمینانِ قلب حاصل ہو جاتا ہے، چنانچہ جب آدمی اللہ کی قسم کھا کر کوئی بات بیان کرتا ہے تو مومن کے قلب کو اطمینان ہو جاتا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر منقول ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اطمینان اللہ کی عظمت و جلالت اور اللہ کے عقاب و وعید کے خوف کے منافی نہیں ہے، پس کوئی تعارض نہیں۔ (تفسیر قرطبی و خازن)

غزوۂ بدر میں کفار پر کنکریاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھینکی یا اللہ نے؟

پارہ نمبر: ۹

(۱) ﴿ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ﴾

(پارہ ۹، رکوع: ۱۶، سورۂ انفال جلالین ص ۱۴۹)

تشریحِ تعارض

جب غزوۂ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹی اور کنکریوں کی ایک مٹھی بھر کر کفار کے اوپر پھینکی تھی تو وہ تمام کفار کی آنکھوں میں جا گری تھی، اس کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں بیان کیا ''وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ'' کہ جب آپ نے مٹی پھینکی تو آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی'' اس آیت کے جزء اول ومارمیت اور جزء ثانی اذ رمیت میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے کہ جزء اول میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رمی کی نفی کی گئی ہے اور جزء ثانی میں رمی کا اثبات ہے اور نفی و اثبات میں تعارض و تناقض ہوتا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے چار جواب ہیں:

❶ نفی حقیقت کے اعتبار سے ہے اور اثبات صورت اور ظاہر کے اعتبار سے ہے، نفی و اثبات کی جہت بدل جانے سے تعارض نہیں رہتا۔ مطلب یہ ہے کہ وَمَا رَمَيْتَ

حَقِيْقَةً اِذْ رَمَيْتَ صُوْرَةً وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى فِي الْحَقِيْقَةِ یعنی ظاہر میں تو وہ کنکریاں آپ نے پھینکی مگر حقیقت میں آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکیں۔" اسی لئے تو اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک مٹھی بھر خاک اور کنکریاں پورے لشکر کی آنکھوں میں بھر گئیں، لشکر کا کوئی فرد بھی ایسا باقی نہ رہا جس کی آنکھوں میں یہ دھول اور کنکریاں نہ پہنچی ہوں اور سب پر ایک رعب طاری ہو گیا، ان میں یہ مقصد بنچ گئی۔ مٹھی بھر کنکریوں میں یہ اثر پیدا کر دینا درحقیقت حق تعالیٰ ہی کی شان ہے کسی بشر کے بس کی بات نہیں ہے۔ اگر حقیقۃً آپ پھینکتے تو چونکہ آپ بشر ہیں اس لئے اس کا اثر اتنا ہی ظاہر ہوتا جتنا کہ ایک بشر کے پھینکنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ (روح المعانی و مدارک)

❷ نفی خلق کے اعتبار سے ہے اور اثبات کسب کے اعتبار سے ہے، بندوں اپنے فعل کو صرف کا سب ہوتا ہے خالق حق تعالیٰ ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہوگا "وما رمیت خلقا اذرمیت کسبا ولکن اللّٰہ خلق الرمی" پھینکنے کا کسب آپ نے کیا مگر خلق آپ نے نہیں کیا بلکہ حق تعالیٰ نے کیا۔ (تفسیر کبیر)

❸ وَمَا رَمَيْتَ سے مراد وَمَا بَلَّغْتَ الرَّمْیَ ہے، اثبات رمی کا ہے اور نفی ابلاغ رمی کی ہے، معنی یہ ہیں کہ جب آپ نے مٹی پھینکی تو اس کو کفار تک آپ نے نہیں پہنچایا بلکہ اللہ نے پہنچایا، جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں، جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں ہے فلا تعارض۔ یہ جواب جواب اول کے قریب ہے، تعبیر مختلف ہے۔

(تفسیر خازن)

❹ وَمَا رَمَيْتَ سے مراد وَمَا رَمَيْتَ بِالرُّعْبِ اور اذ رمیت سے مراد رمیت بالحصباء ہے یعنی وَمَا رَمَيْتَ بِالرُّعْبِ اِذْ رَمَيْتَ بِالْحَصْبَاءِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى بِالرُّعْبِ "کہ کنکریاں تو ان کے اوپر آپ نے ڈالیں مگر رعب ان کے اوپر آپ نے نہیں ڈالا بلکہ رعب تو حق تعالیٰ نے ڈالا۔" نفی و اثبات کا تعلق دو مختلف چیزوں سے ہونے کی وجہ سے کوئی تعارض نہیں رہا۔ (خازن، روح المعانی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کفار پر عذاب آسکتا ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر ۹

آیات

① ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾ (پارہ ۹، رکوع ۱۸، سورۃ انفال، جزء آیت ۳۳)

② ﴿وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾
(پارہ ۹، رکوع ۱۸، سورۃ انفال، جزء آیت ۳۴)

تشریح تعارض

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں موجود ہیں آپ کے ہوتے ہوئے حق تعالیٰ ان مشرکین کو عذاب نہیں دیں گے، نیز جب تک یہ لوگ استغفار کرتے رہیں گے اللہ ان کو عذاب نہیں دیں گے اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ ان کو عذاب کیوں نہ دیں (یعنی وجہ ہے کہ ان کو عذاب دیا جائے) حالانکہ یہ لوگ مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکتے ہیں، ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے کہ پہلے حق تعالیٰ نے عذاب کی نفی فرمائی کہ آپ کے ان میں ہوتے ہوئے اور ان کے استغفار کرنے کی صورت میں ان کو عذاب نہیں دیں گے پھر فرمایا کہ ان کو عذاب دیا جائے گا اور ان کے استغفار کی کوئی پروا نہیں کی جائے گی۔

دفعِ تعارُض

اس تعارض کے پانچ جواب ہیں:

❶ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت نمبر ا منسوخ اور آیت نمبر ۲ اس کے لئے ناسخ ہے، مشرکین مکہ طواف کرتے وقت تلبیہ میں غُفْرَانَکَ غفرانک کہا کرتے تھے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں موجود ہیں اور یہ لوگ استغفار کرتے رہیں گے ان پر عذاب نازل نہیں ہوگا، پھر حق تعالیٰ نے اس کو منسوخ فرما دیا اور یہ آیت نازل فرمائی "وَمَا لَهُمْ اَنْ لَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ الخ" کیا وجہ ہے کہ ان کو عذاب نہ دیا جائے الخ، یعنی ان کو عذاب دیا جائے گا، چنانچہ حق تعالیٰ نے اہل مکہ پر قحط سالی اور بھوک کا عذاب نازل فرمایا۔ (ابن کثیر)

مگر یہ جواب قابل اشکال ہے اس لئے کہ اخبار میں نسخ جاری نہیں ہوتا الا یہ کہ وہ خبر کسی حکم شرعی پر مشتمل ہو اور بظاہر یہ خبر کسی حکم شرعی کو متضمن نہیں ہے۔

(تفسیر روح المعانی)

❷ عذاب کی نفی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے مکہ میں ہونے کی حالت میں اور عذاب کا اثبات آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے مکہ سے نکل جانے اور ہجرت کر جانے کے بعد پر محمول ہے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ جب تک آپ ان میں موجود رہیں گے اس وقت تک ان پر عذاب نہیں آئے گا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو کچھ مؤمنین ابھی مکہ میں باقی تھے جو استغفار کرتے تھے تو حق تعالیٰ نے فرمایا "وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ" کہ جب تک یہ استغفار کرنے والے مؤمنین ان میں موجود رہیں گے اس وقت تک ان پر عذاب نہیں آئے گا، جب رفتہ رفتہ تمام مؤمنین ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے تو حق تعالیٰ نے مکہ فتح کرنے کا حکم دیدیا، چنانچہ مسلمانوں نے مکہ فتح

کیا اور کفار مغلوب ہوئے، یہی وہ عذاب ہے جس کا حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا، یہ توجیہ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ اور ایک جماعت سے منقول ہے بعض کہتے ہیں کہ عذاب سے مراد غزوۂ بدر کا عذاب ہے جس میں مشرکین کثیر قتل ہوئے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے امم سابقہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ فرمایا کہ اولاً نبی کو اور مؤمنین کو بستی سے ہجرت کرنے کا حکم دیا اس کے بعد اہل بستی پر عذاب نازل فرمایا۔ (تفسیر خازن)

خلاصۂ جواب یہ ہوا کہ نفی عذاب حالت وجود النبی والمؤمنین فی مکۃ پر اور اثبات عذاب بعد خروجہم منہا پر محمول ہے۔ ولا تعارض عند اختلاف الاحوال والازمان۔

۳ پہلی آیت میں عذاب استیصال کی نفی ہے، یعنی بالکلیہ جڑ سے اکھاڑ دینا اور نیست نابود کردینا جیسا کہ پہلی امتوں پر عذاب آتا تھا اور آیت ثانیہ میں اثبات عذاب بالسیف کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے کفار پر اس طرح کا عام عذاب تو نہیں آئے گا جیسا کہ امم سابقہ پر آیا البتہ جہاد کے ذریعہ عذاب بالسیف ہم ان پر نازل کرتے رہیں گے۔

(خازن)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بیان القرآن میں اسی توجیہ کو اختیار کیا ہے۔

۴ نفی عذاب دنیا کی ہے اور اثبات عذاب آخرت کا ہے، یعنی آیت کا مطلب اس طرح ہوگا: "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ فِي الْآخِرَةِ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" دنیا میں تو ان پر عذاب نہیں آئے گا لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں کہ آخرت میں بھی ان کو عذاب نہ دیا جائے، آخرت

میں عذاب ضرور ہوگا، یہ توجیہ جبائی سے منقول ہے۔ (خازن روح المعانی)

۵ محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ آیت اولی اپنے ماقبل کے ساتھ متصل ہے اور یہ کفار کا مقولہ ہے جیسا کہ اس سے پہلی آیت "اللھم ان کان ھذا ھو الحق الخ" ان کا مقولہ ہے، مطلب یہ ہے کہ نضر بن حارث اور دیگر کفار و مشرکین یوں کہا کرتے تھے اے اللہ! اگر یہ قرآن حق ہے اور تیری طرف سے نازل شدہ ہے اور ہم اس کا انکار کرتے ہیں تو اے اللہ تو ہم پر آسمان سے پتھر برسادے یا اور کوئی دردناک عذاب بھیج دے۔ نیز یوں بھی کہا کرتے تھے "ان اللہ لا یعذبنا ونحن نستغفر ولا یعذب امۃ ونبیھا معھا" ہمارے استغفار کرنے کی حالت میں اللہ ہم کو عذاب نہیں دیں گے اور کسی امت کو ان کے ساتھ ان کے نبی کے ہوتے ہوئے عذاب نہیں دیا جاتا۔ حق تعالی نے اولاً تو ان کی جہالت کو بیان کیا کہ یہ لوگ اس طرح کا گمان رکھتے ہیں، پھر آگے ان پر تردید فرمائی "ومالھم الا یعذبھم اللہ" کہ بھلا اللہ تعالی ان کو عذاب کیوں نہیں دیں گے جب کہ یہ مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکتے ہیں، یعنی ان کا عدم عذاب کا یہ گمان باطل ہے ان کو عذاب ضرور دیا جائے گا، پس آیت اولی کفار کا مقولہ ہے اور آیت ثانیہ اس کی تردید میں حق تعالی کا مقولہ ہے۔[1] (تفسیر خازن)

مگر صاحب روح المعانی کہتے ہیں کہ یہ توجیہ درست نہیں کیونکہ اس صورت میں: "وماکان اللہ لیعذبنا وماکان اللہ مُعَذِّبَنَا ونحن نستغفر" صیغہ تکلم کے ساتھ ہونا چاہئے تھا جیسا کہ اس سے پہلے مقولہ میں اَمْطِرْ عَلَیْنَا اور ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ صیغہ تکلم کے ساتھ ہے۔

---

(۱) اور جب دو متعارض مقولوں کے قائلین جدا جدا ہوں تو تعارض نہیں رہتا۔

کفار کے اعمالِ حسنہ نافع ہیں یا ضائع و بے کار؟

پارہ نمبر: ۹، ۱۳، ۱۶، ۱۹، ۲۴، ۲۶

① ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾

(پارہ: ۹ رکوع: ۱۸ سورۂ انفال جلالین ص: ۱۵۰) ✦

② ﴿وَمَا دُعَآءُ الْكَافِرِيْنَ اِلَّا فِیْ ضَلَالٍ﴾ (پارہ: ۱۳ رکوع: ۹ سورۂ رعد جلالین ص: ۲۰۲)

③ ﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ﴾

(پارہ: ۱۶ رکوع: ۳ سورۂ کہف جلالین ص: ۲۵۳)

④ ﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾

(پارہ: ۱۹ رکوع: ۱ سورۂ فرقان جلالین ص: ۳۰۳)

⑤ ﴿وَمَا دُعَآءُ الْكَافِرِيْنَ اِلَّا فِیْ ضَلَالٍ﴾

(پارہ: ۲۴ رکوع: ۱۰ سورۂ مومن (غافر) جلالین ص: ۳۹۴)

⑥ ﴿اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ﴾

(پارہ: ۲۶ رکوع: ۵ سورۂ محمد (القتال) جلالین ص: ۴۱۹)

⑦ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ﴾

(پارہ: ۲۶ رکوع: ۵ سورۂ محمد (قتال) جلالین ص: ۴۲۰)

⑧ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْ

بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ﴿

(پارہ:۲۶ رکوع:۸ سورۂ محمد (قتال) جلالین ص:۴۲۲)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ میں کفار کے متعلق ارشاد ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہیں دے گا دراں حالیکہ وہ استغفار کرتے ہوں، کفار مکہ طواف کرتے وقت تلبیہ پڑھتے ہوئے غفرانك غفرانك کہا کرتے تھے، حق تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا کہ لوگ استغفار کرتے ہیں اس حالت میں اللہ ان پر عذاب نازل نہیں کرے گا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے استغفار سے جو کہ ان کا ایک عمل ہے ان کو نفع پہنچتا ہے کہ حق تعالیٰ ان کے اس عمل کی وجہ سے ان پر عذاب نازل نہیں فرماتے اور اس کے بعد کی مذکورہ سات آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے اعمال بے کار اور باطل ہیں، کوئی نفع ان پر مرتب نہیں ہوتا، چنانچہ آیت نمبر ۲ و ۵ میں ہے "وَمَادُعَاءُ الْكَافِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلَالٍ" کافر جو دعا مانگتا ہے وہ ضائع اور بے کار ہے، اس پر کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوتا، اگر وہ مغفرت کی دعا بھی کرے تو غیر نافع وضائع ہے۔ اور آیت نمبر ۳ میں ہے کہ کفار اعمال کے اعتبار سے خسارہ اور نقصان میں ہیں کہ وہ دنیاوی زندگی میں اگر کوئی نیک عمل کرتے ہیں وہ ضائع اور بے کار ہے اور وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھے اعمال کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے اعمال حسنہ کو باطل کر دیتے ہیں اور آیت نمبر ۴ میں ہے کہ حق تعالیٰ کفار کے اعمال حسنہ کو ھباء منثورا "بکھرے ہوئے غبار" کی طرح بے کار اور غیر نافع بنا دیتے ہیں اور آیت نمبر ۶ و ۷ و ۸ میں اضل اعمالھم اور احبط اعمالھم وغیرہ کہہ کر ان کے عمل کا بطلان اور ضائع ہونا بیان کیا گیا ہے، غرض کہ اخیر کی سات آیات سے کفار کے اعمال خیر کا غیر نافع ہونا معلوم ہوتا ہے، پس آیت نمبر ۱، اور ان ساتوں آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

نافع ہونا دنیا کے اعتبار سے ہے اور غیر نافع اور ضائع ہونا آخرت کے اعتبار سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافر اگر کوئی نیک عمل کرتا ہے جیسے کہ استغفار کرنا، کسی فقیر ومسکین کو صدقہ وخیرات دے دینا، صلہ رحمی کرنا وغیرہ تو اس عمل کا بدلہ اس کو دنیا میں مل جاتا ہے کہ حق تعالیٰ دنیاوی عذاب ومصیبت ہٹا لیتے ہیں یا مال واولاد میں وسعت و فراخی عطا فرما دیتے ہیں، صحت وعافیت سے نواز دیتے ہیں مگر آخرت میں ان اعمال پر کوئی نفع مرتب نہیں ہوتا اور یہ اعمال اخروی عذاب سے نجات کا باعث نہیں ہوں گے، پس نفع اور عدم نفع کا محل مختلف ہوجانے سے کوئی تعارض نہیں رہا۔

(حاشیہ شریف وصاوی)

کفار سے صلح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱۰، ۲۶

آیات

(۱) ﴿وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ (پارہ: ۱۰، رکوع: ۳، سورۃ انفال، آیت نمبر: ۶۱)

(۲) ﴿فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ الخ﴾ (پارہ: ۲۶، رکوع: ۸، سورۃ محمد (القتال)، آیت نمبر: ۳۵)

شرحِ تعارض

آیت نمبر ۱ میں ارشاد ہے کہ اگر کفار صلح کرنے کے لئے مائل ہوں تو آپ بھی صلح کی طرف مائل ہو جایئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار سے صلح کرنا جائز ہے اور آیت نمبر ۲ میں صلح کرنے سے منع کیا گیا ہے کہ تم لوگ ہمت مت ہارو اور کفار کو صلح کی طرف مت بلاؤ تم ہی غالب رہو گے۔ پس دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مجاہد، قتادہ رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ صلح والی آیت منسوخ ہے، ابتداء میں صلح کی اجازت تھی، پھر آیت جہاد و قتال نازل فرما کر صلح سے منع کر دیا گیا، ولا تعارض بعد النسخ۔ (روح المعانی)

❷ اختلاف اشخاص پر محمول ہے، اہل کتاب سے تو صلح کرنے کی اجازت ہے البتہ مشرکین عرب سے صلح کرنا جائز نہیں ان کے لئے یا تو اسلام کو قبول کرنا ہے یا قتال،

پس آیت نمبر ۱ اہلِ کتاب کے ساتھ مخصوص ہے جیسا کہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور امام سدی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ یہ آیت بنو قریظہ کے بارے میں نازل ہوئی جو یہود کا ایک قبیلہ ہے اور آیت نمبر ۲ مشرکین عرب کے بارے میں ہے۔ فلا تعارض۔ (روح المعانی)

۳ محض ضعف اور کم ہمتی کی وجہ سے صلح کرنا جائز نہیں۔ آیت نمبر ۳ میں اسی قسم کی صلح سے منع کیا گیا ہے جیسا کہ ولا تہنوا سے معلوم ہوتا ہے، البتہ کسی مصلحت کی وجہ سے اگر صلح کر لی جائے تو درست ہے خواہ وہ مصلحت ضعفِ قوتِ جسمانی ہو یا قلتِ عدد یا قلتِ سامان وغیرہ ہو لیکن سب کچھ ہوتے ہوئے سست اور کم ہمت و بزدل بنا ہوا ان سے بلا مصلحت صلح کرنا جائز نہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مصلحت کے پیشِ نظر مقامِ حدیبیہ میں کفار سے صلح کی تھی، آیتِ اولیٰ میں اسی صلح کی اجازت ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (بیان القرآن وغیرہ)

کفار کی کتنی تعداد سے مقابلہ کرنا ضروری ہے؟

پارہ نمبر: ۱۰

آیات

① ﴿وَإِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ﴾

(پارہ ۱۰، رکوع: ۵، سورۂ انفال جلالین ص: ۱۵۳)

② ﴿فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (پارہ: ۱۰، رکوع: ۵، سورۂ انفال جلالین ص: ۱۵۴)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ۱ میں ارشاد ہے کہ اگر تم میں بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں تو دو سو کفار پر غالب آجائیں گے اور اگر سو ہوں تو ایک ہزار پر غالب آجائیں گے۔ یہ اگرچہ خبر ہے لیکن امر کے معنی میں ہے کہ اگر کفار کی تعداد تم سے دس گنا زائد ہو، تم بیس ہوں وہ دو سو ہوں، تم سو ہوں وہ ایک ہزار، تو تم کو ان کے مقابلہ پر ثابت قدم رہنا اور ان سے لڑنا ضروری ہے، بھاگنا اور پیچھے ہٹنا حرام ہے اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دوگنی تعداد سے مقابلہ کرنا تو ضروری ہے اس سے زائد سے ضروری نہیں کہ اگر مسلمان سو ہوں اور کفار دو سو، مسلمان ایک ہزار ہوں کفار دو ہزار تو مقابلہ اور جہاد کرنا ضروری ہے، اس سے زائد سے نہیں، پس بظاہر دونوں آیتوں میں تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

آیت اولیٰ آیت ثانیہ سے منسوخ ہے، بخاری شریف کی روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ جب پہلی آیت اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ الخ نازل ہوئی اور مسلمانوں کو کافروں کی دس گنی تعداد سے مقابلہ کرنے پر ثابت قدم رہنے کا حکم دیا تو مسلمانوں کو یہ بھاری معلوم ہوا کہ دس گنی تعداد سے مقابلہ کرنا تو دشوار معلوم ہوتا ہے تو حق تعالیٰ نے تخفیف فرمادی اور یہ حکم منسوخ کر کے دوسری آیت نازل فرمادی "اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ الخ" اب اللہ نے تم سے بوجھ ہلکا کردیا اور جان لیا کہ تم میں ابھی کچھ کمزوری ہے، دس گنی تعداد سے مقابلہ کرنا تمہارے لئے دشوار ہے تو اب تم کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ کفار کی تعداد اگر تم سے دوگنی ہو تو ان سے مقابلہ پر ثابت قدم رہنا ضروری ہے اور بھاگنا حرام ہے۔ ولا تعارض بعد النسخ۔ (تفسیر عثمانی)

قتال تمام مشرکین سے ضروری ہے یا صرف مشرکین اقارب سے؟

پارہ نمبر: ۱۰،۱۱

آیات

① ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً﴾ (پارہ ۱۰، رکوع ۱۱، سورۂ توبہ، جلالین ص ۱۵۸) ✦

② ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً﴾ (پارہ ۱۱، رکوع ۵، سورۂ توبہ، جلالین ص ۱۶۹)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت میں حکم ہے کہ تمام مشرکین سے قتال کرو یعنی خواہ اقارب ہوں یا غیر اقارب اور دوسری آیت میں فرمایا کہ کفار میں سے جو تمہارے رشتہ دار ہیں ان سے قتال کرو اور ان پر سختی کا استعمال کرو پس دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

آیت نمبر ۲ میں غیر اقارب کے ساتھ قتال کرنے سے روکا نہیں گیا، بلکہ اس میں جہاد کے آداب کی تعلیم دی گئی ہے کہ جہاد کا طریقہ اور ادب یہ ہے کہ اولاً رشتہ داروں سے جہاد کرو پھر غیر اقارب سے کیونکہ تمام مشرکین سے دفعۃً واحدۃً قتال کرنا تو ممکن نہیں، وقتاً فوقتاً یکے بعد دیگرے ہی کیا جا سکتا ہے پس اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے قریبی رشتہ داروں سے جہاد کرو، پھر دور کے اقارب سے پھر تمام اجانب مشرکین سے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً اپنی قوم سے جہاد کیا، پھر باقی اہل

عرب کی طرف منتقل ہوئے۔ اس کے بعد اہلِ کتاب سے جہاد کیا، پھر اہلِ روم اور اہلِ شام کی طرف رخ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین جہاد کے لئے عراق کی طرف نکلے پھر تمام بلاد و امصار کی طرف نکل پڑے، اس تقریر کے بعد معلوم ہوگیا کہ اس آیت سے یکے بعد دیگرے تمام ہی مشرکین سے جہاد کرنے کا حکم ثابت ہوتا ہے لہٰذا اس آیت کو آیت اولیٰ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً سے کوئی تعارض نہیں۔ (صاوی)

جہاد مستطیع و معذور ہر شخص پر فرض ہے یا صرف مستطیع پر؟

پارہ نمبر: ۱۰، ۲۶

آیات

① ﴿اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (پارہ: ۱۰ رکوع: ۱۲ سورۂ توبہ جلالین ص: ۱۵۹)

② ﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ﴾ (پارہ ۱۰ رکوع: ۱۸ سورۂ توبہ جلالین ص: ۱۶۳)

③ ﴿لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ﴾ (پارہ ۲۶ رکوع: ۱۰ سورۂ فتح جلالین ص: ۴۲۴)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ میں ارشاد باری ہے کہ تم ہلکے ہو یا بھاری، ہر حال میں جہاد کے لئے نکل جاؤ اور جان و مال کے ساتھ اللہ کے راستہ میں جہاد کرو۔ یعنی تمہاری حالت خواہ ایسی ہو کہ جہاد کرنا تمہارے لئے آسان و خفیف ہو اور خواہ ایسی ہو کہ جس میں جہاد کرنا دشوار و ثقیل ہو ہر حال میں تمہیں جہاد کرنا ضروری ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی غنی ہو یا فقیر، بیمار ہو یا تندرست، معذور ہو یا غیر معذور، مجرد ہو یا اہل و عیال والا ہر حال میں جہاد فرض ہے اور دوسری، تیسری آیت میں ارشاد ہے کہ کمزور، مریض، فقیر، نابینا اور لنگڑے معذور پر جہاد میں نکلنا فرض نہیں ہے، اگر یہ لوگ جہاد میں نہ جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

① آیت نمبر ۱ اخیر کی دونوں آیتوں سے منسوخ ہے، ابتداءً ہر حال میں جہاد کے لئے نکلنا ضروری تھا، کسی قسم کا کوئی عذر مسموع نہیں ہوتا تھا، پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا چنانچہ روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن اُمِّ مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نابینا تھے، انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا میرے لئے بھی جہاد میں نکلنا ضروری ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے آیت **لیس علی الاعمی حرج** الخ نازل فرمائی اور معذورین حضرات کے لئے تخفیف فرمادی گئی کہ اگر یہ لوگ جہاد میں نہ جائیں تو کوئی گناہ نہیں ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علامہ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہی منقول ہے، ولا تعارض بعد النسخ (روح المعانی، تفسیر خازن وغیرہ)

② آیت نمبر ۱ میں امر وجوبی نہیں ہے بلکہ ندب واستحباب پر محمول ہے، ابتداءً ہر حال میں جہاد کے لئے نکلنا واجب نہیں تھا بلکہ مستحب تھا اور ترکِ مندوب پر کوئی گناہ نہیں لہٰذا آیت نمبر ۲ و ۳ میں جو حرج کی نفی کی گئی ہے وہ اس کے معارض نہیں ہے، ایسی صورت میں نسخ ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ (تفسیر خازن، تفسیر...)

③ **انْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا** کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معذور اور غیر معذور سب کو نکلنا ضروری ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جہاد پر قدرت رکھتے ہیں ان کو ہر حال میں نکلنا ضروری ہے خواہ ان کے پاس آلاتِ جہاد ہتھیار، سواری، خدام وغیرہ زیادہ ہوں یا تھوڑے ہوں، آلاتِ جہاد کی قلت کوئی عذر نہیں ہے، نابینا، مریض اور فقیر وغیرہم اس حکم میں داخل ہی نہیں لہٰذا یہ آیت نہ تو دوسری دو آیتوں کے معارض ہوگی اور نہ منسوخ ماننے کی ضرورت پڑے گی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے الفوز الکبیر میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ (الفوز الکبیر)

جہاد میں سب کو نکلنا ضروری ہے یا ایک جماعت کو؟

پارہ لمبر: ۱۱

آیات

① ﴿مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ﴾ (پارہ: ۱۱ رکوع: ۳ سورۂ توبہ جلالین: ۱۶۸) ✦

② ﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴾ (پارہ: ۱۱ رکوع: ۳ سورۂ توبہ جلالین ص: ۱۶۸)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ مدینہ اور آس پاس کے دیہات والوں کے لئے جائز نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب جہاد میں تشریف لے جائیں تو یہ لوگ پیچھے ہٹ جائیں بلکہ سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں نکلنا ضروری ہے۔ اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ تمام مسلمانوں کو جہاد میں نہ جانا چاہئے بلکہ ایک جماعت جہاد میں نکل جائے اور ایک جماعت وطن میں موجود رہنی چاہئے جو دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتی رہے اور جب مجاہدین حضرات واپس آئیں تو ان کو دین کی باتیں سنا کر اللہ کی نافرمانی سے ڈرائیں تاکہ وہ برے کاموں سے بچیں۔ پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

① ابن زید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلی آیت دوسری آیت سے منسوخ ہے، جب مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی تو حق تعالیٰ نے سب کے لئے نکلنا ضروری قرار دیا تھا، جب مسلمانوں کی کثرت ہوئی تو یہ حکم منسوخ کر دیا اور دوسری آیت وما كان المؤمنون لينفروا كافة الخ نازل فرمادی، جس میں یہ فرمایا کہ سب کو نہیں جانا چاہئے، ایک جماعت جہاد میں نکل جائے دوسری وطن میں رہ جائے۔ ولا تعارض بعد النسخ۔ (تفسیر خازن، تفسیر مظہری)

② حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آیت اولیٰ اس حالت پر محمول ہے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس جہاد میں تشریف لے جائیں جس کو غزوہ کہتے ہیں اس وقت آپ کے ساتھ تمام مسلمانوں کو نکلنا ضروری ہے کسی کے لئے پیچھے رہنا جائز نہیں، کیونکہ جب صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد میں تشریف لے گئے ہیں تو وطن میں باقی رہنے والے لوگ کس سے تعلیم حاصل کریں گے، اس لئے سب کو آپ کے ساتھ نکل جانا چاہئے اور دوسری آیت اس حالت پر محمول ہے جب کہ آپ خود تو تشریف نہ لے جائیں البتہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت کو جہاد کے لئے روانہ کریں، جس کو سریہ[1] کہتے ہیں۔

اس وقت سب کو نہیں جانا چاہئے، ایک جماعت کو وطن میں موجود رہنا چاہئے تاکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کی تعلیم حاصل کرتے رہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ پہلی آیت غزوات سے متعلق ہے اور آیت ثانیہ سرایا سے متعلق ہے۔ فلا تعارض بینهما۔ (جلالین شریف وصاوی)

---

(۱) سو سے لے کر پانچ سو تک کی جماعت کو سریہ کہا جاتا ہے پھر اس سے آٹھ سو تک کی جماعت کو منسر اور اس سے زائد چار ہزار تک کو جیش اور اس سے زائد کو جحفل کہتے ہیں، کل سرایا کی تعداد جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہیں لے گئے ۴۷ ہے اور غزوات کی تعداد جن میں آپ تشریف لے گئے ۲۷ ہے جن میں سے ۸ غزوات میں قتال فرمایا۔ (صاوی)

انسان بوقت مصیبت دعائیں کرتا ہے یا مایوس وناامید ہوجاتا ہے؟

پارہ نمبر: ۱۱، ۱۵، ۲۱، ۲۳، ۲۴، ۲۵

آیات

① ﴿وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا﴾

(پارہ:۱۱ رکوع:۷ سورۂ یونس جلالین ص:۱۷۱)

② ﴿وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ﴾

(پارہ:۲۱ رکوع:۷ سورۂ روم جلالین ص:۳۴۳)

③ ﴿وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِنْهُ﴾

(پارہ:۲۳ رکوع:۱۵ سورۂ زمر جلالین ص:۳۸۶)

④ ﴿فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً مِنَّا﴾

(پارہ:۲۴ رکوع:۲ سورۂ زمر جلالین ص:۳۸۹)

⑤ ﴿وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَى بِجَانِبِهِ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُو دُعَاءٍ عَرِيضٍ﴾ (پارہ:۲۵ رکوع:۱ سورۂ حم سجدہ (فصلت) جلالین ص:۴۰۱) ✦

⑥ ﴿وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَى بِجَانِبِهِ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوسًا﴾ (پارہ:۱۵ رکوع:۹ سورۂ بنی اسرائیل (اسراء) جلالین ص:۲۳۷)

⑦ ﴿لَا يَسْأَمُ الْإِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِنْ مَسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوسٌ قَنُوطٌ﴾

(پارہ:۲۵ رکوع:۱ سورۂ حم سجدہ (فصلت) جلالین ص:۴۰۰)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو جب پریشانی لاحق ہوتی ہے تو وہ لیٹ کر، بیٹھ کر، کھڑے ہو کر غرض ہر حال میں اللہ سے خوب لمبی لمبی دعائیں کرتا ہے اور آیت نمبر ۶ و ۷ میں فرمایا گیا ہے کہ پریشانی میں انسان ناامید اور مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے (یئوس کے معنی مایوس اور قنوط کے معنی ناامید) اور دعا چونکہ امید و آس کی حالت میں کی جاتی ہے اس لئے دعا کرنے اور ناامیدی و مایوسی میں تعارض و تنافی ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے پانچ جواب ہیں:

❶ اختلاف اشخاص پر محمول ہے، پہلی پانچ آیات مومن کے حق میں ہیں اور آخر کی دونوں آیتیں کافر کے بارے میں ہیں کہ مومن تو پریشانی کے وقت اللہ سے خوب دعائیں کرتا ہے اور کافر مایوس و ناامید ہو کر بیٹھ جاتا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے "انه لا ییأس من روح الله الا القوم الکافرون" کہ اللہ کی رحمت سے کفار ہی ناامید ہوتے ہیں، اور اختلاف اشخاص کے بعد کوئی تعارض نہیں رہتا۔ (مدارک)

❷ اختلاف احوال و ازمان پر محمول ہے کہ جب پریشانی لاحق ہوتی ہے تو ابتداءً تو انسان خوب دعائیں کرتا ہے اور جب قبولیت کے آثار نمایاں نہیں ہوتے تو مایوس اور ناامید ہو کر دعا چھوڑ دیتا ہے۔ (بیان القرآن)

❸ دعا اور قنوط و یأس کا متعلق مختلف ہے، دعا کا تعلق زبان سے ہے اور ناامیدی و مایوسی کا تعلق قلب سے ہے اور دونوں آیتیں کافر ہی کے متعلق ہیں، مطلب یہ ہے کہ کافر زبان سے تو خوب دعائیں کرتا ہے مگر قلب اس کا مایوس و ناامید رہتا ہے، پس کوئی

تو رخ پھیر لیتے ہیں۔ (مدارک، بیان القرآن)

۴ اختلاف مکان پر محمول ہے، یعنی سمندر میں تو دعائیں کرتا ہے اور خشکی میں مایوس و ناامید ہو جاتا ہے، کفار جب کشتیوں پر سوار ہوتے تھے اور کوئی طوفان آجاتا تھا تو اللہ سے دعائیں کرتے تھے جیسا کہ ارشاد ہے "فاذا رکبوا فی الفلک دعوا اللہ مخلصین لہ الدین۔" (تفسیر مدارک)

۵ اختلاف مدعو پر محمول ہے، کافر مصیبت کے وقت اللہ سے دعا کرتا ہے اور اپنے بتوں سے مایوس و ناامید ہو جاتا ہے۔ (تفسیر مدارک)

اولادِ آدم علیہ السلام کو کس چیز سے پیدا کیا گیا؟

پارۂ نمبر: ۱۲، ۱۴، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۲۱، ۲۳، ۲۷، ۲۹، ۳۰

آیات

① ﴿هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا﴾

(پارہ:۱۲ رکوع:۶ سورۂ ہود جلالین ص:۱۸۳)

② ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى﴾

(پارہ:۱۶ رکوع:۱۲ سورۂ طٰہٰ جلالین ص:۲۶۳)

③ ﴿يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ﴾ (پارہ:۱۷ رکوع:۸ سورۂ حج جلالین ص:۲۷۹)

④ ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ﴾

(پارہ:۲۱ رکوع:۶ سورۂ روم جلالین ص:۳۴۲)

⑤ ﴿اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ﴾ (پارہ:۲۳ رکوع:۵ سورۂ صافات جلالین ص:۳۷۳)

⑥ ﴿وَاَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾

(پارہ:۲۷ رکوع:۹ سورۂ نجم جلالین ص:۴۳۹) ✦

⑦ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ﴾

(پارہ:۱۴ رکوع:۷ سورۂ نحل جلالین ص:۲۱۹)

⑧ ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ﴾ (پارہ:۱۸ رکوع:۱ سورۂ مؤمنون جلالین ص:۲۸۷)

⑨ ﴿ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ﴾

(پارہ:۲۱ رکوع:۱۴ سورۂ سجدہ جلالین ص:۳۴۹)

⑩ ﴿اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ﴾

(پارہ:۲۳ رکوع:۴ سورۂ یٰس جلالین ص:۳۷۲)

(۱۱) ﴿وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ مِنْ نُطْفَةٍ إِذَا تُمْنَىٰ﴾

(پارہ:۲۷، رکوع:۷، سورۂ نجم جلالین ص:۴۴۳)

(۱۲) ﴿أَفَرَأَيْتُمْ مَا تُمْنُونَ ءَأَنْتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ﴾

(پارہ:۲۷، رکوع:۵، سورۂ واقعہ جلالین ص:۴۴۷)

(۱۳) ﴿أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِنْ مَنِيٍّ يُمْنَىٰ﴾ (پارہ:۲۹، رکوع:۱۸، سورۂ قیامہ جلالین ص:۴۸۲)

(۱۴) ﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ﴾

(پارہ:۲۹، رکوع:۱۹، سورۂ دہر (انسان) جلالین ص:۴۸۳)

(۱۵) ﴿أَلَمْ نَخْلُقْكُمْ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ﴾ (پارہ:۲۹، رکوع:۲۱، سورۂ مرسلات جلالین ص:۴۸۵)

(۱۶) ﴿مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ مِنْ نُطْفَةٍ﴾ (پارہ:۳۰، رکوع:۵، سورۂ عبس جلالین ص:۴۹۰)

(۱۷) ﴿فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ خُلِقَ مِنْ مَاءٍ دَافِقٍ يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ﴾ (پارہ:۳۰، رکوع:۱۱، سورۂ طارق جلالین ص:۴۹۶) ✦

(۱۸) ﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ (پارہ:۳۰، رکوع:۲۱، سورۂ علق جلالین ص:۵۰۳)

تشریحِ تعارض

ان تمام آیات میں اولادِ آدم کی تخلیق کا بیان ہے کیونکہ ان آیات میں سے بعض میں تو جمع کا صیغہ ہے بعض میں نسل کی تصریح ہے اور جن آیت میں صرف انسان کا ذکر ہے ان میں انسان سے جنس انسان یعنی اولادِ آدم مراد ہے جیسا کہ آیت کے سیاق و سباق اور مفسرین حضرات کی تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے اس طرح یہ تمام آیات اولادِ آدم کی تخلیق کو بیان کر رہی ہیں مگر اولادِ آدم کو کس چیز سے پیدا کیا گیا اس بارے میں یہ آیات متعارض ہیں، آیت نمبر ۱ تا ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ اولادِ آدم کو مٹی سے بنایا اور آیت نمبر ۷ تا ۱۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ نطفہ منی سے پیدا کیا اور آخری آیت نمبر ۱۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ علقہ (دم جامد) سے پیدا کیا گیا، اس طرح یہ آیات

غذاؤں سے بنتا ہے اور غذائیں مٹی سے پیدا ہوتی ہیں، پس گویا انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے، پس ان آیات میں انسان کے مادۂ بعیدہ کا بیان ہے اور اخیر کی آیات میں مادۂ قریبہ کو بیان کیا گیا ہے۔ (روح المعانی وغیرہ)

❸ مجموع الامرین مراد ہے، ہر انسان کی تخلیق مٹی اور نطفۂ منی دونوں کے مجموعہ سے ہوتی ہے، جب رحم مادر میں نطفہ قرار پاتا ہے تو ایک فرشتہ اس مقام سے جہاں اس شخص کو دفن ہونا ہے مٹی اٹھا کر لاتا ہے اور نطفہ پر چھڑک دیتا ہے، پھر مٹی اور نطفہ دونوں کے مجموعہ سے بچہ کی تخلیق ہوتی ہے۔ بعض آیات میں ان میں سے ایک جزء یعنی مٹی کا ذکر کر دیا اور بعض میں دوسرے جزء یعنی نطفہ کو بیان کر دیا۔ پس ان میں کوئی تعارض نہیں اور آخری آیت **خلق الانسان من علق** کی توجیہ جواب اول میں بیان ہو چکی ہے، مجموع الامرین کی جو یہ توجیہ کی گئی ہے اس کی تائید حضرت عطاء خراسانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت سے ہوتی ہے۔

﴿عن عطاء الخراسانی قال: ان الملك ينطلق فياخذ من تراب المكان الذى يدفن فيه الشخص، فيذره على النطفة، فيخلق من التراب والنطفة.﴾ (اخرجہ عبد بن حمید وابن المنذر، روح المعانی ۲۰۸/۱۹)

ترجمہ: ”حضرت عطاء خراسانی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ فرشتہ جاتا ہے اور اس مقام سے جہاں اس شخص کو دفن ہونا ہے مٹی لیتا ہے پس اس کو نطفہ پر بکھیر دیتا ہے پس مٹی اور نطفہ سے بچہ کی پیدائش ہوتی ہے۔“ (۱)

---

(۱) مفسرین رحمہم اللہ نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق جس مٹی سے ہوئی وہ کعبہ کی مٹی تھی مگر طوفانِ نوح میں وہ مٹی اس مقام پر منتقل ہو گئی تھی جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک ہے“۔ (حاشیہ روح المعانی)

جنت میں داخلہ اعمال کے سبب سے ہوگا یا محض فضلِ الٰہی سے؟

پارہ نمبر: ۱۴، ۱۷، ۲۱، ۲۵، ۲۶، ۳۰

① ﴿يَقُولُونَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾
(پارہ ۱۴، رکوع ۱۰، سورۂ نحل، جلالین ص: ۲۱۸)

② ﴿اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى نُزُلًا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (پارہ ۲۱، رکوع ۱۵، سورۂ سجدہ، جلالین ص ۳۵۰)

③ ﴿وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾
(پارہ ۲۵، رکوع ۱۳، سورۂ زخرف، جلالین ص: ۴۱۰)

④ ﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾
(پارہ ۲۶، رکوع ۲، سورۂ احقاف، جلالین ص ۴۱۷)

⑤ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ﴾
(پارہ ۱۷، رکوع ۱۳، سورۂ حج، جلالین ص ۲۸۴)

⑥ ﴿لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ﴾
(پارہ ۲۱، رکوع ۶، سورۂ روم، جلالین ص ۳۴۴)

⑦ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ (پارہ ۳۰، رکوع ۱۰، سورۂ بروج، جلالین ص ۴۹۵)

تشریحِ تعارض

پہلی چار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ اعمال کی وجہ سے ہوگا

کیونکہ بما کنتم تعلمون اور بما کانوا یعملون میں باءِ سببیہ لائی گئی ہے جس کا مابعد ماقبل کے لئے سبب ہوتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے اعمال سبب ہیں دخول جنت کا اور اخیر کی تین آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ محض اللہ کے فضل و کرم سے ہوگا اعمال کی وجہ سے نہیں، اس لئے کہ آیت نمبر ۳ و ۴ میں فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ اور لَھُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ میں فاءِ سببیہ نہیں ہے، اگر یوں کہا جاتا فَفِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ اور فَلَھُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ الخ تو فاءِ سببیہ سے اس بات پر دلالت ہوتی کہ اعمال سبب ہیں دخول جنت کا، کیونکہ فاءِ سببیہ کا ماقبل مابعد کے لئے سبب ہوتا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں آیت نمبر ۵ سے اگلی آیت والذین کفروا و کذبوا بآیاتنا فاولئک لھم عذاب مھین میں فاولئك پر فاءِ سببیہ لا کر اس طرف اشارہ ہے کہ کفر و تکذیب سبب ہے عذاب مھین کا، پس فی جنت النعیم اور لھم جنت تجری میں فاءِ سببیہ کا ترک اس بات پر دال ہے کہ دخول جنت اعمال کے سبب سے نہیں بلکہ محض حق تعالیٰ کے فضل سے ہوگا، صاحب جلالین نے فی جنت النعیم کے بعد فضلا من اللّٰہ کا اضافہ کر کے اسی طرف اشارہ کیا ہے اور آیت نمبر ۲ میں تو من فضلہ مصرح ہے کہ ایمان و اعمال صالحہ والوں کو حق تعالیٰ اپنے فضل سے بدلہ عطا فرمائیں گے، حدیث صحیح سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

﴿عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم: "لن یُدخِل احداً عملُہ الجنۃ." قیل: ولا انت یارسول اللّٰہ؟ قال: "ولا انا الا ان یتغمدنی اللّٰہ تعالیٰ منہ بفضل ورحمۃ."﴾ (رواہ البخاری ومسلم)

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی شخص کا عمل اس کو جنت میں داخل نہیں کرے گا (بلکہ جنت میں ہر شخص محض اللہ کے فضل سے جائے گا۔)

پوچھا گیا یا رسول اللہ! آپ بھی نہیں؟ ارشاد فرمایا میں بھی نہیں مگر یہ کہ حق تعالیٰ اپنے فضل و رحمت میں مجھ کو چھپا لیں۔"

خلاصہ یہ ہوا کہ پہلی چار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین جنت میں اپنے ایمان و اعمال کے سبب سے داخل ہوں گے اور اخیر کی تین آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں دخلہ محض اللہ کے فضل و کرم سے ہوگا، اعمال کے سبب سے نہیں، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے چار جواب ہیں:

❶ اگرچہ جنت میں داخلہ اعمال کی وجہ سے ہوگا مگر اعمال کی توفیق حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے ملتی ہے، پس سبب حقیقی دخول جنت کا حق تعالیٰ کا فضل ہے اور سبب عادی و ظاہری اعمال ہیں، پہلی چار آیات میں سبب ظاہری و عادی مراد ہے اور اخیر کی تین آیات میں اور حدیث میں سبب حقیقی کا بیان ہے۔ فلا تعارض بینہما۔ (روح المعانی، تفسیر قرطبی)

❷ پہلی چار آیات میں باء سببیہ نہیں ہے بلکہ مقابلہ کے لئے ہے یعنی ادخلوا الجنة فی مقابلة اعمالکم اعمال کے مقابلہ اور بدلہ میں حق تعالیٰ اپنے فضل سے جنت عطا فرما دیں گے جیسے دوسری جگہ ارشاد ہے "اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّةَ" اللہ نے مؤمنین سے ان کے جان و مال کو خرید لیا ہے اس چیز کے بدلہ میں کہ ان کو جنت ملے گی، یعنی تم لوگ اپنا جان و مال حق تعالیٰ کے حوالہ کر دو، اس کی اطاعت میں لگا دو، اس کے مقابلہ اور بدلہ میں اپنا فضل یہ فرمائیں گے کہ تم کو جنت عطا فرما دیں گے۔ تعارض کا جو شبہ پیدا ہوا تھا وہ باء کے سببیہ کی وجہ سے ہوا تھا اور جب باء سببیہ نہیں رہی تو تعارض بھی نہ رہا۔ (روح المعانی و حاشیہ جلالین)

۳ باء ملابست کے لئے ہے کہ اپنے ایمان و اعمال کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ اس صورت میں بھی باء سببیہ نہ ہونے کی وجہ سے تعارض مرتفع ہو گیا۔ (حاشیہ جلالین)

۴ دخول جنت تو حق تعالیٰ کے فضل سے ہوگا اور ترقی درجات اعمال کے سبب سے ہوگی، پس پہلی چار آیات رفع درجات سے متعلق ہیں یعنی اُدْخُلُوا دَرَجَاتِ الْجَنَّةِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ اور اخیر کی تینوں آیات نفس دخول جنت پر محمول ہیں۔ فلا تعارض۔ (حاشیہ جلالین)

کفار کے لئے ایمان لانے سے کیا چیز مانع ہے؟

پارہ نمبر ۱۵

① ﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾ (پارہ ۱۵، سورۂ بنی اسرائیل (الاسراء)، جلالین ص ۲۳۸) ◆

② ﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (پارہ ۱۵، ۲۰، سورۂ کہف، جلالین ص ۲۴۷، ۲۴۸)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ لوگوں کے پاس جب ہدایت آگئی تو ان کو ایمان لانے سے صرف اس چیز نے روک رکھا ہے کہ وہ یوں کہتے ہیں کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟ یعنی ان کا اعتقاد یہ ہوگیا ہے کہ رسول بشر نہیں ہوسکتا، رسول تو کوئی فرشتہ ہونا چاہئے صرف یہ اعتقاد باطل ان کے ایمان لانے سے مانع بن رہا ہے، اگر یہ عقیدہ نہ ہوتا تو وہ ایمان لے آتے۔ اس آیت میں نفی واستثناء کے ذریعہ مانع عن الایمان کو منحصر کردیا گیا ہے اعتقاد مذکور میں، اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ ان کو ایمان واستغفار سے صرف اس چیز نے روک رکھا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو پچھلی امتوں کی طرح ہلاک کرنے کا ارادہ کرلیا ہے، اگر حق تعالیٰ یہ ارادہ نہ فرماتے تو یہ لوگ ایمان لے آتے۔ "اَن تاتیھم" سے پہلے "ارادۃ اللّٰہ" محذوف ہے "ای وماصنع الناس ان یؤمنوا الا ارادۃ اللّٰہ ان تاتیھم سنۃ الاولین" اس

آیت میں مانع عن الایمان کو منحصر کیا گیا ہے حق تعالیٰ کے ارادۂ مذکور میں، پس ان دونوں آیتوں میں تعارض ہو رہا ہے اس لئے کہ کسی شئے کو کسی شئے میں منحصر کرنا ماعدا کی نفی کو مستلزم ہوتا ہے، پس جب آیت اولیٰ میں یہ کہا گیا کہ مانع عن الایمان صرف ان کا اعتقادِ مذکور ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے علاوہ اور کوئی مانع نہیں ہے حتیٰ کہ حق تعالیٰ کا ارادۂ مذکورہ بھی مانع نہیں ہے اور دوسری آیت میں یہ فرمایا کہ مانع عن الایمان صرف حق تعالیٰ کا ارادۂ مذکورہ ہے اور کوئی مانع نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا اعتقاد مذکور مانع نہیں، پس دونوں مانع میں سے ہر ایک کی نفی بھی ہو رہی ہے اور اثبات بھی۔ وھذا ھو التعارض فافھم۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ آیت اولیٰ میں مانع عادی وظاہری مراد ہے اور آیت ثانیہ میں مانع حقیقی مراد ہے مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے سے ظاہری اور عادی مانع تو صرف ان کا یہ اعتقاد ہے کہ بشر رسول نہیں ہوسکتا اور حقیقی مانع صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو پہلی امتوں کی طرح ہلاک کرنے کا ارادہ اور فیصلہ کر لیا ہے، فلذا اختلف المانعان انتفع التعارض۔ (روح المعانی ملخصاً)

کفار کو قیامت کے روز اعمیٰ، ابکم، اصم بنا کر اٹھایا جائے گا یا بصیر و ناطق و سامع؟

پارہ نمبر: ۱۵، ۱۶، ۱۸، ۲۵، ۲۶

آیات

① ﴿وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عُمْيًا وَبُكْمًا وَصُمًّا﴾

(پارہ:۱۵، رکوع:۱۱، سورۂ بنی اسرائیل (الاسراء)، جلالین ص:۲۳۶)

② ﴿وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنتُ بَصِيرًا﴾ (پارہ ۱۶، رکوع ۱۶، سورۂ طٰہٰ، جلالین ص:۲۶۸، ۲۶۹)

③ ﴿وَرَأَى الْمُجْرِمُونَ النَّارَ فَظَنُّوا أَنَّهُم مُّوَاقِعُوهَا﴾

(پارہ:۱۵، رکوع:۹، سورۂ کہف، جلالین ص:۲۴۷)

④ ﴿إِذَا رَأَتْهُم مِّن مَّكَانٍ بَعِيدٍ سَمِعُوا لَهَا تَغَيُّظًا وَزَفِيرًا﴾

(پارہ ۱۸، رکوع ۱۷، سورۂ فرقان، جلالین ص ۳۰۳)

⑤ ﴿وَإِذَا أُلْقُوا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِينَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُورًا﴾

(پارہ ۱۸، رکوع ۱۷، سورۂ فرقان، جلالین ص ۳۰۳)

⑥ ﴿وَتَرَاهُمْ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا خَاشِعِينَ مِنَ الذُّلِّ يَنظُرُونَ مِن طَرْفٍ خَفِيٍّ﴾ (پارہ ۲۵، رکوع ۶، سورۂ شوریٰ، جلالین ص ۴۰۴)

⑦ ﴿لَّقَدْ كُنتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ﴾ (پارہ ۲۶، رکوع ۱۶، سورۂ ق، جلالین ص ۴۳۰)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ قیامت کے دن کفار کو ان کے چہروں کے بل اندھا، گونگا، بہرا بنا کر میدانِ محشر میں اکٹھا کریں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار قیامت کے روز میدانِ محشر میں اندھے، گونگے، بہرے ہوں گے، اسی طرح آیت نمبر ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کو نابینا بنا کر اٹھایا جائے گا، وہ کہے گا اے رب! میں تو بصیر تھا، تو نے مجھے اندھا کیوں بنا دیا؟" اور آیت نمبر ۳ میں ہے کہ مجرمین جہنم کو دیکھیں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار قیامت کے دن اندھے نہیں ہوں گے بلکہ بینا اور بصیر ہوں گے، آیت نمبر ۴ میں ہے کہ جب جہنم ان کو دور سے دیکھے گی تو یہ لوگ جہنم کے غضب اور جوش و خروش کی آواز سنیں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار بہرے نہیں ہوں گے بلکہ سماعت والے ہوں گے، اور آیت نمبر ۵ میں ہے کہ جب ان کے ہاتھوں کو گردنوں پر باندھ کر جہنم کی تنگ کوٹھڑی میں ڈالا جائے گا تو یہ لوگ ہلاکت کو پکاریں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ گونگے نہیں ہوں گے اور چھٹی آیت میں ہے کہ آپ کفار کو دیکھیں گے جب ان کو جہنم کے سامنے لایا جائے گا تو ذلت کے مارے ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی اور یہ جہنم کی طرف نگاہ چراتے ہوئے دیکھیں گے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفار قیامت میں اندھے نہیں ہوں گے بلکہ بینا ہوں گے، اسی طرح آیت نمبر ۷ میں ہے کہ کافر سے قیامت کے روز کہا جائے گا کہ تو دنیا میں غفلت میں پڑا ہوا تھا، آج ہم نے تیری غفلت کا پردہ تجھ سے دور کر دیا، پس تیری نگاہ آج بڑی تیز ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفار اندھے نہیں بلکہ بینا ہوں گے، پس اخیر کی پانچ آیات پہلی دو آیتوں کے بظاہر معارض ہو رہی ہیں۔

دفعِ تعارض

اولاً عمی اور بصارت کے تعارض کے جوابات دیے جاتے ہیں، اس کے سات

جوابات یہ ہیں:

1 اختلاف زمان پر محمول ہے، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ کافر کو اولاً بصیر اٹھایا جائے گا، پھر اندھا بنا دیا جائے گا، مطلب یہ ہے کہ قبروں سے اٹھتے وقت تو کفار بینا ہوں گے مگر جب محشر کی طرف جائیں گے تو اندھے ہو جائیں گے، اس پر کافر کہے گا اے خدا! میں تو قبر سے اٹھتے وقت بینا تھا، تو نے مجھے اندھا کیوں کر دیا؟! (روح المعانی)

2 ایک احتمال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اختلاف زمان پر محمول ہے مگر صورت برعکس ہے کہ اولاً تو کفار اندھے ہوں گے، پھر ان کو بینا کر دیا جائے گا جس سے وہ جہنم اور اہوال قیامت کا مشاہدہ کریں گے اور "رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْ أَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا" کا مطلب وقد کنت بصیراً فی الدنیا ہے، یعنی جس وقت قبروں سے اندھے اٹھیں گے تو کہیں گے ہم تو دنیا میں بینا تھے ہمیں اندھا کیوں بنا دیا؟

3 اختلاف زمان و مکان پر محمول ہے، یعنی میدان محشر میں اندھے ہوں گے اور جب جہنم میں داخل ہوں گے تو بینا ہو جائیں گے، اپنی حالت اور اپنے محل عذاب کو دیکھیں گے۔ (بیضاوی)

4 حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ انہ لا یری شیئا الا النار جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ آیت میں عمی سے عمی اضافی مراد ہے، یعنی جہنم کے علاوہ باقی تمام چیزوں کو دیکھنے سے اندھے ہوں گے مگر یہ حالت ان کی یوم قیامت کے بعض اوقات میں رہے گی، اس کے بعد وہ مطلق بینا بنا دیئے جائیں گے کہ ہر چیز کو دیکھیں گے ورنہ تو وہ اعمال ناموں کو کیسے پڑھ پائیں گے؟ حق تعالیٰ قیامت کے دن کافر سے فرمائیں گے "اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا" اور قراءتِ کتاب کا حکم دینا اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب کہ اس کو بینا بنا دیا جائے۔ معلوم ہوا کہ کافر بعد میں بینا ہو جائے گا۔ (روح المعانی، تفسیر کبیر)

❺ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ اعمٰی سے مراد اعمی عن الحجة ہے یعنی وہ حجت اور دلیل کے اعتبار سے اندھے ہوں گے، ان کے پاس ایسی کوئی حجت و دلیل نہ ہوگی جس کو پیش کر کے وہ نجات پاسکیں، وہ کہیں گے "یا خدا! ہم تو دنیا میں بڑی حجتیں اور دلیلیں پیش کیا کرتے تھے، آپ نے ہمیں حجتوں سے اندھا کیوں کردیا؟ ہمیں کوئی حجت نظر ہی نہیں آرہی ہے۔" یہ توجیہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، مقاتل رحمۃ اللہ علیہ، ضحاک رحمۃ اللہ علیہ، اور ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ (روح المعانی)

❻ اعمی القلب والبصیرة مراد ہے، یعنی وہ آنکھوں سے اندھے نہیں ہوں گے بلکہ قلب اور بصیرت کے اندھے ہوں گے، ابراہیم بن عرفہ اسی کو اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جہاں بھی مقام مذمت میں عمٰی کا ذکر کیا ہے اس سے مراد عمی القلب ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ" مگر ابن عطیہ نے اس توجیہ کو یہ کہہ کر رد کردیا ہے کہ بصیرت تو کافر کی دنیا میں بھی مفقود ہوتی ہے، لہٰذا اس کا رب سے "لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنتُ بَصِيرًا" کہنا صحیح نہیں ہوگا، معلوم ہوا کہ اعمی البصیرة مراد نہیں ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ جنہوں نے اعمی القلب والبصیرة مراد لیا ہے ان کے نزدیک بصیرت سے مراد بصیرت ایمانی نہیں ہے بلکہ حجت و دلیل ہی مراد ہے۔ مطلب یہ ہوگا "وقد كنت عالما بحجتي بصيراً بها احاج بها عن نفسي في الدنيا" کہ میں تو دنیا میں اپنی حجت کا دانا و بینا تھا، اپنی طرف سے حجتیں اور دلیلیں پیش کیا کرتا تھا، پس کوئی اشکال نہیں کیونکہ کفار کی جو بصیرت دنیا میں مفقود ہوتی ہے وہ بصیرت ایمانی ہے۔ (روح المعانی)

❼ اعمٰی سے مراد متحیر ہے کہ کافر قیامت کے دن حیران و پریشان ہوگا، عذاب سے بچنے کی کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہ آسکے گی جیسا کہ اندھا آدمی کسی موذی جانور کو دفع

کرنے اور اس سے بچنے کی تدبیر کرنے میں حیران و پریشان ہو جاتا ہے کہ معلوم نہیں
یہ جانور کہاں اور کدھر ہے؟ کس طرح اس کو ماروں اور کس طرف کو اس سے بچوں؟
ایسے ہی کافر قیامت کے روز حیلوں اور تدبیروں سے اندھا ہوگا، وہ کہے گا خدایا، دنیا
میں مصیبتوں سے بچنے کے لئے قسم قسم کی تدبیریں کر لیا کرتا تھا، آج مجھے تدبیروں
سے اندھا کیوں کر دیا کہ کوئی تدبیر عذابِ جہنم سے بچنے کی نظر نہیں آ رہی ہے۔

(تفسیر روح المعانی)

یہ سات جوابات تو عمی اور بصیر کے درمیان تعارض کے ہوئے، اس کے بعد ابکم
و ناطق اور اصم و سامع کے درمیان تعارض کے جوابات سنئے، اس کے تین جواب ہیں

1 اختلافِ زمان پر محمول ہے، یعنی اولاً یہ لوگ معدوم الحواس، گونگے اور بہرے
ہوں گے، پھر ان کے نطق و سماعت کو لوٹا دیا جائے گا جس سے یہ لوگ بولیں گے اور
سنیں گے، ملامت کریں گے اور پکاریں گے اور جہنم کا جوش و خروش وغیرہ سنیں گے۔ ولا تعارض
بعد اختلاف الزمان۔ (روح المعانی)

2 حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ بہرے ہونے کا مطلب یہ
ہے کہ لوگ کوئی ایسی بات نہیں سن پائیں گے جس سے ان کے کانوں کو لذت و سرور
محسوس ہو اور گونگے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حجت اور دلیل کے اعتبار سے گونگے
ہوں گے کوئی ایسی حجت و دلیل بیان نہیں کر پائیں گے جو عند اللہ مقبول ہو، مطلق ہر
چیز سے صم و بکم ہونا مراد نہیں ہے، لہٰذا آیت اولیٰ اور نطق والی آیات کے معارض
نہیں ہے۔ (روح المعانی)

3 حضرت مقاتل بن سلیمان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اولاً تو یہ لوگ سامع اور
بصیر ہوں گے مگر جب ان کو چہروں کے بل جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور یہ لوگ
عذابِ جہنم سے پریشان ہو کر جہنم سے نکلنے کی درخواست کریں گے "رَبَّنَا أَخْرِجْنَا
مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظَالِمُونَ" تو حق تعالیٰ ایک مدت طویلہ کے بعد جواب دیں

گے "اِخْسَئُوْا فِیْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ" تو ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں پڑے رہو اور مجھ سے کوئی بات چیت مت کرو، اس جواب کے بعد وہ لوگ اندھے، بہرے، گونگے ہو جائیں گے، نہ کسی کو دیکھ پائیں گے، نہ کوئی بات سن پائیں گے، نہ بول پائیں گے۔
فاندفع التعارض لاختلاف الزمان۔ (روح المعانی وتفسیر قرطبی)

اصحابِ کہف نے نیند سے بیدار ہو کر کیا کہا تھا؟

پارہ نمبر ۱۵

آیات

① ﴿ قَالُوْا لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ﴾ (پارہ ۱۵، [illegible] سورۃ کہف، آیت ۱۹، [illegible])

② ﴿ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ﴾ (پارہ ۱۵، رکوع ۱۶، سورۃ کہف، آیت ۱۹، ص [illegible])

تشریحِ تعارض

اصحابِ کہف غار میں تین سو برس تک گہری نیند سونے کے بعد جب بیدار ہوئے تو ان کے سردار کسلمینا نے اپنے ساتھیوں سے معلوم کیا "کَمْ لَبِثْتُمْ" تم کتنی دیر تک سوتے رہے؟ اس کے جواب میں ساتھیوں نے جو کہا اس بارے میں حق تعالیٰ شانہ نے اصحابِ کہف کے دو مقولے ذکر کئے:

① "لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ" کہ ہم لوگ ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم نیند کی حالت میں رہے۔

② "رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ" کہ تمہارا رب تمہاری مدت لبث کو زیادہ جانتا ہے۔ ان دونوں مقولوں میں تعارض ہے کیونکہ مقولہ اولیٰ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی طرف سے مدت لبث فی حالۃ النوم کی تصریح کر دی اور مقولہ ثانیہ میں یہ ہے کہ انہوں نے مدت لبث کو حق سبحانہ کے علم پر محمول کر دیا، گویا یہ کہا کہ ہمیں معلوم نہیں خدا ہی زیادہ جانتا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں اور تجزیے کے بعد تین جواب ہو جاتے ہیں:

❶ دونوں مقولوں کے قائل جدا جدا ہیں، یعنی "قَالَ بَعْضُهُمْ لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ وَقَالَ بَعْضُهُمْ رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ" بعض نے تو کہا ہم ایک دن یا بعض دن سوئے، دوسرے بعض ساتھی بولے کہ اپنی طرف سے تعیین و تصریح کیوں کرتے ہو، حق تعالیٰ تمہاری مدت لبث کو زیادہ جانتے ہیں اور جب دو متعارض مقولوں کے قائل جدا جدا ہیں تو کوئی تعارض نہیں رہتا۔ (روح المعانی و تفسیر ابو السعود)

❷ دونوں مقولوں کے قائل تو متحد ہیں، مگر زمانہ دونوں کا مختلف ہے، پھر اختلاف زمانہ کی دو صورتیں ہیں: اول تو انہوں نے بیدار ہوتے ہی بلا تامل و غور و فکر یہ کہہ دیا "لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ" پھر کچھ تامل اور غور و فکر کے بعد کہا "رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ" دراصل وہ لوگ طلوع شمس کے وقت سوئے تھے اور تین سو برس کے بعد غروب شمس کے وقت بیدار ہوئے تھے، انہوں نے گمان کیا کہ یہ آج ہی کے دن کا غروب ہے اور غار کے اندر ہونے کی وجہ سے اور نیند کا اثر زائل نہ ہونے کی وجہ سے غروب شمس کا اچھی طرح ادراک نہ کر سکے اس لئے انہوں نے شک کے ساتھ کہا "لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ" یعنی اگر غروب شمس ہو چکا ہے تو یوم اگر نہیں ہوا ہے تو بعض یوم، پھر کچھ دیر بعد جب تامل اور غور و فکر کیا تو احساس ہوا کہ ہماری نیند عادی نیند نہیں ہوئی ہے اور یہ متعین نہیں کر سکے کہ کتنی طویل ہوئی ہے، اس لئے احتیاط اور ادبا علم باری تعالیٰ پر محمول کرتے ہوئے کہہ دیا "رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ"۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اولاً تو نیند کا اثر اور سستی زائل نہ ہونے کی وجہ سے "لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ" کہہ دیا، پھر اپنے ناخن اور بالوں کو بڑھا ہوا دیکھ کر اندازہ لگایا کہ مدت نوم طویل ہوئی ہے (جیسا کہ بعض حضرات سے منقول ہے کہ ان کے ناخن اور بال بڑھ گئے تھے) اور مقدار طول نوم متعین نہ ہونے کی وجہ سے حق تعالیٰ شانہ کے علم پر محمول کیا اور کہا "رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ"۔ خلاصہ یہ ہوا کہ مقولہ اولیٰ قبل التامل پر اور مقولہ ثانیہ بعد التامل پر محمول ہے، یا مقولہ اولیٰ قبل النظر الی طول الاظفار والشعور پر اور مقولہ ثانیہ بعد

الخمر الیہ پر محمول ہے اور جب دو متعارض مقولوں کا زمانہ مختلف ہو تو تعارض نہیں رہتا۔

(روح المعانی وجمل)

مگر ان دو جوابوں میں سے جواب اول چند وجوہ سے راجح ہے:

① ایک تو اس وجہ سے کہ قَالُوْا رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ کو جملہ مستانفہ لایا گیا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں کے قائل جدا جدا ہیں، اگر دونوں کے قائل متحد ہوتے تو جملہ ثانیہ کو جملہ اولیٰ پر ثُمَّ کے ذریعہ عطف کر کے ثُمَّ قَالُوْا الخ کہنا چاہئے تھا کہ پہلے تو انہوں نے یہ کہا پھر یہ کہا۔

② دوسرے اس وجہ سے کہ اگر جملہ ثانیہ بھی جملہ اولیٰ کے قائلین کا مقولہ ہوتا تو صیغہ تکلم کے ساتھ "رَبُّنَا اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْنَا" ہونا چاہئے تھا، رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ صیغہ خطاب کے ساتھ کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ان میں سے بعض کا مقولہ ہے جو دوسرے بعض ساتھیوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

③ تیسری وجہ ترجیح یہ ہے کہ اس صورت میں اصحاب کہف کی دو جماعتیں ہو جائیں گی، ایک مدت لبث کو قلیل سمجھ کر لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ کہنے والی دوسری مدت لبث کو طویل سمجھ کر رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ کہنے والی، یہی یہ آیت، آیت سابقہ "ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا" کے موافق ہو جائے گی جس میں یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے اصحاب کہف کو بیدار کیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ ان کی دو جماعتوں میں سے کس جماعت نے مدت لبث کو زیادہ یاد رکھا ہے، اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ جس جماعت نے "لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ" کہا وہ مدت لبث کو ضبط نہیں کر سکی جنہوں نے مدت کو طویل سمجھ کر "رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ" کہا انہوں نے مدت لبث کو زیادہ یاد رکھا ہے اور جواب ثانی میں (یعنی جب کہ دونوں مقولوں کا قائل متحد ہو) اصحاب کہف کی یہ دو جماعتیں نہیں ہوتیں جس کی بناء پر یہ آیت، آیت سابقہ مذکورہ کے موافق نہیں رہتی، لہٰذا جواب اول راجح ہے۔ (تفسیر ابو السعود)

اہل جنت کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے یا چاندی کے یا موتیوں کے؟

پارہ نمبر: ۱۵، ۱۷، ۲۲، ۲۹

آیات

① ﴿يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ﴾

(پارہ:۱۵، رکوع:۱۶، سورۂ کہف، جلالین ص:۲۴۴) ✦

② ﴿يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا﴾

(پارہ:۱۷، رکوع:۱۰، سورۂ حج، جلالین ص:۲۸۰)

③ ﴿يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ﴾

(پارہ:۲۲، رکوع:۱۶، سورۂ فاطر، جلالین ص:۳۶۶) ✦

④ ﴿وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا﴾

(پارہ:۲۹، رکوع:۱۹، سورۂ دہر، جلالین ص:۴۸۴)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور آیت نمبر ۲، ۳ میں ہے کہ سونے اور موتیوں کے کنگن اور آیت نمبر ۴ میں ہے کہ چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے، ان چاروں آیتوں میں تعارض ظاہر ہے۔

دفع تعارض

اولاً بطور تمہید یہ سمجھئے کہ آیت ثانیہ میں لفظ لُؤْلُؤًا میں دو قراءت ہیں، ایک نصب

کے ساتھ، دوسری جر کے ساتھ، اگر نصب پڑھا جائے تو اس کا عطف اساور کے محل پر ہوگا "اساور" میں حرف جار کا مدخول ہونے کی وجہ سے لفظاً مجرور ہے، اگرچہ غیر منصرف ہونے کی وجہ سے نصب آگیا ہے مگر لفظاً اس کو مجرور ہی کہا جائے گا اور "یحلون" کا مفعول ہونے کی وجہ سے محلاً منصوب ہے، اساور کے محل پر عطف کرتے ہوئے لُؤْلُؤًا بھی منصوب ہوگا اور تقدیری عبارت اس طرح ہوگی "یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَیُحَلَّوْنَ لُؤْلُؤًا" اور ترجمہ یہ ہوگا کہ ان کو جنت میں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور موتی پہنائے جائیں گے۔ پھر موتی پہنائے جانے میں دو احتمال ہیں یا تو موتیوں کے کنگن یا موتیوں کے ہار، اور اگر لؤلؤ مجرور پڑھا جائے تو ذھب پر عطف ہوگا اور ترجمہ یہ ہوگا کہ ان کو سونے اور موتیوں کے بنے ہوئے کنگن پہنائے جائیں گے، یعنی سونے کے کنگن موتیوں سے جڑے ہوئے ہوں گے جیسا کہ صاحب جلالین نے بان یرصع اللؤلؤ بالذھب کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے۔

اس تمہید کے بعد تعارض کی تشریح کی جاتی ہے، جس کی تقریر اس طرح ہے کہ اگر یہ مراد لیا جائے کہ موتیوں کے کنگن نہیں ہوں گے بلکہ موتیوں کے ہار یا موتی سونے پر جڑے ہوئے ہوں گے تو تعارض صرف اساور من فضة اور اساور من ذھب میں رہ جاتا ہے اور اگر موتیوں کے مستقل کنگن مراد لئے جائیں تو تعارض تینوں میں ہو جاتا ہے، اساور من ذھب، اساور من فضة، اساور من لؤلؤ، صورت اول یعنی ذہب اور فضة میں تعارض کے وقت اس کے سات جواب ہیں:

❶ اختلاف اشخاص پر محمول ہے، یعنی سونے کے کنگن تو اہل جنت کے لئے اور چاندی کے کنگن ان کے خدام کے لئے ہوں گے۔

❷ اختلاف اشخاص ہی پر محمول ہے مگر اس کی صورت یہ ہے کہ چاندی کے کنگن بچوں کے لئے اور سونے کے کنگن عورتوں کے لئے۔

❸ اختلاف زمان پر محمول ہے، کبھی سونے کے کنگن، کبھی چاندی کے

۴ تفاوت اعمال پر مدار ہے، جس کا جیسا عمل ہوگا ویسے ہی کنگن پہنائے جائیں گے بعض کو سونے کے بعض کو چاندی کے۔

۵ تفاوت رغبت پر مدار ہوگا یعنی اہل جنت کی رغبت اور خواہش کے مطابق معاملہ ہوگا، جو سونے کے پہننا چاہے گا اس کو سونے کے، جو چاندی کے پسند کرے گا اس کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے "وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُوْنَ."

۶ جمعیت مراد ہے، ہر جنتی کو دو دو کنگن ملیں گے، ایک چاندی کا، ایک سونے کا، جو موتیوں سے جڑا ہوگا۔

۷ جمعیت ہی مراد ہے مگر اس کی صورت یہ ہے کہ ہر جنتی کو تین تین کنگن ملیں گے، ایک چاندی کا، ایک خالص سونے کا، ایک موتی سے جڑا ہوا سونے کا۔

(روح المعانی، جمل)

صورت ۲: یعنی ذہب، فضہ اور لؤلؤ تینوں میں تعارض ہونے کی صورت میں پانچ جواب ہیں:

۱ جمعیت مراد ہے، ہر جنتی کو تین تین کنگن ملیں گے۔ ایک سونے کا، دوسرا چاندی کا، تیسرا موتیوں کا بنا ہوا۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے "ان اهل الجنة يحلون اسورة من ذهب ولؤلؤ و فضة هي اخف عليهم من كل شيء إنما هي نور." (اخرجہ عبد بن حمید وابن منذر)

تذکرۃ القرطبی میں ہے: يسور المؤمن في الجنة بثلثة اسورة: سوار من ذهب، وسوار من فضة وسوار من لؤلؤ۔

۲ جمعیت ہی مراد ہے مگر صورت وہ ہے جو سعید بن المسیب سے منقول ہے کہ ہر ایک کو چھ چھ کنگن پہنائے جائیں گے، دو سونے کے، دو چاندی کے، دو موتیوں کے (غالباً تین دائیں ہاتھ میں پہنیں گے اور تین بائیں ہاتھ میں)۔

٣ اختلافِ زمان پر محمول ہے تارۃً من الذھب وتارۃ من الفضۃ وتارۃ من اللؤلؤ کہا ہے۔

٤ زمانہ کے اعتبار پر مدار ہوگا کہا ہے۔

٥ مادہ کے قیمت پر مدار ہوگا کہا ہے۔ (روح المعانی وغیرہ)

بنی اسرائیل کے دو بھائیوں میں سے کافر بھائی کو دو باغ دیئے گئے تھے یا ایک؟

پارہ نمبر: ۱۵

آیات

① ﴿جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ﴾

(پارہ ۱۵، رکوع ۱۷، سورۂ کہف جلالین ص ۲۴۳) ✦

② ﴿وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ﴾ (پارہ ۱۵، رکوع ۱۷، سورۂ کہف جلالین ص ۲۴۳)

تشریحِ تعارض

حق تعالیٰ شانہ نے قوم بنی اسرائیل میں سے دو بھائیوں کا ایک قصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا "جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ" کہ ہم نے ان میں سے ایک کو انگوروں کے دو باغ عطا فرمائے تھے، جن کے بعد ان باغوں کے اوصاف ذکر کئے، پھر جب قصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اپنے بھائی کو اپنے باغوں کی رونق و زینت دکھلانے کے لئے لے گیا تو اس کے لئے حق تعالیٰ نے وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ صیغۂ مفرد ذکر کیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک باغ تھا اور آیت اولیٰ میں صیغۂ تثنیہ کے ساتھ جَنَّتَيْنِ فرمایا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو باغ تھے، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے چھ جواب ہیں:

❶ جس طرح الف لام استغراقی ہوتا ہے اسی طرح اضافت بھی استغراقی ہوتی ہے

یہاں جنت کی اضافت "ہ" ضمیر کی طرف استغراقی ہے، مطلب یہ ہے کہ اپنے تمام باغوں (دونوں باغوں) میں داخل ہوا، اس کے تمام باغ دو ہی باغ تھے۔

(روح المعانی ملخصاً)

۲ دونوں باغ متصل تھے، اتصال کی وجہ سے ان دونوں کو ایک شمار کر کے جنته کہہ دیا گیا۔ (تفسیر ابو السعود)

۳ دونوں باغوں میں دخول چونکہ ایک وقت میں نہیں ہو سکتا، بلکہ یکے بعد دیگرے ہی ہو سکتا ہے اس لئے صیغہ مفرد استعمال کیا، مطلب یہ ہے کہ پہلے ایک باغ دکھلایا پھر دوسرا، یعنی دخل جنته بعد جنة ایک کے ذکر پر اکتفا کر لیا گیا مراد دونوں ہیں۔

(تفسیر ابو السعود)

۴ باغوں کی تعداد بیان کرنا مقصود ہی نہیں ہے اس لئے صیغہ تثنیہ کا استعمال ضروری نہیں سمجھا گیا، صیغہ مفرد کے ساتھ جنته کہہ دیا۔ (تفسیر ابو السعود)

۵ جنت سے مراد باغ نہیں ہے، بلکہ جنت دنیا مراد ہے، کافر[1] کو جو مال و متاع دنیا میں ملتا ہے بس وہی اس کی جنت ہوتی ہے، آخرت کی جنت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے تو جنته کہہ کر اس طرف اشارہ کیا گیا اس کے پاس جو دو باغ اور دیگر اموال و اسباب تھے بس یہی اس کی جنت تھی، وہ اپنے مومن بھائی کو اپنی جنت دکھلانے لے گیا۔ (تفسیر کبیر)

۶ اس کو حق تعالیٰ نے ایک ہی باغ عطا فرمایا تھا، پس آیت نمبر ۳ میں تو کوئی اشکال نہیں، البتہ آیت نمبر ۲ میں جنتین اس لئے فرمایا کہ اس باغ کے درمیان ایک نہر جاری تھی، نہر کے دونوں طرف باغ تھا اس لئے اس کو دو باغوں سے تعبیر کر دیا گیا جیسا کہ

(۱) جس بھائی کو دو باغ دیئے گئے تھے وہ کافر تھا جس کا نام فطروس یا قطفیر بتایا گیا ہے اور دوسرا بھائی مومن تھا جس کا نام بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہودا اور بقول حضرت مقاتل تملیخا تھا جس نے اپنا سارا مال اللہ کے راستے میں خرچ کر دیا تھا اور دنیا کے اعتبار سے فقیر و محتاج ہو گیا تھا۔

(روح المعانی)

ابن ابی حاتم نے امام سدی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے مگر یہ توجیہ ضعیف ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے **وَفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا** جنتوں کے ذکر کے بعد فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو مستقل باغ تھے۔ ان دونوں کے درمیان نہر جاری تھی۔ اگر یہ باغ ایک ہوتا اور درمیان میں نہر جاری ہو جانے کی وجہ سے دو باغ ہو گئے تھے تو اس صورت میں یوں کہا جاتا ”جعلنا لاحدهما جنة فجرنا خلالها نهرا فصارتا جنتين۔“

(روح المعانی)

قیامت کے روز پہاڑوں کا کیا حال ہوگا؟

پارہ نمبر: ۱۵، ۱۶، ۲۰، ۲۷، ۲۹، ۳۰

آیاتِ قرآنی

① ﴿وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً﴾

(پارہ: ۱۵ رکوع: ۱۸ سورۃ کہف جلالین ص: ۲۴۹)

② ﴿وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ﴾

(پارہ: ۲۰ رکوع: ۳ سورۃ نمل جلالین ص: ۳۲۵)

③ ﴿وَتَسِيرُ الْجِبَالُ سَيْرًا﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۳ سورۃ طور جلالین ص ۴۳۵)

④ ﴿وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا﴾ (پارہ: ۳۰ رکوع: ۱ سورۃ نبا جلالین ص: ۴۸۷)

⑤ ﴿وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ﴾ (پارہ ۳۰ رکوع: ۶ سورۃ تکویر جلالین ص: ۴۹۱) ✦

⑥ ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا﴾

(پارہ: ۱۶ رکوع: ۱۵ سورۃ طٰہٰ جلالین ص: ۲۶۷)

⑦ ﴿وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۲۱ سورۃ مرسلٰت جلالین ص: ۴۸۵) ✦

⑧ ﴿وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتْ هَبَاءً مُنْبَثًّا﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۱۳ سورۃ واقعہ جلالین ص: ۴۴۶) ✦

⑨ ﴿وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً﴾

(پارہ: ۲۹ رکوع: ۵ سورۃ حاقہ جلالین ص: ۴۷۲ و ۴۷۳) ✦

⑩ ﴿وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۷ سورۃ معارج جلالین ص ۴۷۳)

⑪ ﴿وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ﴾

(پارہ: ۳۰ رکوع: ۲۶ سورۃ قارعہ جلالین ص: ۵۰۵) ✦

(۱۲) ﴿وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا﴾ (پارہ ۲۹، رکوع ۱۳، سورۂ مزمل، جلالین ص: ۴۷۸)

تشریحِ تعارض

قیامت کے روز پہاڑوں کا کیا حال ہوگا اس بارے میں یہ آیات متعارض ہیں، یہ آیات آٹھ قسم کے مضامین پر مشتمل ہیں:

(۱) مرور (چلنا)، (۲) تسییر (چلانا)، (۳) نسف (اڑانا)، (۴) بس (ریزہ ریزہ کرنا یا ہانکنا)، (۵) دک (ٹکڑے ٹکڑے کردینا)، (۶) هباء منبثاً (بکھرا ہوا غبار)، (۷) عهن (روئی)، (۸) كثيباً مهيلا (بہنے والے ریت کا ٹیلہ)

آیت نمبر ۱ تا ۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں کو چلایا جائے گا، جن میں سے آیت نمبر ۲ میں یہ ہے کہ بادلوں کی طرح چلتے ہوئے ہوں گے۔ اس کے بعد آیت نمبر ۶ و ۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ اڑا دیا جائے گا۔ اس کے بعد آیت نمبر ۸ میں وبست الجبال کہا گیا ہے، بُسَّتْ کی تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ومجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فُتِّتْ (ریزہ ریزہ کردیا جائے گا) کے ساتھ کی ہے اور بعض نے سیقت کے ساتھ کی ہے بمعنی ہانکنا، چلانا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کردیا جائے گا یا ہانکا جائے گا۔ "بست" کی دوسری تفسیر کی صورت میں یہ پہلی پانچ آیات کے مضمون کے موافق ہوجائے گی۔

نیز اس آیت میں اس کے ساتھ ساتھ هباء منبثاً کہا گیا ہے، جس کے معنی بکھرے ہوئے غبار کے آتے ہیں، پھر آیت نمبر ۹ میں ہے کہ ٹکڑے ٹکڑے کردیئے جائے گا، یہ بست کی تفسیر اولیٰ فتت کے موافق ہے، اس کے بعد آیت نمبر ۱۰ و ۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ دھنی ہوئی روئی کے گالے کی طرح ہوجائیں گے، اس کے بعد آیت نمبر ۱۲ میں ہے کہ بہنے والے ریت کے ٹیلہ کی طرح ہوجائیں گے، پس اس طرح ان آیت میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

قیامت کے دن پہاڑوں پر یکے بعد دیگرے یہ سب احوال مذکورہ طاری ہوں گے جن کو ان آیات میں متفرق طور پر ذکر کر دیا گیا ہے، اولاً تو پہاڑوں کو زمین سے اکھاڑ کر فضا میں لے جایا جائے گا، وہاں پر ہوائیں ان کو اڑاتی پھریں گی، یہ بادلوں کی طرح چلتے ہوئے اور اڑتے ہوئے ہوں گے اور روئی کے گالوں کی طرح دکھائی دیں گے، جس طرح اڑتے ہوئے بادل روئی کے گالوں کی طرح معلوم ہوا کرتے ہیں، پھر ان کو زمین پر گرا کر ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا، ایسا محسوس ہوگا جیسے کہ ریت کا ٹیلہ بہنے لگا ہو، اس کے بعد ان کو ہباء منثورا (بکھرے ہوئے غبار) کی طرح اڑا دیا جائے گا، پس ان آیات میں کوئی تعارض نہیں ہے، حضرت حسن اور دیگر محققین حضرات سے اسی طرح منقول ہے۔ (روح المعانی)

قیامت کے دن کفار کے اعمال تولے جائیں گے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱۶، ۱۸

آیات

① ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا﴾ (پ: ۱۶، ع: ۳، سورۂ کہف، جلالین ص: ۲۵۳)

② ﴿وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ﴾ (پارہ: ۱۸، ع: ۶، سورۂ مؤمنون، جلالین ص: ۲۹۳)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ میں فرمایا کہ ہم کفار کے لئے وزن قائم نہیں کریں گے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کفار کے اعمال کو تولا نہیں جائے گا اور آیت نمبر ۲ میں ارشاد ہے کہ جن کے ترازو کے پلے ہلکے ہوں گے، یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے کو خسارہ میں ڈال دیا، یہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے اعمال تولے جائیں گے۔ آیت اولیٰ میں اعمالِ کفار کے وزن کا اثبات اور آیت ثانیہ میں وزن کی نفی ہے، بظاہر دونوں آیتوں میں تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ میں مطلق وزن کی نفی مراد نہیں ہے بلکہ وزن نافع کی نفی مقصود ہے۔

یعنی "فلا نقیم لھم یوم القیامۃ وزناً نافعاً" مطلب یہ ہے کہ ان کے اعمال کا وزن تو کیا جائے گا مگر اس وزن سے ان کو کوئی نفع نہیں پہنچے گا کیونکہ کفار نے ثواب کی خاطر جو اعمال حسنہ دنیا میں کیے وہ قبولیت کی شرط یعنی ایمان نہ ہونے کی وجہ سے بے کار ہو جائیں گے کہ دیکھنے میں تو وہ اعمال بڑے بڑے نظر آئیں گے مگر اندر سے کھوکھلے اور خالی ہوں گے، جب ترازو کے پلہ میں ان کو رکھا جائے گا تو ان کی وجہ سے پلہ بھاری نہیں ہوگا بلکہ ہلکا ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ اعمال کے وزن سے صاحب اعمال کو نفع اسی وقت ہوگا جب کہ اعمال حسنہ کا پلہ بھاری ہو جیسا کہ ارشاد ہے "فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" اور جب ان لوگوں کا پلہ ہلکا رہے گا تو ان کو کوئی نفع نہیں پہنچے گا بلکہ یہ لوگ خسارہ اور نقصان میں رہیں گے، اسی کو آیت میں فرمایا "وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ" خلاصہ یہ ہوا کہ نفی وزن نافع کی ہے اور ثبوت وزن غیر نافع کا ہے، جس کی نفی ہے اس کا ثبوت نہیں، جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (جلالین وغیرہ)

❷ آیت اولیٰ میں وزن قائم نہ کرنے سے تولنے کی نفی مقصود نہیں ہے بلکہ کفار کی توہین اور تحقیر شان مراد ہے، یعنی آیت شریفہ میں وزن اعمال یا عدم وزن اعمال کو بیان کرنا مقصود ہی نہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ قیامت کے دن ہمارے نزدیک کفار کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، ان کی کوئی قدر و منزلت اور کوئی حیثیت ہماری نظروں میں نہیں ہوگی کیونکہ قدر و منزلت تو اس دن اعمال حسنہ والے شخص کی ہوگی اور جب ان کفار کے اعمال حسنہ ضائع اور بے کار ہو چکے ہوں گے تو یہ لوگ گویا اعمال حسنہ سے بالکل کورے اور خالی ہو جائیں گے، جس کی وجہ سے ان کی کوئی قدر و منزلت اور کوئی وقعت نہیں ہوگی، یہ لوگ نہایت ذلیل و حقیر ہوں گے، پس آیت اولیٰ میں وزن سے مراد اس کے حقیقی معنی تولنا مراد نہیں ہے بلکہ وزن کے مجازی معنی یعنی اعتبار کرنا اور قدر و

منزلت مراد ہے، یعنی "فَلَا نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اعْتِبَارًا" وزن کو اعتبار کے معنی میں لینا کثیر الاستعمال ہے جیسے کہا جاتا ہے فلاں نے وزن دار بات کہی ہے، یعنی اس کی بات قابل قدر اور قابل اعتبار ہے اور فلاں کی بات کا کوئی وزن نہیں، یعنی اس کی بات معتبر نہیں ہے، اس کی کوئی حیثیت ہماری نظروں میں نہیں ہے، پس جب آیت اولیٰ میں وزن کی نفی مقصود ہی نہیں ہے تو آیت ثانیہ سے اس کا کوئی تعارض نہیں رہا۔ (روح المعانی)

۳ اختلاف اشخاص پر محمول ہے، یعنی بعض کفار کے اعمال تولے جائیں گے اور بعض کے نہیں، جس طرح مؤمنین دو قسم کے ہوں گے، بعض تو وہ جو بلا حساب و کتاب و بلا وزن اعمال جنت میں چلے جائیں گے اور بعض حساب و کتاب اور وزن اعمال کے بعد جنت میں داخل ہوں گے، ایسے ہی کفار کی دو قسمیں ہوں گی بعض وہ کفار جو بلا حساب و کتاب و بلا وزن اعمال جہنم میں داخل کردیے جائیں گے اور بعض کو حساب و کتاب اور وزن اعمال کے بعد جہنم میں بھیجا جائے گا، پس وزن کی نفی بعض کفار کے لئے اور وزن کا اثبات دوسرے بعض کفار کے لئے ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی توجیہ کو پسند کیا ہے۔ (قرطبی وطبری)

مومنین صالحین جہنم میں داخل ہوں گے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ١٦، ١٧

آیات

(١) ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾
(پارہ ١٦، رکوع ٨، سورۂ مریم، جلالین ص ٢٥٨)

(٢) ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ﴾
(پارہ ١٧، رکوع ٧، سورۂ انبیاء، جلالین ص ٢٧٥)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ تم میں سے ہر ایک کو جہنم میں ضرور داخل ہونا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص جہنم میں ضرور جائے گا، مومن ہو یا کافر، متقی، صالح ہو یا فاسق و فاجر، نبی یا ولی ہو یا غیر نبی و غیر ولی، سب جہنم میں ضرور داخل ہوں گے اور آیت ثانیہ میں ہے کہ ہم نے جن کے لئے بھلائی و حسن عاقبت کا فیصلہ کر دیا ہے، وہ جہنم سے دور رہیں گے، پس بظاہر دونوں آیتوں میں تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے چار جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ میں ورود سے مراد حضور ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے انورود الحضور، عبد بن حمید رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت عبید بن عمیر رحمۃ اللہ علیہ سے یہی تفسیر نقل کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر شخص کو جہنم کے قریب، مقام حساب و کتاب تک حاضر ہونا ہے، ورود بول کر قرب حضور مراد لیا جاتا

ہے جیسے "وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ" میں ورود سے مراد قرب وحضور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین کے کنویں کے قریب حاضر ہوئے، کنویں کے اندر داخل ہونا مراد نہیں ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب قافلہ شہر کے قریب آ جائے، ابھی شہر میں داخل نہ ہو تو کہہ دیا جاتا ہے "وردت القافلة البلدة"، اور "أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نفس جہنم سے مسافت کے اعتبار سے بعید ہوں گے کیونکہ بعد مسافت تو قرب کے منافی ہے۔ پس تعارض جوں کا توں باقی رہے گا بلکہ مُبْعَدُونَ عَنْ عَذَابِهَا مراد ہے، اصحاب حسنیٰ اگرچہ مسافت کے اعتبار سے تو جہنم کے قریب ہوں گے مگر اس کے عذاب سے دور رہیں گے، قریب ہوتے ہوئے بھی ان کو جہنم کی حرارت وغیرہ کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوگا اور اگر بعد مسافت ہی مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہے کہ اولاً جہنم کے قرب لایا جائے گا، پھر دور کر دیا جائے گا، پس کوئی تعارض نہیں۔ (تفسیر کبیر و روح المعانی و مدارک)

❷ ورود سے مراد دخول ہی ہے، قدماء مفسرین اور جمہور اہل سنت والجماعت اسی کے قائل ہیں، ورود بمعنی دخول دیگر آیات میں بھی مستعمل ہے جیسے "إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنْتُمْ لَهَا وَارِدُونَ" ای داخلون، اسی طرح فرعون اور اس کی قوم کے متعلق ارشاد ہے "يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ" ای فادخلهم النار اور آیت ثانیہ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ کے معنی مُبْعَدُونَ عَنْ عَذَابِهَا ہیں، حق تعالیٰ ہر شخص کو جہنم میں داخل کریں گے مگر اس کے باوجود جہنم کی آگ مؤمنین وصالحین پر اثر نہ کرے گی، حق تعالیٰ نے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ کو برداً وسلاماً بنا دیا تھا ایسے ہی مؤمنین صالحین کے حق میں جہنم کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی، حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرفوع روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے:

﴿عن ابی سمية قال: اختلفنا فی الورود، فقال بعضنا: لا يدخلها

مؤمن وقال آخر: يدخلونها جميعا ثم ينجي الله الذين اتقوا، فلقيت جابر بن عبدالله. فذكرت له فقال: واهوى باصبعيه الى اذنيه صمتا ان لم اكن سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لايبقى بر ولافاجر الا دخلها فتكون على المؤمن برداً وسلاماً كما كانت على ابراهيم عليه الصلاة والسلام حتى ان للنار ضجيجاً من بردهم ثم ينجي الله الذين اتقوا.

(اخرجه احمد والحكيم الترمذي وابن المنذر والحاكم وصححه. روح المعانی)

ترجمہ: "حضرت ابوسمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ہم لوگوں میں ورود کے بارے میں اختلاف ہوا، بعض نے تو کہا کہ مؤمن جہنم میں داخل نہیں ہوگا، دوسرے نے کہا جہنم میں سب لوگ داخل ہوں گے، پھر حق تعالیٰ متقین کو نجات عطا فرمادیں گے، پس میں نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات کی تو ان سے اس بات کا ذکر کیا، انہوں نے اپنی دو انگلیاں کانوں کی طرف بڑھا کر فرمایا کہ یہ دونوں کان بہرے ہوجائیں اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ کوئی نیک و فاجر جہنم میں داخل ہوئے بغیر باقی نہیں رہے گا مؤمن پر آگ ٹھنڈی وسلامتی والی ہوجائے گی، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہوگئی تھی یہاں تک کہ لوگوں کے ٹھنڈا ہوجانے کی وجہ سے آگ شور مچانے لگے گی، پھر حق تعالیٰ اہل تقویٰ کو اس میں سے نکال دیں گے۔"

بہرحال خلاصہ یہ ہوا کہ ہر شخص جہنم میں داخل ہوگا مگر مؤمنین صالحین اصحاب جنت اس کے عذاب سے دور اور محفوظ رہیں گے۔ فلا تعارض بين الآيتين۔

(روح المعانی)

❸ ورود سے مراد مرور ہے، حضرت حسن اور حضرت قتادہ نے یہی تفسیر کی ہے، اور یہ گزرنا اس پل صراط پر ہوگا جو جہنم کی پشت پر بچھایا جائے گا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مؤمن جہنم کے اوپر پل صراط پر سے گزر جائے گا، اور اس کو پتہ بھی نہ چلے گا جیسا کہ ایک روایت میں ہے:

﴿عن خالدبن معدان قال: اذادخل اهل الجنة، قالوا: ربنا الم تعدنا ان نرد النار؟ قال: بلى، ولكنكم مررتم عليها وهي خامدة.﴾ (اخرجه ابن ابي شيبه وعبد بن حميد والحكيم وغيرهم، روح المعاني ۱۶/۱۳۲)

ترجمہ: ”حضرت خالد بن معدان سے روایت ہے کہ جب اہل جنت جنت میں داخل ہوجائیں گے، تو عرض کریں گے اے خدا! کیا آپ نے ہم سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ ہم جہنم پر وارد ہوں گے، حق تعالیٰ فرمائیں گے ہاں، وعدہ کیا تھا مگر تم لوگ تو اس پر سے گزر بھی گئے اس حال میں کہ اس کی آگ بجھی ہوئی تھی۔“

اس تفسیر پر بھی دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں رہتا۔

(تفسیر روح المعانی ومدارک)

❹ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ورود علی النار سے مراد دنیا میں بخار کا لاحق ہونا ہے، جہنم میں داخل ہونا یا اس پر سے گزرنا مراد نہیں ہے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر شخص کو دنیا میں بخار لاحق ہوتا ہے، انہوں نے غالباً یہ تفسیر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ایک روایت کے پیش نظر کی ہے۔

﴿عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها قالت: ان النبي صلى الله عليه وسلم قال: الحمى من فيح جهنم فابردوها بالماء.﴾

(رواہ البخاری ومسلم)

ترجمہ: ”حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے، فرمایا کہ نبی

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بخار جہنم کی حرارت سے ہوتا ہے،
اس کو پانی سے ٹھنڈا کیا کرو۔"

مگر اس روایت سے مقصد پر استدلال غیر ظاہر ہے اس لئے کہ روایت میں
ورود علی النار سے کوئی تعرض نہیں ہے۔ (تفسیر عثمانی ودرس ادوائی)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان کی لکنت بالکل زائل ہوگئی تھی یا کچھ باقی تھی؟

پارہ نمبر: ۱۶، ۲۰، ۲۵

آیات

(۱) ﴿قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يَا مُوسَىٰ﴾ (پ ۱۶، رکوع ۱۰، سورۃ طٰہٰ، جلالین ص ۲۶۲)

(۲) ﴿وَأَخِي هَارُونُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا فَأَرْسِلْهُ مَعِيَ الخ﴾ (پ ۲۰، رکوع ۷، سورۃ قصص، جلالین ص ۳۳۰)

(۳) ﴿وَلَا يَكَادُ يُبِينُ﴾ (پ ۲۵، رکوع ۱۰، سورۃ الزخرف، جلالین ص ۴۰۸)

تشریح تعارض

پہلی آیت میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے موسیٰ آپ کی درخواست پوری کر دی گئی حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ سے دعا کی تھی:

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي هَارُونَ أَخِي﴾

ترجمہ: "اے پروردگار میرا سینہ کھول دے میری زبان کی گرہ (لکنت) دور کر دے تاکہ لوگ میری بات سمجھیں اور میرے خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر و معین بنادے۔"

حق تعالیٰ نے دعا قبول کرتے ہوئے فرمایا "قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يَا مُوسَىٰ" اے موسیٰ جو دعائیں آپ نے ہم سے مانگی تھیں ہم نے قبول کر لی ہے۔ یعنی ہم نے آپ کو شرح صدر سے بھی نوازا ہے اور آپ کی زبان کی لکنت بھی دور کر دی گئی اور آپ کے

بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو آپ کا وزیر و معین بنا دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان کی لکنت بالکل دور ہوگئی تھی، صاف بولنے لگے تھے اور آیت نمبر ۲ و ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ لکنت بالکلیہ زائل نہیں ہوئی تھی کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو خود سے افصح اللسان فرمایا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی زبان میں مجھ سے زیادہ روانی ہے، میں زیادہ صاف اور تیز بول نہیں پاتا، معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں کچھ لکنت باقی تھی اور آیت نمبر ۳ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس دعوت دینے کے لئے پہنچے تو اس نے کہا "وَلَا یَكَادُ یُبِیْنُ" کہ یہ تو اپنی بات اچھی طرح ظاہر نہیں کر پاتے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لکنت باقی تھی، پس ان دونوں آیتوں کا پہلی آیت سے بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں جو تجزیہ کے بعد متعین ہو جاتے ہیں:

❶ لکنت تو بالکلیہ زائل ہوگئی تھی جیسا کہ آیت نمبر ۱ سے معلوم ہوتا ہے، حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر حضرات اسی کے قائل ہیں، البتہ آیت نمبر ۲ میں جو حضرت ہارون علیہ السلام کا افصح لساناً ہونا مذکور ہے اس کے دو جواب ہیں:

پہلا جواب: حضرت موسیٰ علیہ السلام جس وقت حضرت ہارون علیہ السلام کو وزیر و معین بنانے کی درخواست کر رہے تھے اس وقت تو لکنت موجود تھی، اس لئے حضرت ہارون علیہ السلام کو افصح منی لسانا فرمایا، بعد میں حق تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور لکنت کو بالکلیہ زائل فرما دیا۔ پس اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں بعد میں بھی لکنت باقی رہی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قبولیت دعا کے بعد افصح

اللسان فرمایا تو حضرت ہارون علیہ السلام کے افصح لساناً ہونے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فصاحتِ لسانی کی نفی نہیں ہوتی، حضرت موسیٰ علیہ السلام فصیح اللسان تھے اور فصیح اللسان اس شخص کو کہتے ہیں جس کی زبان میں لکنت نہ ہو جیسا کہ ابن ہلال نے کتاب الصناعتین میں تصریح کی ہے "الفصاحۃ تمام آلۃ البیان" کہ فصاحت آلۂ بیان یعنی زبان کے مکمل ہونے کو کہتے ہیں، جس کی زبان میں نقص ہو اس کو فصیح نہیں کہا جاتا، اسی وجہ سے اَلْفَغ (ہکلے شخص) اور تمتام (جلدی جلدی بولنے والے شخص) کو فصیح نہیں کہا جاتا کیونکہ یہ لوگ حروف کی ادائیگی پر اچھی طرح قادر نہیں ہوتے۔ بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام فصیح تھے، زبان میں لکنت بالکل نہیں تھی البتہ حضرت ہارون علیہ السلام افصح تھے اور تیسری آیت "وَلَا یَکَادُ یُبِیْنُ" کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حجت و دلیل مکمل پیش نہیں کر پاتے، فرعون لعین نے یہ بات تمویہاً کہی تھی تاکہ لوگوں کا میلان حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف نہ ہو پائے ورنہ تو وہ جانتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوی الحجۃ والدلیل ہیں، پس اس آیت سے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا صاحبِ لکنت ہونا ثابت نہیں ہوتا لہٰذا ان آیات میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ (روح المعانی و مدارک)

❷ لکنت بالکلیہ زائل نہیں ہوئی تھی جیسا کہ اخیر کی دو آیتوں سے معلوم ہوتا ہے، امام جبائی رحمۃ اللہ علیہ اسی کے قائل ہیں اور پہلی آیت کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوری لکنت کے زوال کی دعا نہیں کی تھی بلکہ دعا کا مقصد یہ تھا کہ اے رب! میری زبان کی اتنی لکنت دور کر دے جس سے لوگ میری بات سمجھنے لگیں، اسی لئے عقدۃ نکرہ اور من لسانی میں من تبعیضیہ کا استعمال کیا کہ میری زبان کی تھوڑی سی لکنت دور کر دے، اسی دعا کو حق تعالیٰ نے قبول فرمالیا اور کچھ لکنت دور فرمادی تھی جس سے لوگ بات سمجھ جاتے تھے، اگر بالکلیہ زوال کی دعا ہوتی تو وَاحْلُلْ عُقْدَةَ لِسَانِیْ اضافت کے ساتھ کہا جاتا، پس یہ آیت اخیر کی دونوں آیتوں کے

معارض نہیں ہے۔

مگر اکثر حضرات چونکہ بالکلیہ زوال کے قائل ہیں اس لئے انہوں نے عقدة کے نکرہ اور من کے استعمال کا جواب یہ دیا ہے کہ عقدةً نکرہ ہے تو اس لئے استغنی کی کہ لکنت کی نفی ہے تعجیل بھی زیادہ نہیں تھی اور من فی کے معنی میں ہے یعنی وَاحْلُلْ عُقْدَةً فِیْ لِسَانِیْ ''میری زبان میں جو یہ تھوڑی سی لکنت ہے اس کو دور کردے'' حق تعالیٰ نے دور فرمادی۔ (روح المعانی)

یہ بظاہر تو دو جواب ہوئے مگر پہلا جواب چونکہ دو جوابوں پر مشتمل ہے اس لئے تجزیے کے بعد تین جواب ہو جاتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے مسخر شدہ ہوا تیز تھی یا ہلکی؟

پارہ نمبر ۱۷، ۲۳

آیات

① ﴿وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهِ﴾

(پارہ ۱۷ رکوع ۶ سورۂ انبیاء، بالائیں ص ۲۷۵)

② ﴿فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ﴾

(پارہ ۲۳ رکوع ۱۳ سورۂ ص، حاشیہ ص ۳۶۳)

تشریحِ تعارض

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے حق تعالیٰ نے ہوا کو مسخر کر دیا تھا، اس ہوا کو آیت اول میں عاصفۃ یعنی تیز چلنے والی کہا گیا ہے اور دوسری آیت میں رخاء نرم اور ہلکی چلنے والی کہا گیا ہے، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ شدت و رخاوت کی جہت مختلف ہے یعنی ہوا مسافت طے کرنے کے اعتبار سے تو عاصفہ یعنی تیز رفتار تھی مگر فی نفسہ خفیف و نرم تھی کہ اس سے راکبین کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی ورنہ تو تیز آندھی مسافر کے لئے وبال اور مصیبت بن جاتی ہے کہ اس کے کپڑے بھی اڑنے لگتے ہیں اور اس کا ساز و سامان بھی منتشر و متفرق ہو جاتا ہے بلکہ

خود اس کے اڑ جانے اور ہلاک ہوجانے کا خطرہ ہوجاتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ہوا اس قسم کی نہیں تھی، تیز رفتار ہونے کے باوجود نہایت اطمینان و استقلال کے ساتھ راکبین کو لے کر چلتی تھی اور تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ زمان قلیل میں مسافت بعیدہ طے کرلیتی تھی، صبح سے زوال تک ایک ماہ کی مسافت اور زوال سے مغرب تک ایک ماہ کی مسافت کا سفر ہوجاتا تھا، اس کو حق تعالیٰ نے ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے "ولسلیمان الریح غدوھا شھر ورواحھا شھر۔" حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام صبح صبح دمشق سے روانہ ہوتے اور اصطخر میں جا کر قیلولہ کرتے، دمشق اور اصطخر کے درمیان ایک مہینہ کی مسافت کا فاصلہ ہے، پھر زوال کے بعد اصطخر سے چلتے اور بابل میں رات گزارتے اور ان دونوں مقاموں میں ایک ماہ کی مسافت کا فاصلہ ہے، بہرحال شدت و رخوت کی جہت بدل جانے کی وجہ سے کوئی تعارض نہیں رہا۔ (بیان القرآن و صاوی)

❷ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ارادہ کے اعتبار سے شدید و خفیف ہوتی رہتی تھی، جب حضرت سلیمان علیہ السلام تیز رفتاری کا ارادہ فرماتے تو عاصفہ بن جاتی تھی اور جب ہلکی رفتار چاہتے تو رخاء ہوجاتی تھی جیسے گاڑی کا ڈرائیور جب چاہتا ہے گاڑی کی رفتار تیز کردیتا ہے، جب چاہتا ہے ہلکی کردیتا ہے اس لئے کوئی تعارض نہیں ہے۔

(تفسیر خازن و روح المعانی)

❸ آمد و رفت کے اعتبار سے شدت و رخوت مختلف ہوتی تھی، جب حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے وطن سے کسی جگہ تشریف لے جاتے تو خفیف ہوتی تھی اور جب وطن کی طرف واپس لوٹتے تو عاصف (تیز رفتار) بن جاتی تھی جیسے انسان کی عادت ہوتی ہے کہ جب کسی مقام سے اپنے وطن کی طرف واپس آتا ہے تو تیز رفتار گاڑی سے آتا ہے۔ (روح المعانی)

جیسے ہمارے طالب علم جب سالانہ تعطیل پر اپنے اپنے وطن جاتے ہیں تو

ایکسپریس بلکہ راجدھانی کا ٹکٹ بنوانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ جلد از جلد گھر پہنچ سکیں اور جب شوال کے مہینے میں گھروں سے مدرسہ آنا ہوتا ہے تو پسنجر ٹرین سے بھی کام چل جاتا ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے بیماری میں صبر کیا یا نہیں؟

پارہ ۱۷، ۲۳

آیات

(۱) ﴿وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾

(پارہ ۱۷ رکوع ۶ سورۃ انبیاء جلالین ص ۲۷۶) ◆

(۲) ﴿إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِّعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ﴾

(پارہ ۲۳ رکوع ۳ سورۃ ص جلالین ص ۳۸۳)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنی بیماری و مصیبت کا شکوہ کیا، اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ کہ مجھے بہت شدت لاحق ہوگئی ہے میں پریشان ہوگیا ہوں اور شکوہ و شکایت کرنا صبر کے منافی ہے، اس سے یہ لازم آیا کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے صبر نہ کیا کیونکہ صابر آدمی شکوہ و شکایت نہیں کرتا، اپنے درد و مصیبت کا اظہار نہیں کرتا بلکہ خاموشی اور سکون کے ساتھ اس کو برداشت کرتا رہتا ہے اور دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے حضرت ایوب علیہ السلام کو صابر پایا، وہ بہت اچھے بندے اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے صبر سے کام لیا کوئی شکوہ و شکایت نہیں کی، لہٰذا ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

﴿دفع تعارض﴾

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ حضرت ایوب علیہ الصلاۃ والسلام کا رَبِّ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ کہنا شکوہ و شکایت نہیں ہے بلکہ یہ تو دعا ہے، اسی لئے حق تعالیٰ نے فرمایا: فاستجبنا لہ، استجابت قبولیت دعا کو کہتے ہیں، معلوم ہوا کہ انہوں نے حق تعالیٰ سے دعا کی تھی، اس کو شکوہ و شکایت کہنا غلط ہے۔ شکوہ و شکایت اس کو کہتے ہیں کہ آدمی مخلوق کے سامنے اپنے درد و مصیبت کا اظہار کرتا پھرے، لوگوں کے سامنے ہائے ہائے کرتا پھرے، یہ بے صبری اور کم ہمتی کی علامت ہوتی ہے، حق تعالیٰ کے سامنے اپنی پریشانی بیان کرنا اور رحم و کرم کی درخواست کرنا بے صبری نہیں کہلاتا، اگر حق تعالیٰ کے سامنے بندہ اپنی پریشانی بیان نہیں کرے گا، اس سے رحم و کرم کی درخواست کرے گا؟؟ تو اور کون سے دربار میں جا کر اپنی پریشانی کو ظاہر کرے گا، کس سے رحم و کرم کی درخواست کرے گا، وہی تو ایک ایسی بارگاہ ہے جہاں سب کی حاجت پوری ہوتی ہیں اس لئے "رب انی مسنی الضر" کو صبر کے منافی قرار دینا غلط ہے، پس ان دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

(تفسیر مظہری)

کفار کے معبودانِ باطلہ ان کے ساتھ جہنم میں حاضر رہیں گے یا ان سے غائب؟

پارہ ۱۷، ۲۴، ۲۵، ۲۶

آیات

① ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴾

(پارہ: ۱۷، رکوع: ۷، سورۃ انبیاء، جلالین ص: ۲۷۷) ✦

② ﴿ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا ﴾

(پارہ: ۲۴، رکوع: ۱۳، سورۃ مؤمن (غافر) جلالین: ص ۳۹۵، ۳۹۶)

③ ﴿ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ ﴾

(پارہ: ۲۵، رکوع: ۱، سورۃ حم سجدہ (فصلت) جلالین: ص ۴۰۰)

④ ﴿ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴾

(پارہ: ۲۶، رکوع: ۳، سورۃ احقاف جلالین ص: ۴۱۸)

آیت نمبر ۱ میں کفار کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم اور تمہارے معبود جہنم کا ایندھن ہیں، تم سب جہنم میں جاؤ گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے معبودانِ باطلہ کفار کے سامنے ہوں گے، جہنم میں ان کے ساتھ رہیں گے، ان سے غائب اور پوشیدہ نہیں ہوں گے۔ اور آیت نمبر ۲ میں ارشاد ہے کہ اہلِ جہنم سے جہنم میں پوچھا جائے گا کہاں ہیں وہ بت جن کو تم اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے؟ تو وہ جواب دیں گے ضَلُّوْا عَنَّا کہ وہ تو ہماری نظروں سے غائب ہیں ہم کو نظر ہی نہیں آ رہے ہیں۔

(ضلال کے معنی غیوبت کے ہیں ای غَابُوْا عَنَّا) اسی طرح آیت نمبر ۳ و ۴ میں ضَلَّ عَنْھُمْ اور بَلْ ضَلُّوْا عَنْھُمْ سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے، پس بظاہر ان آیات میں تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ اختلاف زمان پر محمول ہے، یعنی اولاً تو کفار کے اصنام کو ان کی نظروں سے غائب کر دیا جائے گا، وہ کہیں گے "ضَلُّوْا عَنَّا" پھر ان کو حاضر کر دیا جائے گا اور ان کو ان کے عابدین کے ساتھ جہنم میں داخل کر دیا جائے گا لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

(تفسیر ابوالسعود، جلالین)

❷ اختلاف مکان پر محمول ہے، جہنم کے مختلف طبقات اور متعدد مواقف ہیں، بعض مواقف و طبقات میں جدا اور غائب رہیں گے اور بعض میں ان کے ساتھ مقترن رہیں گے لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (روح المعانی)

❸ غیوبت سے مراد مجازاً عدم نفع ہے، غیر نافع شئے کا وجود و عدم، حضور و غیوبت برابر ہے، پس ضَلُّوْا عَنَّا کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ہمارے معبود جہنم میں ہمارے ساتھ ہیں مگر ان سے ہمیں کوئی نفع نہیں پہنچا، پس حقیقۃً تو یہ بت ان کے ساتھ موجود ہوں گے مگر مجازاً ان سے غائب ہوں گے، پہلی آیت حقیقت اور اخیر کی تین آیات مجاز پر محمول ہیں، فلا تعارض۔ (روح المعانی)

قیامت کے دن آسمانوں کا کیا حال ہوگا؟

پارہ نمبر: ۱۷، ۱۹، ۲۴، ۲۷، ۲۹، ۳۰

آیات

① ﴿يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ﴾

(پارہ: ۱۷ رکوع: ۷ سورۂ انبیاء جلالین ص: ۲۷۷)

② ﴿وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ﴾ (پارہ: ۲۴ رکوع: ۴ سورۂ زمر جلالین ص: ۳۹۰) ✦

③ ﴿وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا﴾

(پارہ: ۱۹ رکوع: ۱ سورۂ فرقان، جلالین ص: ۳۰۵)

④ ﴿فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۱۲ سورۂ رحمٰن جلالین: ۴۴۳)

⑤ ﴿فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ﴾

(پارہ: ۲۹ رکوع: ۵ سورۂ حاقہ جلالین ص: ۴۷۳)

⑥ ﴿فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۱۳ سورۂ مزمل جلالین ص: ۴۷۸)

⑦ ﴿اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ﴾ (پارہ: ۳۰ رکوع: ۷ سورۂ انفطار جلالین ص: ۴۹۲)

⑧ ﴿اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ﴾ (پارہ: ۳۰ رکوع: ۹ سورۂ انشقاق جلالین ص: ۴۹۳) ✦

⑨ ﴿يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۳ سورۂ طور جلالین ص: ۴۳۵) ✦

⑩ ﴿يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ﴾

(پارہ: ۲۹ رکوع: ۷ سورۂ معارج جلالین ص: ۴۷۳) ✦

⑪ ﴿وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۲۱ سورۂ مرسلات جلالین ص: ۴۸۵)

(۱۲) ﴿ وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ﴾ (پارہ: ۳۰ رکوع ۱ سورۂ نبا، جلالین ص: ۴۸۷)

(۱۳) ﴿ وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ﴾ (پارہ: ۳۰ رکوع ۹ سورۂ تکویر جلالین ص: ۴۹۱)

تشریحِ تعارض

پہلی دو آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن آسمانوں کو لپیٹ دیا جائے گا اور آیت نمبر ۳ تا ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پھٹ جائے گا، انشقاق و انفطار کے معنی پھٹنے کے ہیں اور آیت نمبر ۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان قیامت کے دن حرکت کرے گا، تھر تھرائے گا۔ (مار یمور موراً) تھر تھرانا، آگے پیچھے تیزی سے ہلنا، حرکت کرنا) اور آیت نمبر ۱۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان مُہل (تیل کی تلچھٹ) کی طرح ہو جائے گا اور آیت نمبر ۱۱، ۱۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کو کھول دیا جائے گا، اس کے دروازے کھل جائیں گے اور آیت نمبر ۱۳ میں ہے کہ آسمانوں کو کھینچ لیا جائے گا جس طرح بکری کی کھال کھینچ لی جاتی ہے، پھر آیت نمبر ۲ میں کالدھان فرمایا کہ آسمان کا رنگ سرخ چمڑے کی طرح ہو جائے گا، دِھان کے معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ادیم احمر کے بیان کئے ہیں جیسا کہ روح المعانی میں مذکور ہے اور آیت نمبر ۱۰ میں کالمهل فرمایا کہ تیل کی تلچھٹ کی طرح سیاہ ہو جائے گا، اس طرح ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس سلسلہ میں مختلف تفاسیر دیکھنے سے جو تطبیق سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ قیامت کے روز آسمان پر مختلف احوال و تغیرات طاری ہوں گے، اولاً تو آسمان جہنم[1] کی حرارت سے سرخ ہو جائے گا یا حق تعالیٰ کے غضب[2] کے اثر سے سرخ ہوگا

(۱) حاشیہ نمبر ۷ روح المعانی ج: ۲۷ ص: ۱۱۳ و ابن کثیر ج: ۴ ص: ۲۷۹

(۲) حاشیہ تفسیر بیان القرآن۔

کیونکہ غضب میں چہرہ سرخ ہوجاتا ہے، اس کو فرمایا "فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ" اور شدت حرارت سے سولر[1] کے مشابہ رنگ پیدا ہوجاتا ہے اس لئے فرمایا: یومَ تکون السماءُ کالمھل کہ تیل کی تلچھٹ کی طرح سیاہ ہوجائے گا یا یکے بعد دیگرے رنگ بدلے گا جیسا کہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے "تَتَلَوَّنُ اَلْوَانًا" مطلب یہ ہے کہ اولاً جہنم کی حرارت سے وہ سرخ ہوگا، پھر حرارت کی شدت سے پگھلے ہوئے تیل کی تلچھٹ کی طرح سیاہ رنگ ہوجائے گا۔

بہرحال اولاً آسمان سرخ و سیاہ ہوگا، اس کے بعد حرکت کرے گا، تھرتھرائے گا جس کو فرمایا "يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا" اس کے بعد پھٹ جائے گا، اس کو فرمایا: "اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ، اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ" وغیرہ اور آسمانوں کا پھٹنا ان کو فنا کرنے[2] کے لئے ہوگا، یعنی آسمانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے فنا کردیا جائے گا، بعض دو آیتوں میں آسمان کو لپیٹنے سے مراد بھی فنا کرنا ہی ہے۔ حضرت حسن[3] سے طی کی تفسیر افناء و ازالہ کے ساتھ منقول ہے، محاورہ میں کہا جاتا ہے اطوِ عنی ھذا الحدیث "مجھ سے اس بات کو لپیٹ دے" یعنی بات ختم کردے۔ یہ سب کچھ نفخۂ اولیٰ کے وقت ہوگا، اس کے بعد تمام آسمانوں اور زمینوں کو پھر[4] درست کردیا جائے گا، اس کے بعد آسمان کو کھول دیا جائے گا جیسے پردہ ہٹادیا جاتا ہے اس کو فرمایا وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ اور فُتِحَتِ السَّمَآءُ اور اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ کہ جس طرح بکری کی کھال اتاری جاتی ہے، اندر کا گوشت وغیرہ نظر آجاتا ہے اسی طرح آسمان کو کھول دیا جائے گا، اس سے علوی کی اشیاء نظر آنے لگیں گی۔

---

(۱) حاشیہ تفسیر بیان القرآن۔

(۲) حاشیہ تفسیر بیان القرآن پارہ ۹

(۳) روح المعانی ج ۲ عاشر: ۹۹

(۴) بیان القرآن پارہ ۱۹

اس سے ملائکہ کا نزول ہوگا، پھر قدم ثانی یعنی سفید بادل نازل ہوگا جس میں حق تعالیٰ کی تجلی ہوگی جس کو آیت نمبر ۳ "یَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِکَةُ تَنْزِیْلًا" میں بیان کیا گیا ہے، اس آیت میں تشقق سے مراد کھلنا ہے، ٹکڑے ٹکڑے ہونا مراد نہیں ہے، اس تقریر کے بعد تمام آیات میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ طی سموات اور کالدھان کی اور بھی تفسیریں کی گئی ہیں مگر تمام تفاسیر کا احاطہ کرنا ہمارے موضوعِ بحث سے خارج ہے۔ فاخذنا منها ما یفیدنا لدفع التعارض وحصول التطبیق۔ واللہ اعلم

زلزلۂ قیامت کے وقت لوگوں پر نشہ طاری ہوگا یا نہیں؟

پارہ: الحج: ۱۷

آیت

(۱) ﴿وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى﴾

(پارہ ۱۷، سورۃ الحج، آیت ۲ …)

تشریحِ تعارض

اس آیت میں ارشاد ہے کہ جب قیامت کے دن زلزلہ آئے گا تو لوگوں کو تو اس وقت نشہ کی حالت میں دیکھے گا اور وہ نشہ کی حالت میں نہیں ہوں گے۔ پس اس آیت کے جزءِ اول میں سکر (نشہ) کا اثبات اور جزءِ ثانی میں سکر کی نفی ہے، یعنی آیت کے جزءِ اول اور جزءِ ثانی میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اثبات و نفی کی جہت مختلف ہے سکر کا اثبات علی سبیل التشبیہ ہے اور نفی علی سبیل التحقیق ہے، یعنی لوگوں پر اللہ کے عذاب کی وحشت اس قدر طاری ہوگی کہ ان کے ہوش اڑ جائیں گے، عقلیں خراب ہو جائیں گی، ایسا محسوس ہوگا کہ ان پر نشہ طاری ہوگیا ہے حالانکہ وہ لوگ کسی مسکر (نشہ آور) چیز شراب وغیرہ کے پینے کی وجہ سے حقیقتاً نشہ میں نہیں ہوں گے، حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے "تری الناس سکاری من الخوف وماھم بسکاری من الشراب" اور اختلاف جہت کے بعد کوئی تعارض نہیں رہتا۔ (تفسیر مدارک، خازن)

قیامت کے دن کی مقدار ایک ہزار سال ہے یا پچاس ہزار سال؟

پارہ: ۱۷، ۲۱، ۲۹

آیات

① ﴿وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾

(پارہ: ۱۷، سورۃ حج، جلالین ص: ۲۸۹)

② ﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ (پارہ: ۲۱، سورۃ السجدۃ، جلالین ص: ۳۴۹)

③ ﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ (پارہ: ۲۹، سورۃ المعارج، جلالین ص: ۴۷۳)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱، ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا دن ایک ہزار سال کا ہوگا اور آیت نمبر ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ یوم قیامت کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے چار جوابات ہیں:

① اختلاف اشخاص پر محمول ہے۔ یعنی کفر و معاصی اور ایمان کے شدت و ضعف اور قلت و کثرت کے اعتبار سے وہ دن طول و قصر اور شدت و خفت میں مختلف ہوگا، کفار

جس سے جو لوگ بڑے مجرم ہوں گے ان کو پچاس ہزار سال کا اور اس سے کم درجے کے مجرمین کو ایک ہزار سال کا محسوس ہوگا، حتی کہ مؤمنین کو یہ دن نہایت مختصر اور خفیف محسوس ہوگا، پھر مؤمنین کے حق میں بھی مختلف ہوگا، بعض کو تو جتنے وقت میں ایک فرض نماز ادا کی جاتی ہے اس سے بھی کم اور خفیف معلوم ہوگا جیسا کہ حدیث میں وارد ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ: سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ مَا اَطْوَلُ ھٰذَا الْیَوْمِ؟ فَقَالَ: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ اِنَّہٗ لَیُخَفَّفُ عَلَی الْمُؤْمِنِ حَتّٰی یَکُوْنَ اَھْوَنَ مِنَ الصَّلٰوۃِ الْمَکْتُوْبَۃِ یُصَلِّیْھَا فِی الدُّنْیَا.﴾

(رواہ احمد وابن حبان وابو یعلی وابن جریر والبیہقی، روح المعانی وتفسیر مظہری)

ترجمہ: ”حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دن کے متعلق سوال کیا گیا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی کہ یہ کس قدر طویل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس خدا کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، یہ دن مؤمن پر ہلکا ہوگا یہاں تک کہ (جتنے وقت میں) آدمی دنیا میں ایک فرض نماز پڑھتا ہے اس سے بھی زیادہ ہلکا اور آسان ہوگا۔“

اور بعض کو ما بین الظہر والعصر کے بقدر محسوس ہوگا جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ مَرْفُوْعًا وَمَوْقُوْفًا یَکُوْنُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کَمِقْدَارِ مَا بَیْنَ الظُّھْرِ وَالْعَصْرِ.﴾

(اخرجہ الحاکم والبیہقی، مظہری)

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مرفوعا وموقوفا روایت ہے

کہ وہ دن مومنین پر اتنا ہوگا جتنا وقت ظہر و عصر کے درمیان ہوتا ہے۔"

بہر حال یہ تفاوت اختلاف اشخاص پر محمول ہے، ولا تعارض بعد اختلاف الاشخاص۔" (مظہری، روح المعانی وغیرہ)

❷ اختلاف مکان پر محمول ہے کہ جس طرح دنیا میں بعض علاقوں میں دن بڑا اور بعض مقامات میں چھوٹا ہوتا ہے، اختلاف آفاق سے تفاوت ہوتا رہتا ہے، اسی طرح قیامت کا دن میدان محشر کے بعض حصوں میں طویل یعنی پچاس ہزار سال کا اور بعض مقامات میں ایک ہزار سال کا ہوگا، آیات میں اقل و اکثر کو بیان کردیا گیا، درمیان کے تفاوت کو اسی پر قیاس کرتے ہوئے سمجھ لیا جائے۔ (بیان القرآن)

❸ یوم آخرت ایام کثیرہ پر مشتمل ہوگا، ان ایام میں کوئی دن پچاس ہزار سال کا اور کوئی ایک ہزار سال کا ہوگا لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (حاشیہ جلالین)

❹ ان آیات میں یوم سے مراد یوم قیامت نہیں ہے بلکہ آیت نمبر ۱ میں تو مطلق یوم عذاب مراد ہے کہ آخرت میں عذاب جہنم کے ایام میں سے ایک ایک دن اہل جہنم کو شدید و طویل محسوس ہوگا، ایک ایک دن کو وہ لوگ ایسا سمجھیں گے کہ ایک ہزار سال کا زمانہ گزر گیا ہے کیونکہ ایام راحت مختصر اور ایام مصیبت طویل محسوس ہوا کرتے ہیں۔
(تفسیر روح المعانی)

ایام مصیبت کے کاٹے نہیں کٹتے
دن عیش کے گھڑیوں میں گزر جاتے ہیں کیسے

اور دوسری آیت میں آسمان سے زمین تک حضرات ملائکہ کی آمد و رفت کا دن مراد ہے، یعنی حضرات ملائکہ کائنات کے انتظامی امور کو لیکر آسمان سے زمین تک تشریف لاتے ہیں، پھر زمین سے آسمانوں پر واپس چلے جاتے ہیں اور یہ آمد و رفت ایک دن میں ہوجاتی ہے ورنہ تو آسمان و زمین کے مابین پانچ سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے، اگر فرشتہ کے علاوہ کوئی آدمی یہ مسافت طے کرنا چاہے تو ایک ہزار

سال کے عرصہ میں طے ہوگی اور تیسری آیت میں زمین سے لے کر سدرۃ المنتہی تک کی مسافت کا بیان ہے۔ زمین سے سدرۃ المنتہی تک آمد و رفت کا زمانہ پچاس ہزار سال ہے مگر فرشتے ایک دن میں آمد و رفت کر لیتے ہیں، یہ تفسیر حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ، ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، تینوں آیات کی مذکورہ تفاسیر پر ان میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ کما لا یخفی۔

(حاشیہ جلالین، تفسیر خازن، روح المعانی)

تمام ملائکہ کو رسول بنایا گیا ہے یا بعض کو؟

پارہ ۱۷، ۲۲

① ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا﴾

(پ ۱۷، رکوع ۱۷، سورۃ الحج، جلالین ص ۲۸۶)

② ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا﴾

(پارہ ۲۲، رکوع ۱۳، سورۃ فاطر، جلالین ص ۳۶۴)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ ملائکہ میں سے رسولوں کو منتخب کر لیتے ہیں۔ مِن تبعیضیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ملائکہ کو رسول بنایا گیا ہے نہ تمام کو جبکہ اور دوسری آیت میں مِن تبعیضیہ نہ ہونے کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام ملائکہ کو رسول بنایا ہے۔ پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ میں رسل الی بنی آدم مراد ہیں اور دوسری آیت میں ملائکہ کو آپس میں ایک کو دوسرے کی طرف رسول بنانا مراد ہے۔ یعنی حق تعالیٰ نے انسانوں کی طرف تو بعض ملائکہ کو رسول بنا کر بھیجا ہے اور وہ اکابر ملائکہ ہیں جیسے حضرت جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل اور حفظۂ کرام علیہم السلام اور خود آپس میں تمام ملائکہ کو ایک دوسرے

کی طرف رسول بنایا جاتا ہے کہ ہر ایک فرشتہ دوسرے کو اللہ کا کوئی نہ کوئی پیغام پہنچاتا رہتا ہے۔ فلا تعارض بینھما۔ (تفسیر کبیر ص ۵۰، ۱)

۲ دوسری آیت میں رسلاً سے مراد رسلاً الی الانبیاء ہے اور ملائکہ سے مراد بعض ملائکہ ہیں، اس لئے کہ انبیاء کی طرف تمام ملائکہ کو رسول بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے، بعض ملائکہ مراد لینے کی صورت میں یہ آیت آیت اولیٰ کے معارض نہیں رہی۔

(جمل علی الجلالین)

قوم عاد پر کون سا عذاب آیا؟

پارہ نمبر: ۱۸، ۲۴، ۲۶، ۲۷، ۲۹

آیات

① ﴿فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴾

(پارہ: ۱۸ رکوع: ۳ سورۂ مؤمنون جلالین ص: ۲۸۹) ✦

② ﴿فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ﴾

(پارہ: ۲۴ رکوع: ۱۶ سورۂ حم سجدہ (فصلت) جلالین ص: ۳۹۷)

③ ﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ﴾

(پارہ: ۲۴ رکوع: ۱۶ سورۂ حم سجدہ (فصلت) جلالین ص: ۳۹۸)

③ ﴿بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾

(پارہ: ۲۶ رکوع: ۳ سورۂ احقاف جلالین ص: ۴۱۸)

⑤ ﴿وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۱ سورۂ ذاریات جلالین ص: ۴۳۳)

⑥ ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۸ سورۂ قمر جلالین ص: ۴۴۱)

⑦ ﴿وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ﴾

(پارہ: ۲۹ رکوع: ۵ سورۂ حاقہ جلالین ص: ۴۷۱)

تشریح تعارض

یہ آیات قوم عاد پر آنے والے عذاب سے متعلق ہیں، پہلی آیت کے سیاق و سباق میں اگرچہ قوم عاد کی تصریح نہیں ہے بلکہ صرف "ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا

آخرین" کہا گیا ہے مگر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اکثر حضرات نے قرن آخرین کی تفسیر قوم عاد کے ساتھ کی ہے، تائید اس کی اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ قرن آخرین کا ذکر حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ہوا ہے اور سورۂ اعراف، سورۂ ہود، سورۂ شعراء میں حضرت نوح علیہ السلام کے بعد حضرت ہود علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سورۂ مؤمنون میں بھی قرن آخرین کا مصداق حضرت ہود علیہ السلام کی قوم یعنی قوم عاد ہے اور بعد کی کچھ آیات میں تو قوم عاد کی تصریح ہے، اس طرح یہ سب آیات قوم عاد سے متعلق ہیں مگر قوم عاد کو جس عذاب سے ہلاک کیا گیا اس کے بیان میں یہ آیات بظاہر متعارض ہیں، چنانچہ پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صیحہ یعنی چیخ سے ہلاک کیا گیا اور دوسری آیت میں صاعقہ یعنی بجلی کا ذکر ہے اور اس کے بعد کی پانچ آیات میں ہے کہ ریح (ہوا اور آندھی) سے ہلاک کیا گیا، کسی آیت میں مطلق ریح اور کسی میں ریح صرصر (تیز آندھی)، کسی میں ریح عقیم (بانجھ ہوا) یعنی خیر و برکت سے خالی ہوا، کسی میں ریح عاتیہ (حد سے تجاوز کرنے والی آندھی) کا ذکر ہے، اس طرح ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

1. اصل عذاب تو آندھی کا آیا تھا مگر اس کو پہلی دو آیتوں میں صیحہ اور صاعقہ سے تعبیر کر دیا گیا اس اعتبار سے کہ صیحہ سے مطلق عقوبت ہلاکت مراد ہے اور صاعقہ کے معنی بھی لغت میں مطلق عذاب کے آتے ہیں جیسا کہ قوم ثمود کے عذاب کے متعلق دفع تعارض کے ذیل میں گزر چکا ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (حاشیہ جلالین)

2. حضرت جبرئیل علیہ السلام کی چیخ اور تیز آندھی دونوں سے ہلاک کیا گیا اور صاعقہ بھی عذاب ہے۔ فلا تعارض۔ (حاشیہ جلالین)

قیامت کے دن لوگ آپس میں ایک دوسرے سے سوالات کریں گے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱۸، ۲۳، ۲۷

آیات

① ﴿ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ ﴾

(پارہ: ۱۸ رکوع: ۶ سورۂ مؤمنون جلالین ص: ۲۹۳)

② ﴿ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ ﴾

(پارہ: ۲۳ رکوع: ۶ سورۂ صٰفّٰت جلالین ص: ۳۷۳)

③ ﴿ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ ﴾

(پارہ: ۲۳ رکوع: ۶ سورۂ صٰفّٰت جلالین ۳۷۵)

④ ﴿ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۳ سورۂ طور جلالین ص: ۴۳۶)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت میں تساؤل کی نفی ہے کہ قیامت کے روز لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کوئی سوال نہیں کریں گے اور اخیر کی تین آیات میں تساؤل کا اثبات ہے کہ سوال کریں گے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ اختلاف احوال و اماکن پر محمول ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ قیامت کے مختلف احوال و متعدد مواضع ہوں گے، بعض مواضع میں لوگوں پر خوف و گھبراہٹ طاری ہوگی، ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی ہوگی، نفسی نفسی کا عالم ہو گا، کوئی شخص کسی دوسرے سے کوئی سوال اور بات چیت نہیں کرے گا پھر دوسرے بعض مواضع میں لوگوں کو کچھ افاقہ ہوگا گھبراہٹ دور ہوگی تو ایک دوسرے سے بات چیت اور سوالات کریں گے، ولا تعارض بعد اختلاف الاحوال والاماکنۃ۔

(حاشیہ جلالین)

❷ اختلاف زمان پر محمول ہے کہ نفی تساؤل نفخۂ اولیٰ کے وقت ہے، جس وقت زمین پر کوئی باقی نہیں رہے گا اور اثبات نفخۂ ثانیہ میں ہے کہ جب لوگ زندہ ہو کر میدان محشر میں جمع ہوں گے تو آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ تاچھ کریں گے، یہ توجیہ بھی ایک جماعت نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

❸ نفی تساؤل عن الانساب کی ہے اور اثبات دوسری چیزوں کے متعلق تساؤل کا ہے، یعنی یہ کفار قیامت کے دن آپس میں ایک دوسرے سے نسب کے متعلق تو کوئی سوال نہیں کریں گے کہ تو کس خاندان اور کس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے اور تو کس قبیلہ سے ہے؟ اس لئے کہ "انساب" سے اس دن کوئی نفع نہیں پہنچے گا، البتہ دیگر امور کے متعلق ایک دوسرے سے پوچھ تاچھ کریں گے، پس جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں ہے جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

مذکورہ تینوں جوابات پہلی دو آیتوں کے تعارض کے ہیں جو کفار سے متعلق ہیں۔

اور اخیر کی دونوں آیتیں چونکہ اہل جنت سے متعلق ہیں جیسا کہ ان کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے اس لئے پہلی آیت اور ان دونوں آیتوں کا تعارض اختلاف اشخاص کی وجہ سے مرتفع ہو جائے گا کہ کفار تو سوال نہیں کریں گے البتہ اہل جنت سوال کریں گے۔

زوانی سے عفائف کا نکاح حلال ہے یا حرام؟

پارہ نمبر: ۱۸

آیات

① ﴿اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً٘ وَّ الزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌۚ وَ حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ﴾

(پارہ: ۱۸، رکوع: ۷، سورۂ نور، جلالین ص: ۲۹۳)

② ﴿وَ اَنْكِحُوا الْاَیَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآىٕكُمْ﴾

(پارہ: ۱۸، رکوع: ۱۰، سورۂ نور، جلالین ص: ۲۹۸)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ زانی نہیں نکاح کرتا ہے مگر زانیہ یا مشرکہ سے اور زانیہ سے نہیں نکاح کرتا ہے مگر زانی یا مشرک اور زوانی سے نکاح کرنا مومنین پر حرام کر دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک صالح اور عفیف مرد و عورت کا نکاح زانی اور زانیہ سے حرام ہے اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ ایامیٰ[1] (یعنی بے نکاحوں) کا نکاح کرادو۔ یہ حکم مطلق ہے اس میں زوانی و عفائف کی کوئی قید نہیں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زانی کا عفیفہ سے اور عفیف کا زانیہ سے نکاح درست ہے پس ان دونوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

---

(۱) ایامیٰ ایّم کی جمع ہے یعنی بے نکاح مرد و عورت، کنوارا کنواری یا رنڈوے

❶ پہلی آیت دوسری آیت سے منسوخ ہے۔ ابتداء مشرکہ کو نکاح زانی سے حرام تھا پھر یہ حرمت منسوخ ہوئی اور مطلق حکم نازل فرمادیا "وانکحوا الایامی منکم" ولا تعارض بعد النسخ۔ (احکام القرآن جصاص)

❷ آیت اولیٰ کا مطلب یہ ہے کہ زانی مشرکہ کا کفو نہیں ہے۔ زانی سے مشرکہ کا نکاح درست تو ہو جائے گا مگر غیر کفو میں ہونے کی وجہ سے غیر مناسب رہے گا اور "وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ" میں ذٰلک سے اشارہ زنا اور شرک کی طرف ہے نہ کہ نکاح زانی کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ زنا کرنا اور شرک کرنا مؤمنین پر حرام کر دیا گیا ہے۔ پس یہ آیت حرمت نکاح زانی پر دال ہی نہیں ہے لہٰذا یہ دوسری آیت کے معارض نہیں ہے۔ (احکام القرآن)

❸ آیت اولیٰ میں نکاح زانی کی حرمت سب کے حق میں عام نہیں ہے بلکہ چند فقراء مہاجرین کے ساتھ مخصوص ہے جنہوں نے مدینہ میں رہنے والی مالدار مشرکہ زانیہ عورتوں سے نکاح کرنے کی خواہش کی تھی، حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر ان کے لئے خاص طور سے ان عورتوں سے نکاح کرنا حرام کر دیا تھا۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی منقول ہے، یہی حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، عطاء رحمۃ اللہ علیہ، زہری رحمۃ اللہ علیہ، شعبی رحمۃ اللہ علیہ اور قتادہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ جب یہ آیت ان کے حق میں مخصوص ہوئی اور دوسری آیت ان کے علاوہ دیگر تمام لوگوں کے متعلق ہے تو اختلاف اشخاص کی وجہ سے تعارض نہیں رہا۔ ([illegible])

شیاطین ملائکہ کا کلام سن لیتے ہیں یا نہیں؟

پارہ نمبر ۱۹

آیات

① ﴿اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ﴾ (پارہ ۱۹، [illegible])

② ﴿يُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ﴾ (پارہ ۱۹، [illegible])

تشریح تعارض

پہلی آیت میں اِنَّهُمْ کی ضمیر شیاطین کی طرف راجع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ شیاطین ملائکہ کا کلام سننے سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیاطین ملائکہ کا کلام نہیں سنتے ہیں اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ یہ شیاطین ملائکہ سے سنی ہوئی باتوں کو کاہنوں تک پہنچا دیتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیاطین کلام ملائکہ سنتے ہیں، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت یا بعثت سے قبل شیاطین آسمانوں تک چلے جاتے تھے اور ملائکہ ان امور و حوادث کے بارے میں جو مستقبل میں رونما ہونے والے ہیں جو باہم گفتگو آپس میں کرتے ہوتے تھے یہ شیاطین ان کی گفتگو کو سن لیتے

اور اس میں بہت سی باتیں اپنی طرف سے جھوٹ ملا کر کاہنوں کے کانوں میں ڈال دیتے تھے، کاہن لوگ جیسے مسیلمہ کذاب وغیرہ ان امور کے متعلق لوگوں کو خبر دیتے تھے مثلاً فلاں دن بارش آنے کی، زلزلہ آنے کا وغیرہ وغیرہ، ان میں سے بعض باتیں صادق آجاتی تھیں اور بہت سی جھوٹی ثابت ہوتی تھیں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت یا بعثت کے بعد شیاطین کو آسمان پر جانے اور ملائکہ کا کلام سننے سے روک دیا گیا، جب کوئی شیطان اوپر جاتا ہے تو شہاب ثاقب اس کے پیچھے لگا دیا جاتا ہے جس سے وہ یا تو ہلاک ہو جاتا ہے یا زخمی اور پاگل ہو جاتا ہے، پس دوسری آیت جس میں سماع کا اثبات ہے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت یا بعثت سے قبل پر محمول ہے اور پہلی آیت جس میں سماع کی نفی ہے وہ آپ کی ولادت یا بعثت کے بعد پر محمول ہے، ولا تعارض بعد اختلاف الزمان۔ (تفسیر جلالین، ص [illegible])

❷ پہلی آیت میں سمع سے مراد ملائکہ کی پوری گفتگو مکمل اچھی طرح اطمینان سے سننا ہے کہ شیاطین ملائکہ کا پورا کلام اچھی طرح اطمینان سے نہیں سن پاتے ہیں اور دوسری آیت میں سمع سے مراد جلدی سے چوری چھپے کسی بات کو اچکتے ہوئے سن لینا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے سورۂ حجر میں فرمایا ''اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِیْنٌ'' استراق سمع کے معنی چوری چھپے سن لینا اور سورۂ صافات میں ارشاد ہے ''اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ'' خطف کے معنی جلدی سے اچک لینا، چھین لینا۔ یعنی یہ شیاطین آسمانوں پر جاتے ہیں تو ان کو شہاب ثاقب (ستارہ) کے ذریعے بھگا دیا جاتا ہے، وہ اتنی دیر میں چوری چھپے کچھ گفتگو اچکتے ہوئے سن لیتے ہیں، پھر کاہنوں کے کانوں میں ڈال دیتے ہیں۔ پس پہلی آیت میں نفی سماعِ کامل کی ہے اور دوسری آیت میں اثبات سماعِ ناقص کا ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (تفسیر خازن وغیرہ)

❸ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت اولیٰ میں سماعِ علوم کلیہ متعلقہ

باصلاح مخلوق کی نفی ہے اور دوسری آیت میں الغیب و جزئیہ غیر متعلقہ بالاصلاح کے ادراک کا اثبات ہے، یعنی یہ شیاطین ان معلومات کلیہ کو سننے سے محجوب و محروم ہیں جو مخلوق کی اصلاح سے متعلق ہیں، البتہ امور جزئیہ کی خبریں جن کا مخلوق کی اصلاح سے کوئی تعلق نہیں ہے ان کو معلوم ہو جاتی ہیں۔ جس کی نفی اس کا اثبات نہیں اور جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں، فلا تعارض۔ (بیان القرآن)

حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام پرندوں کی بولی سمجھتے تھے یا غیر پرندوں کی بھی؟

پارہ نمبر: ۱۹

آیات

① ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ﴾

(پارہ ۱۹، رکوع: ۱۷، سورۃ نمل جلالین ص: ۳۱۸)

② ﴿قَالَتْ نَمْلَةٌ يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّن قَوْلِهَا﴾

(پارہ ۱۹، رکوع: ۱۷، سورۃ نمل جلالین ص: ۳۰۸)

تشریحِ تعارض

آیت اولیٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو پرندوں کی بولی سکھا دی تھی، حضرت سلیمان علیہ السلام پرندوں کی بولی سمجھ لیتے تھے اور دوسری آیت میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو چیونٹی کی بات سن کر ہنسی آگئی تھی۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا عظیم لشکر طائف یا شام میں چیونٹیوں کی وادی پر سے گزرا تو ایک چیونٹی نے جو تمام چیونٹیوں کی ملکہ اور رانی تھی اپنی رعایا کو خطاب کرتے ہوئے متنبہ کیا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ﴾

ترجمہ: "کہ اے چیونٹیو! تم سب اپنے سوراخوں میں داخل ہو جاؤ حضرت

سلیمان علیہ السلام کا لشکر چلا آرہا ہے، کہیں سلیمان علیہ السلام اور ان کا لشکر لاعلمی کی حالت میں تم کو اپنے پاؤں سے کچل نہ ڈالیں۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام نے چیونٹی کی یہ بات سنی اور اس کی عقل و دانش پر تعجب کرتے ہوئے مسکرائے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام غیر پرندوں کی بولی بھی سمجھ جاتے تھے کیونکہ چیونٹی پرندہ نہیں ہے، چنانچہ ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے چار جواب ہیں:

❶ یہ چیونٹی ذات جناحین (دو پروں والی) تھی جیسا کہ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، اس اعتبار سے اس کا شمار بھی پرندوں میں ہو جائے گا، بہت سی چیونٹیوں کے پر نکل آتے ہیں جن سے وہ اڑتی ہیں، اب یہ آیت پہلی آیت کے معارض نہیں رہتی۔ (روح المعانی)

❷ حضرت سلیمان علیہ السلام اکثر و بیشتر تو پرندوں کی بولی سمجھتے تھے لیکن کبھی کبھی غیر پرندوں کی بولی بھی سمجھ جاتے تھے، پہلی آیت میں غیر پرندوں کی بولی سمجھنے کی نفی نہیں ہے، کسی شے کا اثبات ماعدا کی نفی پر دلالت نہیں کرتا ہے، **علمنا منطق الطیر** سے یہ لازم نہیں آتا کہ غیر طیر کی بولی نہیں سمجھتے تھے لہٰذا اس آیت کا آیت اولیٰ سے کوئی تعارض نہیں ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

❸ چیونٹی کو حق تعالیٰ نے انسانی گویائی عطا فرمادی تھی اور یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے معجزہ تھا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک گوہ کو حق تعالیٰ نے تکلم عطا فرما دیا تھا، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت دی تھی، لہٰذا آیت ثانیہ میں یہ مراد نہیں ہے کہ چیونٹی اپنی بولی بول رہی تھی اور حضرت

سلیمان علیہ السلام اس کو سمجھ گئے بلکہ انسانی بولی بولنے کی وجہ سے اس کی بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ (تفسیر روح المعانی)

۲ حضرت سلیمان علیہ السلام نے چیونٹی کی بولی جو نہیں سنی تھی بلکہ حق تعالیٰ نے چیونٹی کی بات کا علم ان کو یا تو بطور الہام کے یا بقول علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرشتے کے ذریعے عطا فرما دیا تھا لہٰذا آیت ثانیہ سے ہُدہُد کی بولی کا سمجھنا لازم نہیں آتا، فلا تعارض بینہما۔ (تفسیر روح المعانی)

نفخۂ اولیٰ کے وقت لوگوں پر گھبراہٹ طاری ہوگی یا موت؟

پارہ نمبر: ۲۰، ۲۴

① ﴿وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ﴾
(پارہ ۲۰، رکوع ۲، سورۂ نمل جلالین ص ۳۲۵)

② ﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ﴾
(پارہ ۲۴، رکوع ۴، سورۂ زمر جلالین ص ۳۹۰)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ۱ میں **ففزع** فرمایا: فزع کے معنی خوف اور گھبراہٹ کے آتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفخۂ اولیٰ کے وقت تمام مخلوق پر گھبراہٹ اور خوف طاری ہو جائے گا اور دوسری آیت میں **فصعق** ہے، صعق کے معنی بے ہوشی اور موت کے آتے ہیں، صاحب جلالین نے اس کی تفسیر مات کے ساتھ کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفخۂ اولیٰ کے وقت تمام مخلوق پر موت طاری ہو جائے گی، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ ابتداءً خوف طاری ہوگا، پھر یہ خوف موت تک مفضی ہو جائے گا اور سب مر جائیں گے، آیت اولیٰ میں اول حالت اور دوسری آیت میں آخر حالت کو بیان کیا گیا ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (تفسیر جلالین)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈالتے وقت ان کی والدہ پر خوف کا اثبات ونفی

پارہ نمبر: ۲۰

آیت

① ﴿فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي﴾
(پارہ ۲۰ رکوع ۴ سورۃ القصص جلالین ص: ۳۲۶)

تشریحِ تعارض

اس آیت کے اول و آخر میں بظاہر تعارض ہے، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی اور اس زمانہ میں فرعون بنی اسرائیل کے نومولود بچوں کو قتل کرا رہا تھا تو موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو خوف ہوا تو حق تعالیٰ نے ان کو الہام کیا کہ تم اس بچے کو دودھ پلاتی رہو جب تم کو اس بچے پر خوف ہو تو اس کو (تابوت میں بند کر کے) دریائے نیل میں ڈال دینا اور خوف وغم نہ کرنا اس آیت کے حصہ اول یعنی فاذا خفت میں خوف کا اثبات اور دوسرے حصہ میں ولا تخافی کہہ کر خوف کی نفی ہے، پس آیت کے اول و آخر میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ اثبات قتل کے خوف کا ہے اور نفی غرق کے خوف کی ہے کہ اگر تم کو فرعون کی جانب سے اس بچے کے قتل کا خوف ہو تو دریائے نیل میں ڈال دینا اور اس کے غرق ہونے کا خوف نہ کرنا، ہم اس کی حفاظت کریں گے لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (جمل علی الجلالین)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو ہدایت دے سکتے ہیں یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۲۰، ۲۱، ۲۵

آیات

① ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ﴾

(پارہ ۲۰، رکوع ۹ سورۂ قصص جلالین ص: ۳۳۲)

② ﴿وَمَا أَنتَ بِهَادِي الْعُمْيِ عَن ضَلَالَتِهِمْ﴾

(پارہ: ۲۱، رکوع ۶ سورۂ روم جلالین ص: ۳۴۵)

③ ﴿وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾

(پارہ ۲۵، رکوع ۵ سورۂ شوریٰ جلالین ص: ۴۰۵)

تشریح تعارض

آیت نمبر ا و ۲ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہدایت دینے کی نفی کی گئی ہے کہ آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، نیز آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے ہدایت نہیں دے سکتے اور آیت نمبر ۳ میں ہدایت دینے کا اثبات ہے کہ آپ صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرتے ہیں، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

ہدایت کے دو معنی آتے ہیں ایک ایصال الی المطلوب، مقصود تک پہنچا دینا جس کو خلق اھتداء (ہدایت پیدا کردینا) سے تعبیر کیا جاتا ہے، دوسرے ارائۃ

الطریق، صرف راستہ دکھا دینا خواہ مطلوب تک رسائی ہو یا نہ ہو۔ پہلی دو آیتوں میں نفی ہدایت بمعنی اول (خلق اهتداء) کی ہے اور آیت نمبر ۳ میں اثبات ہدایت بالمعنی الثانی (اراءۃ الطریق) کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ لوگوں کے قلوب میں ہدایت پیدا نہیں کر سکتے، ان کو مطلوب تک نہیں پہنچا سکتے بلکہ آپ تو صرف سیدھا راستہ دکھا سکتے ہیں، ہدایت پیدا کرنا ہمارا کام ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (تفسیر صاوی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ازواج مطہرہ تسعہ کے علاوہ مزید عورتوں سے نکاح کرنا حلال تھا یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۲۲

آیات

① ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ﴾

(پارہ ۲۲، رکوع ۳، سورۃ احزاب جلالین ص ۳۵۶)

② ﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ﴾

(پارہ ۲۲، رکوع ۳، سورۃ احزاب جلالین ص: ۳۵۶)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ اے نبی! ہم نے آپ کے لئے وہ عورتیں حلال کردی ہیں جن کو ان کے مہر دے کر اپنے نکاح میں لائیں۔ اس میں کوئی تعداد مذکور نہیں ہے کہ کتنی عورتیں حلال ہیں بلکہ جتنی عورتوں سے چاہیں آپ شادی کر سکتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نکاح میں جو نو[1] ازواج مطہرات تھیں ان کے علاوہ اور دیگر عورتوں سے نکاح کرنا بھی آپ کے لئے حلال تھا اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے موجودہ نو ازواج مطہرات کے بعد کسی عورت سے نکاح حلال نہیں اور نہ ان میں سے کسی کو طلاق دیکر اس کے بدلہ میں

(1) حضرت عائشہ بنت ابی بکر الصدیق، حضرت حفصہ بنت عمر، حضرت ام حبیبہ رملہ بنت ابی سفیان، حضرت ام سلمہ ہند بنت ابی امیہ المخزومیہ، حضرت سودہ بنت زمعہ العامریہ، حضرت زینب بنت جحش الاسدیہ، حضرت میمونہ بنت الحارث الہلالیہ، حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطب الخیبریہ الہارونیہ، حضرت جویریہ بنت الحارث الخزاعیہ المصطلقیہ رضی اللہ عنہن۔

دوسری عورت سے نکاح کرنا حلال ہے۔ پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

1 آیت اولیٰ ناسخ اور آیت ثانیہ منسوخ ہے ابتداءً آپ کے لئے ازواجِ مطہرہ تسعہ کے علاوہ کسی عورت سے نکاح حلال نہیں تھا اور نہ تبدیلی حلال تھی، پھر حق تعالیٰ نے یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ الخ نازل فرما کر یہ ممانعت منسوخ فرمادی اور جتنی عورتوں سے چاہیں نکاح کرنے کی اجازت دیدی۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، اور امام ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نسخ ہی کے قائل ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی یہی مروی ہے، البتہ ناسخ کی تعیین میں اختلاف ہے، یا تو ناسخ یہی آیت "اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الخ" ہے یا "تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَ تُؤْوِیْۤ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ الخ" ہے یعنی "تُطَلِّقُ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُمْسِكُ مَنْ تَشَآءُ" یہ تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے قول اخیر کی تائید حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ایک روایت صحیحہ سے ہوتی ہے:

عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها قالت: لم يمت رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى احل الله تعالىٰ له ان يتزوج من النساء ما شاء الا ذات محرم لقوله سبحانه: ﴿ترجي من تشاء منهن وتؤوي اليك من تشاء﴾ (رواه ابوداؤد في ناسخه والترمذي وصححه والنسائي والحاكم وصححه وابن المنذر وغيرهم روح المعانی ۲۲/۲۹)

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ فرماتی ہیں

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اس وقت تک نہیں ہوئی یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے آپ کے لئے حلال کردیا کہ محرم عورتوں کے علاوہ جتنی عورتوں سے چاہیں شادی کرلیں حق تعالیٰ کے ارشاد "تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِیْٓ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ الخ" کی وجہ سے۔"

اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ناسخ کا منسوخ سے موخر ہونا ضروری ہے اور یہاں ناسخ خواہ (اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ) ہو یا (تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ) ہو مقدم ہے منسوخ پر، اس لئے کہ ناسخ کا نزول کے اعتبار سے منسوخ سے موخر ہونا ضروری ہے۔ تلاوت کے اعتبار سے ناسخ مقدم ہوسکتا ہے، قرآن پاک میں ترتیب تلاوت کے اعتبار سے اگرچہ ناسخ مقدم ہے مگر نزول کے اعتبار سے مؤخر ہے، بہرحال نسخ کے بعد کوئی تعارض نہیں رہتا۔ (تفسیر مدارک، روح المعانی، الفوز الکبیر)

❷ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ، سے اس کے برعکس بھی مروی ہے کہ ابتداءً علی العموم جتنی عورتوں سے چاہیں نکاح کرنا حلال تھا، پھر لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ الخ نازل فرما کر عموم کو منسوخ کردیا گیا کہ ان نو عورتوں کے علاوہ کسی سے نکاح حلال نہیں اور نہ تبدیلی جائز ہے، اس صورت میں پہلی آیت منسوخ اور دوسری آیت ناسخ ہے جو نزول و تلاوت دونوں اعتبار سے مؤخر ہے، بہرحال اس صورت میں بھی نسخ کی وجہ سے تعارض مرتفع ہوگیا۔ (روح المعانی)

❸ آیت نمبر ۲ لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ کا مطلب بعد الاصناف المذکورۃ ہے یعنی اوپر جو آپ کے لئے عورتوں کی اصناف اربعہ حلال کی ہیں:

① مہر دے کر نکاح کی گئی عورتیں،

② مملوکہ باندیاں،

③ مہاجرات میں بنات اعمام، بنات اخوال، بنات خالات،

(۴) بغیر مہر کے اپنے کو آپ کے لئے ہبہ کر دینے والی عورتیں۔

ان اصناف اربعہ کے علاوہ اور کسی عورت سے نکاح کرنا آپ کے لئے حلال نہیں مثلاً غیر مہاجرہ، غیر مملوکہ اور بغیر مہر اور بغیر ہبہ کے کوئی عورت آپ کے لئے حلال نہیں ہے، اس تفسیر پر نہ تو یہ آیت منسوخ ہوگی اور نہ پہلی آیت کے معارض ہوگی۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ، طبری رحمۃ اللہ علیہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے محکم ہونے ہی کے قائل ہیں۔ (تفسیر روح المعانی، حاشیہ جلالین)

قیامت کے دن کفار کی نگاہیں تیز ہوں گی یا ضعیف و سست؟

پارہ نمبر: ۲۶،۲۵

آیات

① ﴿وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ﴾ (پارہ ۲۵ رکوع ۶ سورۂ شوریٰ جلالین ص: ۴۰۳)

② ﴿لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ﴾ (پارہ ۲۶ رکوع ۱۶ سورۂ ق جلالین ص: ۴۳۰)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ آپ کفار کو دیکھیں گے جب ان کو جہنم کے سامنے لایا جائے گا تو ان کی نگاہیں ذلت کے مارے جھکی ہوئی ہوں گی، وہ جہنم کو ضعیف نگاہوں سے (نظریں چراتے ہوئے) دیکھتے ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں کفار کی نظریں ضعیف اور سست ہوں گی اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ (کافر کو قیامت کے دن حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ) تو دنیا میں اس چیز سے غفلت میں پڑا ہوا تھا، آج ہم نے تیری غفلت کا پردہ دور کر دیا، پس تیری نگاہ آج بڑی تیز ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کفار کی نگاہیں شدید اور تیز ہوں گی، پس دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے کیونکہ شدت اور ضعف متعارض امور میں سے ہیں۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ آیت ثانیہ میں بصر سے مراد نگاہ نہیں بلکہ علم و معرفت مراد ہے، دلیل اس کی فَکَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ ہے کیونکہ اس میں پردہ سے مراد نگاہوں کا پردہ نہیں بلکہ غفلت کا پردہ ہے جیسا کہ اس سے قبل لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فرمایا اور غفلت کا پردہ قلب پر ہوتا ہے نہ کہ نگاہوں پر اور قلب محل ہے علم و معرفت کا، جب قلب پر سے غفلت کا پردہ دور کر دیا جائے تو علم و معرفت میں شدت اور تیزی آ جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو دنیا میں امور آخرت کی معرفت اور یقین سے عاری تھا، ان امور کا منکر تھا کیونکہ تیرے قلب پر غفلت کا پردہ پڑا ہوا تھا آج ہم نے پردہ ہٹا دیا تو تیرا علم، تیری معرفت آج اس قدر تیز ہوگئی ہے کہ تو ہر شئے کو جان اور پہچان رہا ہے، تجھ کو آج ہر اس چیز کا یقین ہوگیا ہے جس کا تو دنیا میں منکر تھا، بس پہلی آیت میں جو ضعف مذکور ہے وہ ضعف بصری ہے اور دوسری آیت میں شدت و حدت علم اور معرفت کی مراد ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (الاتقان مع التوضیح)

❷ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ آیت ثانیہ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا میں خطاب کافر کو نہیں ہے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان امور مذکورہ بالا (نفخ، بعث وغیرہ) سے غافل تھے، ہم نے آپ پر وحی نازل کر کے اور قرآن کریم کی تعلیم دے کر آپ کے پردہ غفلت کو دور کر دیا ہے، پس آج آپ کی نگاہ و بصیرت تیز ہوگئی ہے، آپ ان چیزوں کو دیکھتے ہیں جن کو دوسرے لوگ نہیں دیکھتے، ان چیزوں کو جانتے ہیں جن کو دوسروں کو علم نہیں، اس صورت میں اختلاف اشخاص کی وجہ سے تعارض مرتفع ہو جاتا ہے کیونکہ آیت اولیٰ کفار سے متعلق ہے اور یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے مگر یہ تفسیر سیاق و سباق کے مناسب نہیں ہے اس لئے یہ ساقط الاعتبار ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

اللہ نے شہر مکہ کی قسم کھائی یا نہیں؟

پارہ نمبر ۳۰

آیات

① ﴿لَآ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ﴾ (پ ۳۰، ر ۱۵، سورۃ بلد، جلالین ص ۴۹۹)

② ﴿وَالتِّيۡنِ وَالزَّيۡتُوۡنِ وَطُوۡرِ سِيۡنِيۡنَ وَهٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِيۡنِ﴾

(پارہ ۳۰، رکوع ۲۰، سورۃ تین، جلالین ص ۵۰۲)

شرحِ تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ میں اس شہر مکہ کی قسم نہیں کھاتا ہوں۔ اور دوسری آیت میں حق سبحانہ نے وَهٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِيۡنِ کہہ کر شہر مکہ کی قسم کھائی ہے کیونکہ اس سے پہلے والتین پر واؤ قسمیہ داخل ہے اور اس کے بعد کے تینوں کلمے وَالزَّيۡتُوۡنِ وَطُوۡرِ سِيۡنِيۡنَ وَهٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِيۡنِ اسی پر معطوف ہیں لہٰذا پہلی آیت میں شہر مکہ کی قسم کھانے کی نفی اور دوسری آیت میں ثبوت ہے، اس طرح یہ دونوں آیتیں بظاہر متعارض ہیں۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ لا اقسم میں لا زائدہ ہے، تحسینِ کلام کے لئے لا کا اضافہ کر دیا جاتا ہے اس سے قسم کی نفی نہیں ہوگی، اصل عبارت اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ ہے، جس سے آیت دوسری آیت کے معارض نہیں ہے۔ (جلالین وغیرہ)

❷ یہ لا نہیں ہے بلکہ لام ہے اصل لَاُقۡسِمُ تھا لام کے فتح میں اشباع کر کے اس

کو کھینچ کر پڑھا گیا جس سے الف ظاہر ہو گیا ہے۔ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ انہوں نے لاقسم پڑھا ہے، اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت عثمان صلی اللہ علیہ وسلم کے مصحف شریف میں لاقسم بغیر الف کے لکھا ہے، قاری قنبل کی قرأت بھی یہی ہے۔ پھر یہ لام کیسا ہے اس میں تین احتمال ہیں:

(۱) یہ لام ابتداء ہے اور اقسم مبتداء محذوف کی خبر ہے یعنی لَاَنَا اُقْسِمُ۔

(۲) اس کو لام تاکید مانا جائے جو فعل مضارع پر داخل ہے جیسا کہ اِنَّ رَبَّکَ لَیَحْکُمُ بَیْنَهُمْ، میں لام تاکید فعل مضارع پر داخل ہے۔

(۳) یہ لام قسم ہے مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ لام قسم کے تحت فعل کو اہل عرب نون تاکید کے ساتھ مؤکد کرتے ہیں، چنانچہ اہل عرب لافعل کذا نہیں کہتے بلکہ لَاَفْعَلَنَّ کَذَا کہا کرتے ہیں اس بناء پر یہاں لاقسمن ہونا چاہئے تھا، اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی صورت میں نون تاکید کا لانا ضروری و لازمی نہیں ہے بلکہ یہ حکم اکثری ہے، اکثر و بیشتر نون تاکید کا استعمال ہوتا ہے ورنہ تو بغیر نون کے بھی جائز ہے۔ امام واحدی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ سیبویہ اور امام فراء سے اس کا جواز نقل کیا ہے، یہ تفصیل روح المعانی اور تفسیر کبیر میں لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ کے تحت مذکور ہے جس کو ہم نے لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ کے تحت ذکر کر دیا ہے۔ لِیَتَوَافَقَ الْجُمْلَتَیْنِ۔

❹ لاقسم میں لا زائدہ نہیں ہے بلکہ اہل عرب تاکید قسم کے لئے لا کا اضافہ کر دیتے ہیں اس سے قسم میں مزید تاکید پیدا ہو جاتی ہے۔[۱] وجہ اس کی یہ ہے کہ قسم کسی قابل عظمت شئے کی کھائی جاتی ہے، قسم کھا کر اس شئے کی عظمت اور اس کے احترام کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے، لاقسم بھذا البلد میں شہر مکہ کی قسم کھا کر اس کی عظمت کو ظاہر کرنا مقصود ہے، اس عظمت و منقبت کو مزید مؤکد کرنے کے لئے لا کا اضافہ کر دیا گیا کہ شہر مکہ کی عظمت فی نفسہ اس قدر ظاہر و عیاں اور مشہور و مسلم ہے کہ قسم

(۱) تفسیر کبیر، خازن، روح المعانی وغیرہ۔

کھانے کی ضرورت نہیں ہے مگر میں قسم کھا کر اس کی عظمت کو مزید مؤکد کرتا ہوں یعنی "لاحاجة الى القسم لاثبات عظمة هذا البلد لانه معظم و محترم في نفسه لكن أُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ لتاكيد عظمته."

اس تفصیل سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ لا سے مقصود قسم کی نفی نہیں ہے لہٰذا یہ آیت آیتِ ثانیہ کے معارض نہیں ہے، کیونکہ دونوں آیتوں میں قسم کا اثبات بلکہ تاکید اور مکہ معظمہ کی عظمت و شرافت کا اظہار مقصود ہے کہ شہر مکہ بہت سی عظمتوں کا حامل ہے ایک تو وہ فی نفسہ معظم و مکرم ہے دوسرے قسم کھانے کی وجہ سے مزید شرافت و عظمت آگئی، تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کا سب سے پہلا مشرف و مکرم امن و سلامتی اور برکت و ہدایت والا گھر اسی شہر مکہ میں موجود ہے۔

"قَالَ تَعَالَى: ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا﴾"

چوتھے یہ کہ مدار کائنات، فخر الانبیاء والرسل، نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا مسکن و مولد ہے، آفتاب ختم نبوت اسی شہر میں طلوع ہوا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا اکثر حصہ اسی شہر میں گزرا ہے، اسی کو حق تعالیٰ نے آگے فرمایا "وَأَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ، أَيْ حَالٌ، أَيْ نَازِلٌ مُقِيمٌ بِهٰذَا الْبَلَدِ" کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ میں سکونت پذیر ہونے کی وجہ سے مکہ مکرمہ کی عظمت و مرتبت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے "فتلك مكة مكرمة مباركة لها مناقب وفضائل بعضها فوق بعض، زادها الله تعالى حرمة وشرفا كل ساعة من الساعات، وصانها عن جميع الشرور و الآفات، ورزقنا حضورها وزيارتها مرة بعد اخرى بالخير والطاعات، آمين يا كاشف الضرات ويا قاضي الحاجات.

بنی اسرائیل نے بقرہ ذبح کیا تھا یا نہیں؟

پارۂ اوّل

آیت

① ﴿فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ﴾ (پارہ:۱، سورۃ البقرۃ، جلالین ص:۱۳)

تشریح تعارض

اس آیت کے جزء اول و جزء ثانی میں بظاہر تعارض ہے بایں طور کہ اس سے اوپر بنی اسرائیل کا ایک قصہ بیان کیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں سے دو بھائیوں نے اپنے ایک چچا زاد بھائی کو قتل کر ڈالا تا کہ اس کے مال کے وارث و مالک بن جائیں اور قتل کرکے اس کی لاش محلے کے دروازے پر ڈال دی اور خود ہی دونوں اس کے خون کا بدلہ طلب کرنے کے لئے آگئے کہ ہمارے چچا زاد بھائی کو کس نے قتل کیا ہے؟ ہمیں اس کے خون کا بدلہ چاہئے، لوگوں کو قاتل کا کچھ علم نہ تھا، قاتل کا پتہ لگانے کے لئے پریشان تھے اور جھگڑا کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے قاتل کے پتہ لگانے کا ایک طریقہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بذریعہ وحی نازل فرمایا کہ ان لوگوں سے کہو ایک بیل ذبح کرکے اس کو مقتول کے بدن سے مس کردو یعنی چھوا دو، وہ مقتول زندہ ہو کر بول اٹھے گا اور قاتل کا نام خود بتلادے گا، اتنی خبر سن کر یہ لوگ اگر کوئی سا بیل بھی ذبح کر دیتے تو کافی ہو جاتا مگر انہوں نے اس طریقہ کو عجیب تصور کرتے ہوئے سوچا کہ اس عجیب کام کے لئے بیل بھی کوئی عجیب و غریب قسم کا لینا پڑے گا جس میں تحقیق قاتل کا خاص اثر ہو چنانچہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اللہ سے یہ معلوم کرلیجئے کہ اس بیل کے اوصاف کیا ہوں گے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام

نے فرمایا کہ اللہ جواب میں یوں فرماتے ہیں کہ وہ بیل نہ تو بوڑھا ہونا چاہئے اور نہ بچہ، بلکہ ادھیڑ عمر کا ہونا چاہئے اور اس کام کو کر گزرو، زیادہ حجتیں مت نکالنا، بنی اسرائیل بولے اچھا یہ اور معلوم کر لیجئے کہ اس کا رنگ کیسا ہونا چاہئے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ یوں فرماتے ہیں کہ اس کا رنگ تیز زرد ہونا چاہئے جو دیکھنے والوں کو خوش کردے، بنی اسرائیل کہنے لگے کہ اچھا اس بیل کے اوصاف ذرا اور زیادہ واضح کر کے بتادیجئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ یوں فرماتے ہیں کہ وہ بیل کوئی زیادہ عجیب وغریب ہونا ضروری نہیں، البتہ عمدہ ہونا چاہئے کہ نہ تو وہ ہل میں چلا ہوا ہو جس سے زمین جوتی جائے اور نہ کنویں میں جوڑا گیا ہو کہ اس سے کھیتی کو سیراب کیا جائے۔ بنی اسرائیل بولے اب آپ نے پوری بات صاف بتادی ہے، چنانچہ انہوں نے اس طرح کا بیل تلاش کیا تو ان کو ایک نوجوان کے پاس مل گیا انہوں نے اس سے اس بیل کی کھال بھر کر سونے کے بدلہ اس کو خریدا اور ذبح کر کے مقتول کے بدن سے چھوا دیا تو مقتول نے زندہ ہو کر قاتل کا نام بتلا دیا کہ مجھ کو فلاں فلاں نے قتل کیا ہے، نام بتلاتے ہی وہ مقتول مر گیا۔

اس واقعہ کے جاننے کے بعد اب تخریج تعارض سنئے کہ حق تعالیٰ نے اولاً فرمایا: فَذَبَحُوهَا "کہ بنی اسرائیل نے اس بقرہ کو ذبح کر دیا" آیت کے اس جزء میں ذبح بقرہ کا اثبات ہے اور آگے فرمایا: وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ کہ "وہ ذبح کرنے کے قریب بھی نہیں ہوئے۔" کیونکہ کاد افعالِ مقاربہ میں سے ہے اس کے متعلق نحاۃ کا اختلاف ہے، حق مذہب اس بارے میں یہ ہے جیسا کہ روح المعانی ۲۹۲/۱ پر مصرح ہے کہ کاد نفی اور اثبات دونوں میں دیگر افعال کی طرح ہے کہ اگر کاد مثبت ہو تو اثباتِ قرب کا فائدہ دیتا ہے اور اگر منفی ہو تو نفیِ قرب کے لئے مفید ہوتا ہے اور چونکہ آیت شریفہ میں کاد منفی ہے اس لئے نفیِ قرب کا فائدہ دیگا کہ وہ ذبح کرنے کے قریب نہیں ہوئے، یعنی ذبح کرنا تو درکنار وہ تو ذبح کرنے کے قریب بھی نہیں گئے

اس سے ذبح کرنے کی نفی معلوم ہوتی ہے پس فَذَبَحُوْهَا میں ذبح کا اثبات اور وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ میں ذبح کی نفی ہے اور نفی و اثبات میں تعارض و تناقض ہے، پس آیت کا جزء اول جزء ثانی کے بظاہر معارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ یہ نفی اور اثبات اختلاف اوقات پر محمول ہے، مطلب یہ ہے کہ اولاً تو وہ ذبح کرنے کے قریب بھی نہیں تھے، طرح طرح کی حجتیں اور بہانے کرتے تھے گویا کہہ رہے تھے کہ ہم کیسے ذبح کر دیں ہمیں تو معلوم ہی نہیں ہوا کہ کس رنگ کا بقرہ ہونا چاہیے؟ کیا کیا اس کے اوصاف ہونے چاہئیں؟ (مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی طرح یہ فرما دیں کہ بس رہنے دو، زیادہ پریشان کیوں ہوتے ہو، ہم بغیر ذبح بقرہ کے ہی تم کو قاتل کی خبر دیدیں گے، یا مقصد یہ تھا کہ بقرہ میں زیادہ قیودات لگنے کی وجہ سے اس خاص قسم کا بقرہ کہیں مل نہیں پائے گا تو ہم کہہ دیں گے کہ اس قسم کا بقرہ تو ملا نہیں رہا ہے تو اللہ ہم کو بغیر بقرہ کے قاتل کی خبر دیدیں گے۔) لیکن جب اللہ نے تمام اوصاف صاف صاف بیان فرما دیے اور ان کی حجتیں اور بہانے سب ختم ہو گئے اور تلاش کرنے سے اس قسم کا بقرہ مل بھی گیا تو پھر تو ان کو ذبح کرنا ہی پڑا، پس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ "فَذَبَحُوْهَا فِي الزَّمَانِ الثَّانِيْ وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ فِي الزَّمَانِ الْاَوَّلِ" اور اختلاف ازمان واوقات کے بعد تعارض نہیں رہتا کیونکہ تعارض کے لئے اتحاد زمان شرط ہے۔ (روح المعانی ۱:۲۹۲، بیان القرآن ۱:۳۹، [illegible])

❷ نفی اور اثبات اختلاف اعتبارین پر محمول ہے، مطلب یہ ہے کہ ایک اعتبار سے ذبح کرنے کے قریب نہیں تھے، دوسرے اعتبار سے ذبح کر ڈالا۔ اب یا تو یوں کہا جائے کہ رسوائی کے خوف سے ذبح کرنا نہیں چاہتے تھے کہ نام معلوم ہو جائے گا تو

جاتی کی رسوائی ہوگی یا قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے ذبح کرنے کے قریب نہیں تھے، خریدنا مشکل تھا کیونکہ اس کی قیمت جیسا کہ اوپر مذکور ہوئی اس کی کھال کے بھراؤ کے برابر سونا تھی، پس رسوائی کے خوف یا زیادتی ثمن کے اعتبار سے ذبح کرنے کے قریب نہیں تھے مگر تعیین حکم کے اعتبار سے انہوں نے ذبح کر ہی دیا کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہو ہی رہا ہے تو اب قیمت زیادہ ہو یا کم، رسوائی ہو یا نہ ہو، ذبح کرنا ہی پڑے گا، اور جب نفی اور اثبات دو مختلف اعتباروں پر محمول ہیں تو کوئی تعارض نہیں، اس لئے کہ تعارض کے لئے اتحاد اعتبار شرط ہے۔ (روح المعانی ۱/۲۹۳)

یہود جادو کا اتباع کرنے کی قباحت جانتے تھے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱

(۱) ﴿وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ﴾ (پ ۱، ع ۱۲، سورۃ البقرۃ، آیت ۱۰۲)

تشریحِ تعارض

اس آیت کے جزءِ اول اور جزءِ آخر میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے، جس کی تشریح یہ ہے کہ یہودی لوگ کتاب اللہ کا اتباع کرنے کے بجائے جادو کا اتباع کرتے تھے، شہر بابل میں ہاروت ماروت نامی دو فرشتے جو اللہ نے لوگوں کی آزمائش کے لئے بھیجے تھے۔ (جن کا قصہ اس سے پہلی آیت میں مجملاً اور کتبِ تفاسیر میں مفصلاً مذکور ہے) ان سے یہ یہودی لوگ جادو سیکھتے اور اس کا اتباع کرتے تھے اور یہ لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ جو شخص کتاب اللہ کے بجائے جادو کا اتباع کرے گا اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، اسی کو آیت کے جزءِ اول میں ذکر کیا گیا ہے "وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ الخ" کہ یہودی اس بات کو جانتے ہیں کہ جو کتاب اللہ کے عوض جادو کو اختیار کرے اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کو جادو کے اتباع کرنے کی قباحت اور برائی معلوم تھی اور آیت کے اخیر میں فرمایا: "لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ" کاش یہ لوگ جان لیتے، اس جملہ کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہ لوگ سحر کی قباحت و شناعت جانتے نہیں تھے، کیونکہ کلمہ "لو" انتفاء

شیء لانتفاء غیرہ (ایک شے کی نفی دوسری شے کی نفی کی وجہ سے) کے لئے آتا ہے، پس آیت کے جزءِ اول میں یہود کے قباحت سحر کے علم کا اثبات ہے اور جزءِ ثانی میں اس علم کی نفی ہے، اس لئے آیت کے اول وآخر میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے آٹھ جوابات ہیں:

❶ آیت کے جزءِ اول میں جس علم کا اثبات ہے اس سے مراد غور وفکر کی صلاحیت اور قدرت ہے کہ ان لوگوں کے اندر اس بات کو جاننے اور سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے کہ جو شخص کتاب اللہ کے بجائے جادو کا اتباع کرے اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے لیکن صلاحیت علم وتفکر کو تحقق علم سے تعبیر کر دیا گیا ہے صلاحیت کی قوت اور اس کے کمال کی وجہ سے، کیونکہ جب کسی شخص کے اندر کسی وصف کی صلاحیت وقدرت کامل درجہ کی ہوتی ہے تو اس کے اندر اس وصف کے متحقق ہونے کا اعتبار کر لیا جاتا ہے اور اس شخص کو اس وصف کے ساتھ بالفعل موصوف کر دیا جاتا ہے، بہر حال آیت کے جزءِ اول میں صلاحیت علم وتفکر کا اثبات ہے اور جزءِ ثانی میں علم کی نفی سے مراد اس صلاحیت کو استعمال میں نہ لانا اور غور وفکر نہ کرنا مراد ہے، آیت کا مطلب اس وقت یہ ہوگا کہ ان لوگوں میں جادو کی قباحت اور شناعت جاننے اور سمجھنے کی صلاحیت ہے مگر یہ لوگ اس صلاحیت کو عمل میں نہیں لائے اور انہوں نے اس کی قباحت کو جانا اور سمجھا نہیں، کاش یہ لوگ اس بارے میں غور وفکر کر لیتے اور اس کی قباحت جان لیتے۔

پس اثبات صلاحیت علم وتفکر کا ہے اور نفی استعمال علم وتفکر کی ہے، یا یوں کہا جائے کہ اثبات علم بالقوۃ کا ہے اور نفی علم بالفعل کی ہے جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں، جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں ہے۔ فلا تعارض بینھما۔

(شیخ زادہ ۱/۳۷۶، روح المعانی ۱/۳۳۹ بزیادۃ توضیح وتشریح)

ⓘ امام راغب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جزء اول میں اثبات علم اجمالی کا ہے اور جزء ثانی میں نفی علم تفصیلی کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اجمالی طور پر تو جانتے تھے کہ جادو کا اتباع کرنا قبیح اور مذموم چیز ہے مگر انہوں نے یہ نہیں جانا کہ جس کام کو ہم کر رہے ہیں وہ بھی منجملہ اسی قبیح کے ہے۔ بسا اوقات انسان ایک شئے کی قباحت کو اجمالی طور پر جانتا ہے مگر تفصیلی طور پر نہیں جانتا کہ اس کی یہ صورت بھی قبیح ہے اور یہ صورت بھی قبیح ہے، پس مثبت علم اجمالی ہوا اور منفی علم تفصیلی ہوا۔ فلا تعارض۔

(روح المعانی ۱/۳۳۹، فتح العزیز ۳۷۷)

۲ آیت کے جزء اول میں جو اثبت ہے وہ سحر کی قباحت اور اس پر عقاب کے مرتب ہونے کا علم ہے اور جزء ثانی میں جو نفی ہے وہ حقیقت عقاب اور شدت عقاب کے علم کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اتباع سحر پر مرتب ہونے والے عقاب اور سزا کو جانتے ہیں مگر اس عقاب کی حقیقت اور اس کی شدت کو نہیں جانتے، کاش یہ لوگ عذاب کی شدت کو جان لیتے تو ایسا نہ کرتے۔ پس اثبات علم عقاب کا ہے اور نفی علم شدت عقاب و حقیقت عقاب کی ہے۔ فلا تعارض بینہما۔

(فتح العزیز ۳۷۷، روح المعانی ۱/۳۳۹)

۳ صاحب کشاف علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت کے جزء اول میں اثبات علم کا ہے اور جزء اخیر میں نفی اس علم پر عمل کرنے کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جادو کی قباحت اور اس پر اخروی عقاب کے مرتب ہونے کو جانتے ہیں مگر اس علم پر عمل نہیں کرتے اور جو شخص علم پر عمل نہیں کرتا اس کو جاہل کے درجہ میں اتار دیا جاتا ہے اس کے علم کا ہونا نہ ہونا برابر ہوتا ہے اس لئے جزء ثانی میں علم ہی کی نفی کر دی گئی ہے اب "لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ" کا مطلب "لَوْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ بِمُوْجَبِ عِلْمِهِمْ" ہے کہ اگر یہ لوگ اپنے علم کے مقتضیٰ پر عمل کر لیتے تو جادو کو اختیار کرنے اور سیکھنے سے احتراز کرتے۔ بہر حال اثبات علم کا ہے اور نفی عمل کی ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

صاحب روح المعانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک سب سے اولیٰ جواب یہی ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بیان القرآن میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

(کشاف ۱/۸۶، شیخ زادہ ۱/۲۷۷، روح المعانی ۱/۳۳۶، بیان القرآن ۱/۷۰ پارہ:۱)

❺ یہ اختلاف اشخاص پر محمول ہے، چنانچہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اخفش رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آیت کے جزءِ اول میں جاننے والوں سے مراد شیاطین ہیں اور جزءِ اخیر میں نہ جاننے والوں سے مراد انسان یعنی یہود ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شیاطین تو جانتے ہیں کہ جو شخص کتاب اللہ کے بدلہ میں جادو کو اختیار کرے گا اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے مگر یہ یہود اس بات کو نہیں جانتے اس لئے یہ لوگ جادو سیکھتے ہیں اور اس کو اختیار کرتے ہیں، کاش یہ لوگ بھی اس کی قباحت وشناعت کو جان لیتے، اس صورت میں وَلَقَدْ عَلِمُوْا کی ضمیر شیاطین کی طرف راجع ہوگی اور شَرَوْا اور یَعْلَمُوْنَ کی ضمیریں انسانوں کی طرف راجع ہوں گی اور جب عالمین اور غیر عالمین کا مصداق علیحدہ علیحدہ اشخاص ہیں تو کوئی تعارض نہیں۔

(قرطبی ۲/۵۶)

❻ امام زجاج رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ علی بن سلیمان رحمہ اللہ تعالیٰ نے یوں کہا ہے کہ میرے نزدیک سب سے عمدہ جواب یہ ہے کہ وَلَقَدْ عَلِمُوْا کی ضمیر مَلَكَيْنِ کی طرف راجع ہے کہ وہ دونوں فرشتے سحر کی قباحت اور اس پر اخروی عقاب کے ترتب کو جانتے تھے، ظاہر بھی یہی ہے، نیز اس بات کو جاننے کو زیادہ لائق و مستحق وہ دونوں فرشتے ہی ہوسکتے ہیں اور مَلَكَيْنِ تثنیہ کی طرف ضمیر جمع کا لوٹانا قابلِ اشکال نہیں اس لئے کہ تثنیہ کے لئے ضمیر جمع کا استعمال کرنا شائع ہے، کہا جاتا ہے "الزیدان قاموا" اس صورت میں بھی "لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ" کی ضمیر یہود کی طرف راجع ہوگی۔

مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ وہ دونوں فرشتے تو سحر کی قباحت و مذمت کو جانتے

تھے مگر یہ نہیں جانتے تھے اس لئے یہ لوگ سحر کی تجارت کرتے اور اس کو اختیار کرتے تھے، کاش یہ لوگ اس کی قباحت اور مذمت کو جان لیتے، بہر حال اس صورت میں بھی اختلاف شئی منہ کی وجہ سے کوئی تعارض نہیں ہوگا۔ (قرطبی ٢/٥٦)

مگر صاحب روح المعانی نے اختلاف ضمیر والی توجیہ کو پسند نہیں کیا ہے، فرماتے ہیں کہ اس صورت میں بلا ضرورت انتشار ضمیر کا ارتکاب لازم آتا ہے اور اس پر کوئی قرینہ واضحہ بھی موجود نہیں ہے۔ (روح المعانی ١/٣٣٧)

ﻫ آیت کے جزء اول میں عَلِمُوْا کا مفعول انه لا نصیب لهم في الاخرة ہے اور جزء اخیر میں یَعْلَمُوْنَ کا مفعول مذمومیة الشراء ہے جو "بِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ" سے سمجھ میں آ رہا ہے، آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ اس بات کو تو جانتے ہیں کہ جو کتاب اللہ کے بدلہ میں جادو کو اختیار کرے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے مگر یہ لوگ کتاب اللہ کے بدلہ میں جادو اختیار کرنے کی مذمت اور قباحت کو نہیں جانتے بلکہ اپنے اعتقاد میں یہ لوگ اس چیز کو مباح سمجھتے ہیں، پس علم مثبت اور علم منفی کے مفعول علیحدہ علیحدہ ہونے کی وجہ سے کوئی تعارض نہیں کیونکہ جس چیز کے علم کا اثبات ہے اس کے علم کی نفی نہیں ہے اور جس چیز کے علم کی نفی ہے اس کے علم کا اثبات نہیں۔

مگر یہ جواب درست نہیں ہے کیونکہ جب یہ لوگ جادو کو مذموم اور قبیح نہیں جانتے تھے تو پھر آخرت میں اس کے موجب حرمان ہونے کے قائل کیسے ہو سکتے تھے؟ یہ بات تو عقل کے خلاف ہے کہ ایک شخص کسی فعل کے مذموم اور قبیح ہونے کو نہیں جانتا بلکہ اس کو مباح اور جائز و حسن سمجھتا ہے اس کے باوجود اس کا اعتقاد یہ ہو کہ آخرت میں اس فعل پر عتاب ہوگا اور یہ فعل آخرت میں ثواب سے محرومی کا باعث ہوگا۔ (روح المعانی ١/٣٣٧)

ﻭ آیت کے جزء اول میں ثبات عدمیت فی الآخرة کے علم کا ہے اور جزء ثانی

میں نفی مذمومیت مطلقہ یعنی فی الدنیا والآخرۃ کی ہے، مطلب یہ ہوگا کہ یہود یہ تو جانتے ہیں کہ جادو اختیار کرنا آخرت کے اعتبار سے مذموم اور قبیح ہے مگر یہ نہیں جانتے کہ دنیا و آخرت دونوں ہی اعتبار سے مطلقاً مذموم اور قبیح ہے بلکہ وہ تو اس دھوکہ میں پڑے ہوئے تھے کہ دنیا میں یہ چیز نافع ومفید ہے اور ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ انسان جانتا ہے کہ یہ فعل آخرت میں موجب عقاب ہے مگر دنیاوی نفع کے لالچ میں اس فعل کا ارتکاب کرتا رہتا ہے، اسی طرح یہود دنیاوی نفع کے توہم پر کتاب اللہ کے بدلہ میں جادو کو اختیار کرتے تھے، کاش وہ لوگ یہ جان لیتے کہ یہ چیز دنیا وآخرت دونوں اعتبار سے مضر ونقصان دہ ہے۔

پس اثبات مذمومیت فی الاخرۃ کے علم کا ہے اور نفی مطلق مذمومیت وقباحت کے علم کی ہے خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ اثبات مذمومیت خاصہ کے علم کا ہے اور نفی مذمومیت عامہ کے علم کی ہے، جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں، جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ آیت کے جزء ثانی میں مذمومیت کو جو عام کہا گیا ہے کہ خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں، اس عموم کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کلمۂ "بئس" لایا گیا ہے جو مذمومیت عامہ کے لئے آتا ہے۔

مگر صاحب روح المعانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ بئس سے جو عموم مستفاد ہوتا ہے وہ افراد فاعل کے اعتبار سے ہے نہ کہ زمان ومکان کے اعتبار سے، جب یہ کہا جائے بئس ما فعلوا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کام کو کرنے والے بھی لوگ برے ہیں اور قبیح کا ارتکاب کر رہے ہیں، اس میں اس بات سے کوئی تعرض نہیں ہوتا ہے کہ یہ فعل ہر زمان اور ہر مکان میں قبیح اور مذموم ہے جیسا کہ آپ نے اس کو زمان آخرت وزمان دنیا، یا مکان آخرت ومکان دنیا دونوں اعتبار سے مذمت پر دلالت کرنے والا سمجھ لیا ہے۔ (روح المعانی ۱/۳۴۷)

افعالِ عباد اللہ کی مشیت سے صادر ہوتے ہیں یا بندوں کی؟

پارہ نمبر: ۲، ۳، ۷، ۸، ۹، ۱۱، ۱۴، ۱۵، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۳۰

آیات

① ﴿يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ (پارہ ۲ رکوع ۱ سورۂ بقرہ جلالین ص ۲۰)

② ﴿وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾

(پارہ ۲ رکوع ۱۰ سورۂ بقرہ جلالین ص ۳۱)

③ ﴿وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ﴾ (پارہ ۳ رکوع ۵ سورۂ بقرہ جلالین ص ۴۳)

④ ﴿مَنْ يَشَإِ اللَّهُ يُضْلِلْهُ وَمَنْ يَشَأْ يَجْعَلْهُ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾

(پارہ ۷ رکوع ۱۰ سورۂ انعام جلالین ص ۱۱۵)

⑤ ﴿مَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ﴾

(پارہ ۸ رکوع ۱ سورۂ انعام جلالین ص ۱۲۳)

⑥ ﴿فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا﴾ (پارہ ۸ رکوع ۲ سورۂ انعام جلالین ص ۱۲۳)

⑦ ﴿وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ﴾

(پارہ ۹ رکوع ۱ سورۂ اعراف جلالین ص ۱۳۷)

⑧ ﴿تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاءُ وَتَهْدِي مَنْ تَشَاءُ﴾

(پارہ ۹ رکوع ۹ سورۂ اعراف جلالین ص ۱۴۵)

(۹) ﴿وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

(پارہ ۱۱ رکوع ۸ سورۂ یونس جلالین ص ۱۷۴)

(۱۰) ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (پارہ ۱۴ رکوع ۱۹ سورۂ نحل جلالین ص ۲۲۵)

(۱۱) ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾

(پارہ ۱۵ رکوع ۱۶ سورۂ کہف جلالین ص ۲۴۳)

(۱۲) ﴿وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾

(پارہ ۱۵ رکوع ۱۷ سورۂ کہف جلالین ص ۲۴۵)

(۱۳) ﴿سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا﴾ (پارہ ۱۵ رکوع ۲۱ سورۂ کہف جلالین ص ۲۴۹)

(۱۴) ﴿وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

(پارہ ۱۸ رکوع ۱۲ سورۂ نور جلالین ص ۳۰۰)

(۱۵) ﴿سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾

(پارہ ۲۰ رکوع ۶ سورۂ قصص جلالین ص ۳۲۹)

(۱۶) ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾

(پارہ ۲۲ رکوع ۱۳ سورۂ فاطر جلالین ص ۳۶۴)

(۱۷) ﴿سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ﴾

(پارہ ۲۳ رکوع ۷ سورۂ صافات جلالین ص ۳۷۷)

(۱۸) ﴿ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾

(پارہ ۲۳ رکوع ۱۷ سورۂ زمر جلالین ص ۳۸۷)

(۱۹) ﴿وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾

(پارہ ۲۵ رکوع ۶ سورۂ شوریٰ جلالین ص ۴۰۵)

(۲۰) ﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ﴾

(پارہ ۲۶ رکوع ۱۲ سورۂ فتح جلالین ص ۴۲۶)

(۲۱) ﴿ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾

(پارہ: ۲۹ رکوع: ۱۵ سورۃ مدثر جلالین ص: ۴۸۱)

(۲۲) ﴿ وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۱۰ سورۃ مدثر جلالین ص: ۴۸۱)

(۲۳) ﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۲۰ سورۃ دہر جلالین ص: ۴۸۵)

(۲۴) ﴿ يُدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۲۰ سورۃ دہر جلالین ص: ۴۸۵)

(۲۵) ﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾ (پارہ: ۳۰ رکوع: ۶ سورۃ تکویر جلالین ص: ۴۹۲) ♦

(۲۶) ﴿ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾

(پارہ: ۱۵ رکوع: ۱۶ سورۃ کہف جلالین ص: ۲۴۴)

(۲۷) ﴿ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴾ (پارہ: ۱۹ رکوع: ۳ سورۃ فرقان جلالین ص: ۳۰۷)

(۲۸) ﴿ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ﴾ (پارہ: ۲۴ رکوع: ۱۹ سورۃ حم سجدہ جلالین ص: ۴۰۰)

(۲۹) ﴿ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۱۳ سورۃ مزمل جلالین ص: ۴۷۸)

(۳۰) ﴿ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۱۴ سورۃ مدثر جلالین ص: ۴۸۱)

(۳۱) ﴿ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۱۲ سورۃ مدثر جلالین ص: ۴۸۱)

(۳۲) ﴿ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۲۰ سورۃ دہر جلالین ص: ۴۸۵)

(۳۳) ﴿ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴾ (پارہ: ۳۰ رکوع: ۶ سورۃ تکویر جلالین ص: ۴۹۲)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۲۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ بندوں کے افعال حق تعالیٰ کی مشیت و ارادہ سے متحقق ہوتے ہیں، بندہ گمراہی پر ہوتا ہے یا ہدایت پر، نیکی کرتا ہے یا برائی اور ان کے علاوہ دیگر افعال جو بھی بندہ کرتا ہے وہ سب اللہ کی مشیت اور اس کو چاہنے سے کرتا ہے بندہ کی مشیت و ارادہ کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ ان آیات میں

مشیت کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ مجبور محض ہے اور آیت نمبر ۳۶ تا ۳۳۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ بندوں کے افعال خود بندوں کی مشیت وارادہ سے صادر ہوتے ہیں کیونکہ ان آیات میں مشیت کی نسبت بندوں کی طرف کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ خود مختار ہے جو چاہے کرے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ افعال عباد، حق تعالیٰ کی مشیت اور بندوں کی مشیت دونوں سے صادر ہوتے ہیں مگر دونوں مشیتوں کی جہت مختلف ہے، اللہ کی مشیت باعتبار خلق کے ہے اور بندہ کی مشیت باعتبار کسب کے ہے، یعنی بندہ اپنے اختیار سے افعال کا کسب کرتا ہے مگر ان افعال کو پیدا کرنے والے حق تعالیٰ ہیں، حق تعالیٰ کی یہ عادت جاری ہے کہ جب بندہ اپنے اختیار سے کسی فعل کا کسب کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس بندے کے اندر اس فعل کا خلق فرمادیتے ہیں مثلاً بندہ نے اپنے اختیار سے چلنے کا ارادہ کیا تو حق تعالیٰ اس کے اندر چلنا پیدا فرمادیتے ہیں، اسی طرح تمام افعال میں سمجھ لینا چاہیے، پس بندہ کا نہ تو مجبور محض ہونا لازم آیا کیونکہ بندہ کا کسب بالاختیار ہے اور نہ خود مختار و قادر ہونا لازم آیا کیونکہ افعال کے خالق حق تعالیٰ ہیں اور مشیتوں کی جہت کسب اور خلق کے اعتبار سے مختلف ہونے کی وجہ سے کوئی تعارض لازم نہیں آتا۔

(شرح عقائد)

حق تعالیٰ قیامت کے دن کفار سے گفتگو کریں گے یا نہیں؟

پارہ نمبر:

① ﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾

(پارہ ۲، رکوع ۵، سورۂ بقرہ، جلالین ص ۲۵)

② ﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (پارہ ۳، رکوع ۱۶، سورۂ آل عمران، جلالین ص ۵۵)

③ ﴿وَنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ﴾ (پارہ ۴، رکوع ۱۰، سورۂ آل عمران، جلالین ص ۶۶)

④ ﴿وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ﴾

(پارہ ۷، رکوع ۹، سورۂ انعام، جلالین ص ۱۱۳)

⑤ ﴿وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ﴾

(پارہ ۷، رکوع ۱۰، سورۂ انعام، جلالین ص ۱۱۴)

⑥ ﴿قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ﴾

(پارہ ۸، رکوع ۱۱، سورۂ اعراف، جلالین ص ۱۳۲)

⑦ ﴿وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ﴾ (پارہ ۱۱، رکوع ۸، سورۂ یونس، جلالین ص ۱۷۳)

(٨) ﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ﴾ (پارہ ۱۴، رکوع ۶، سورۂ حجر جلالین ص: ۲۱۵)

(٩) ﴿ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُخْزِيهِمْ وَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَاءِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تُشَاقُّونَ فِيهِمْ﴾ (پارہ ۱۴، رکوع ۱۰، سورۂ نحل جلالین ص ۲۱۶)

(١٠) ﴿وَيَوْمَ يَقُولُ نَادُوا شُرَكَاءِيَ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ﴾

(پارہ ۱۵، رکوع ۱۹، سورۂ کہف جلالین ص ۲۴۷)

(١١) ﴿قَالَ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ﴾ (پارہ ۱۸، رکوع ۶، سورۂ مومنون جلالین ص ۲۹۳)

(١٢) ﴿قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ﴾

(پارہ ۱۸، رکوع ۶، سورۂ مومنون جلالین ص: ۲۹۳)

(١٣) ﴿قَالَ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾

(پارہ ۱۸، رکوع ۶، سورۂ مومنون جلالین ص: ۲۹۳)

(١٤) ﴿حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوا قَالَ أَكَذَّبْتُمْ بِآيَاتِي وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا﴾

(پارہ ۲۰، رکوع ۷، سورۂ نمل جلالین ص ۳۲۳)

(١٥) ﴿وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ﴾

(پارہ ۲۰، رکوع ۱۰، سورۂ قصص جلالین ص: ۳۳۲)

(١٦) ﴿وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَاءِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ﴾

(پارہ ۲۰، رکوع ۱۰، سورۂ قصص جلالین ص ۳۳۳)

(١٧) ﴿وَيَقُولُ ذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (پارہ ۲۱، رکوع ۲، سورۂ عنکبوت جلالین ۳۳۹)

(١٨) ﴿وَنَقُولُ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ﴾

(پارہ ۲۲، رکوع ۱۱، سورۂ سبا جلالین ص ۳۶۳)

(١٩) ﴿وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَاءِي قَالُوا آذَنَّاكَ﴾

(پارہ ۲۵، رکوع ۱، سورۂ حم سجدہ جلالین ص: ۴۰۰)

(٢٠) ﴿قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ﴾

(پارہ ۲۶، رکوع ۴، سورۂ احقاف جلالین ص: ۴۱۹)

(۲۱) ﴿قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ الخ﴾ (پارہ ۲۶، رکوع ۱۶، سورۂ ق، جلالین ص ۴۳۰، ۴۳۱)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ اور ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ قیامت کے دن کفار کے ساتھ کلام نہیں فرمائیں گے اور باقی تمام آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام کریں گے کیونکہ ان تمام آیات میں کفار کے ساتھ گفتگو کرنا اور سوال کرنا مذکور ہے جیسا کہ ان کے تراجم سے ظاہر ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ آیت نمبر ۱ اور ۲ میں بقول حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ کلام رحمت وشفقت کی نفی ہے کہ حق تعالیٰ قیامت کے دن کفار کے ساتھ شفقت ومہربانی کے طور پر کلام نہیں کریں گے اور باقی تمام آیات میں کلام غضبی کا اثبات ہے کہ ان کے ساتھ گفتگو اور سوال کرنا قہر وغضب کے انداز میں ہوگا، پس جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں اور جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں۔ فلا تعارض۔ (روح المعانی ج ۲ ص ۴۳، وبیان القرآن پارہ ۱، ص ۳۰)

❷ یا یوں کہا جائے کہ پہلی دونوں آیتوں میں مطلق کلام ہی کی نفی ہے خواہ کلام رحمت ہو یا کلام غضب، کسی طرح کا بھی کلام نہیں فرمائیں گے مگر یہ نفی کلام بلا واسطہ کی ہے کہ حق تعالیٰ بلا واسطہ اور براہ راست کفار کے ساتھ کلام نہیں کریں گے اور باقی آیات میں اثبات کلام بواسطہ ملائکہ کا ہے کہ حق تعالیٰ ملائکہ کے واسطے سے کفار سے گفتگو اور سوال فرمائیں گے، پس اثبات کلام بالواسطہ کا ہوا اور نفی کلام بلا واسطہ کی، فلا تعارض۔ (تفسیر روح المعانی ج ۱، ص ۲۳۰)

زمانہ ماضی میں لوگ متحد فی الدین تھے یا مختلف؟

پارہ نمبر ۲، ۱۲، ۱۴

آیات

① ﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾ (پارہ ۲، رکوع ۱۰، سورۂ بقرہ جلالین ص ۳۱)

② ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ﴾ (پارہ ۱۲، رکوع ۱۰، سورۂ ہود جلالین ص ۱۸۹)

③ ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (پارہ ۱۴، رکوع ۱۹، سورۂ نحل جلالین ص ۲۲۵)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ گذشتہ میں سب لوگ ایک ہی دین پہ تھے، ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا اور آیت نمبر ۲ و ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں زمانہ ماضی میں اختلاف رہا کیونکہ ان دونوں آیتوں میں کلمہ "لَوْ" آتا ہے جو تعلیق فی الماضی مع القطع بانتفاء الشرط کے لئے آتا ہے یعنی لو کے ذریعہ زمانہ ماضی میں ایک شے کو دوسری شے پر معلق کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شرط کے انتفاء کا یقین ہوتا ہے جو جزاء کے انتفاء کو مستلزم ہوتا ہے جیسے یوں کہا جائے "لو جئتنی لاکرمتك" اگر تو زمانہ گزشتہ میں میرے پاس آتا تو میں تیرا اکرام کرتا مگر تو نہیں آیا پس میں نے تیرا اکرام نہیں کیا۔ اس بناء پر آیت شریفہ کا مطلب یہ ہوگا

کہ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو زمانہ ماضی میں ایک ہی دین پر متحد کر دیتا لیکن اللہ نے نہیں چاہا پس اس نے تم کو متحد بھی نہیں کیا۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ ماضی میں لوگوں میں اختلاف رہا ہے، پس آیت اولیٰ سے زمانہ ماضی میں لوگوں کا متحد ہونا اور اخیر کی دونوں آیتوں سے زمانہ ماضی میں لوگوں کا مختلف ہونا معلوم ہوتا ہے لہٰذا ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

زمانہ ماضی چونکہ طویل اور ممتد ہے اس لئے اس کے دو حصے کر لئے جائیں زمانہ ماضی کے جزء اول میں تو سب لوگ ایک ہی دین یعنی دین توحید پر قائم تھے، جب حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام مبعوث ہوئے تو انھوں نے اپنی اولاد کو دین حق کی تعلیم دی تھی، وہ لوگ ایک عرصہ تک دین حق پر قائم اور متحد رہے، پھر جزء ثانی میں رفتہ رفتہ لوگوں کے طبائع مختلف ہوتے گئے اور ان میں اختلاف ہوتا چلا گیا، اتحاد کے بعد جو اختلاف ہوا ہے اس کے متعلق حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اتحاد کے بعد یہ اختلاف ہونے نہ دیتا، بلکہ ہمیشہ لوگ متحد ہی رہتے مگر اللہ نے نہیں چاہا اس لئے اتحاد قائم نہ رہا، بلکہ لوگ مختلف ہو گئے اور فرمایا "وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ" اور آئندہ بھی لوگ اختلاف کرتے رہیں گے۔ پس آیت اولیٰ میں جو اتحاد مذکور ہے وہ زمانہ ماضی کے جزء اول میں تھا اور آیت ثانیہ و ثالثہ میں جو اختلاف مذکور ہے وہ زمانہ ماضی کے جزء ثانی میں ہے اور جب اتحاد و اختلاف کا زمانہ علیحدہ علیحدہ ہے تو کوئی تعارض نہیں، لانہ لا تعارض بعد اختلاف الازمان۔

(بیان القرآن پارہ ١١، ص ١٥٦ مع زیادہ توضیح)

لوگوں میں اختلاف بعثت انبیاء سے پہلے ہوا یا بعد میں؟

پارہ نمبر: ۲

آیت

① ﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ﴾ (پارہ ۲، رکوع ۱۰، سورۂ بقرہ، جلالین ص ۳۱)

تشریح تعارض

آیت کے جزء اول میں ارشاد ہے کہ زمانہ دنیا میں سب لوگ ایک ہی طریقہ پر یعنی دینِ حق پر تھے (کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام اپنی اولاد کو دینِ حق کی تعلیم فرماتے رہے اور وہ ان کی تعلیم پر عمل کرتے رہے، ایک زمانہ اسی حالت میں گزر گیا، پھر بعد میں لوگوں میں اختلاف ہونا شروع ہوا) تو اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا اور ان پر کتاب نازل فرمائی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان امورِ اختلافیہ میں فیصلہ کرکے اختلاف کو دور کردیں۔ پس اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں اختلاف انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کی بعثت اور نزولِ کتاب سے پہلے ہوا اور آیت کے جزء ثانی سے معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف بعثتِ انبیاء اور نزولِ کتاب کے بعد ہوا کیونکہ اس میں ارشاد ہے کہ اختلاف کرنے والے وہی لوگ تھے جن کو کتاب دی گئی اور انہوں نے اختلاف دلائلِ واضحہ کے آنے کے بعد کیا، پس آیت کے جزء اول اور جزء ثانی میں بظاہر

تعارض نظر آتا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ جزءِ اول میں جو اختلاف مذکور ہے اس سے مراد ان کے اپنے بعض امور میں اختلاف ہے کہ وہ لوگ اپنے اغراض رمتقصد حق کر اپنے اعمال وعقائد میں اختلاف کرنے لگے یہ اختلاف حضرت آدم علیہ السلام کے تشریف لانے کے ایک عرصہ بعد شروع ہو گیا تھا اس وقت تک دیگر انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام مبعوث نہیں ہوئے تھے، یعنی بعثت انبیاء سے قبل ہی یہ اختلاف ہو گیا تو اسی اختلاف کو دور کرنے کے لئے انبیاء مبعوث ہوئے اور جزء ثانی میں جو اختلاف مذکور ہے وہ کتاب کے بارے میں اختلاف ہے کہ جب انبیاء مبعوث ہو گئے اور کتاب نازل ہو گئی، دلائل واضح آ گئے تو لوگوں کو چاہئے تھا کہ اس کتاب کو قبول کرتے اور اسی پر مدار رکھ کر اپنے سب اختلافات مٹا دیتے مگر بعضوں نے خود اس کتاب ہی کو تختہ مشق بنا لیا اور خود اسی میں اختلاف کر بیٹھے، پس بعثت انبیاء سے قبل والا اختلاف ان کے اپنے امور کے بارے میں تھا اور بعثت انبیاء کے بعد والا اختلاف کتاب کے بارے میں تھا اور جب دونوں اختلافوں کی نوعیت جدا جدا ہے تو کوئی تعارض نہیں۔

(بیان القرآن مع حاشیہ پارہ:۲ ص:۱۴۰)

حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام بنی اسرائیل کے نبی تھے یا دوسروں کے بھی؟

پارہ نمبر: ۳

آیات

(۱) ﴿وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ (پارہ ۳، رکوع ۱۳، سورۃ آل عمران جلالین ص ۵۱)

(۲) ﴿قَالَ مَنْ اَنْصَارِىْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ﴾

(پارہ ۳، رکوع ۱۴، سورۃ آل عمران جلالین ص ۵۲)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے ہیں اور آخری آیتوں کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریین[1] کو بھی دعوت دی ہے اور انہوں نے آپ کی دعوت کو قبول کیا، ایمان لائے اور آپ کی اتباع کی، جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حواریین کی طرف بھی مبعوث ہوئے تھے پس ان آیات میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے۔

---

(۱) حواریین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخلص ساتھی تھے ان کی تعداد ۱۲ تھی ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: اندریاس، یعقوب، یحییٰ، [illegible] حَوَر سے ماخوذ ہے جس کے معنی سفیدی کے ہیں ایک قول یہ ہے کہ یہ سفید کپڑے پہنتے تھے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ دھوبی تھے کپڑوں کو دھو کر سفید کرتے تھے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ ان کے قلب صاف اور پاکیزہ تھے اس لئے ان کو حواریین کہا جاتا ہے۔ ([illegible])

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ حواریین بھی بنی اسرائیل میں سے تھے، اس کی تائید ایک روایت سے ہوتی ہے جو روح المعانی میں ج ۷ ص ۵۵ پر موجود ہے جس کو ابو شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا ہے مضمون اس کا یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام نے بنی اسرائیل سے کہا تمیں روزے رکھ کر اللہ سے جو درخواست کرو گے قبول ہوگی، انھوں نے روزے رکھ کر نزول مائدہ کی درخواست کی تھی اور قرآن پاک میں مصرح ہے کہ درخواست کرنے والے حواریین تھے، ارشاد باری تعالیٰ ہے "اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ" اس سے معلوم ہوا کہ حواریین بنی اسرائیل میں سے تھے۔ فلا تعارض۔[1]

❷ اگر حواریین کو بنی اسرائیل میں سے نہ مانا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس نبی کی بعثت عام نہیں ہے اس کے زمانہ میں اس کی قوم کے علاوہ دوسرے لوگوں پر اصول دین میں تو اس نبی کا اتباع ہر حال میں واجب ہے خواہ ان دوسروں کے لئے کوئی نبی مبعوث ہوا ہو یا نہ ہوا ہو کیونکہ تمام انبیاء اصول دین میں متحد ہوتے ہیں اور فروعِ دین میں تفصیل یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کے لئے دوسرا نبی مبعوث ہو چکا ہے تو وہ اپنے نبی کا اتباع کریں گے ورنہ اسی پہلے نبی کا اتباع کریں گے پس حواریین کی طرف چونکہ کوئی خاص نبی مبعوث نہیں ہوا تھا اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا اتباع ان پر واجب تھا اور اسی لئے حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام نے ان کو دعوت دین فرمائی ورنہ وہ ان کی طرف مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ فلا تعارض۔[2]

---

(۱) پارہ ۷، تبیان القرآن ۳/ ۴۴

(۲) پارہ ۷، تبیان القرآن ۳/ ۳۴۴

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل سب کافر تھے یا بعض مؤمن بھی تھے؟

پارہ نمبر: ۳، ۲۸

آیات

(۱) ﴿فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِىْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾

(پارہ ۳، رکوع ۱۳، سورۂ آل عمران جلالین ص: ۵۲) ◆

(۲) ﴿فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ﴾

(پارہ ۲۸، رکوع ۱۰، سورۂ صف جلالین ص: ۴۶۰)

تشریح تعارض

پہلی آیت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی طرف سے جب کفر محسوس کیا یعنی[۱] یہ دیکھا کہ یہ لوگ معجزات کا انکار کر رہے ہیں اور ایذا رسانی کے درپے ہیں تو کچھ لوگ ایسے ملے جن کو حواریین کہا جاتا تھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ کون ہے جو اللہ کے لئے میری مدد کرے؟ انہوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے دین کے مدد کرنے والے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل سب کافر تھے صرف حواریین مؤمن تھے اور دوسری آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت مؤمن اور ایک کافر تھی پس ان میں بظاہر تعارض ہے۔

---

(۱) بیان القرآن میں اس کی یہی تفسیر کی گئی ہے۔

دفعِ تعارض

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریین سے "مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ" کہا تھا اس وقت تمام بنی اسرائیل کافر تھے ایذا رسانی کے درپے تھے مگر اس کے ایک زمانہ بعد بعض ایمان لے آئے اور بعض کافر رہے تو یہ دونوں باتوں کا زمانہ علیحدہ علیحدہ ہے۔ ولا تعارض بعد اختلاف الازمان۔

{بیان القرآن، حاشیہ مع زیادۃ تشریح ص ۲۱ ج:۲ پارہ:۳}

دعوت و تبلیغ پوری امت پر واجب ہے یا بعض پر؟

پارہ نمبر:۴

آیات

(۱) ﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾ (پارہ:۴، رکوع:۲، سورۂ آل عمران، جلالین ص:۵۷)

(۲) ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾ (پارہ:۴، رکوع:۳، سورۂ آل عمران، جلالین ص:۵۸)

تشریحِ تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ تم میں سے بعض لوگوں کی جماعت ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلانے امر بمعروف و نہی عن المنکر کرتی رہے چونکہ آیت میں "من تبعیضیہ" لایا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام پوری امت محمدیہ کے ذمہ واجب نہیں بلکہ بعض لوگوں کا اس ذمہ داری کو انجام دے دینا کافی ہے اور دوسری آیت میں پوری[1] امت کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم بہترین امت ہو جس کو لوگوں کے لئے ظاہر کیا گیا ہے تم سب امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے رہو اس آیت میں من تبعیضیہ نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امت کے تمام افراد پر تبلیغ و دعوت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کام کو انجام دینا واجب اور ضروری ہے پس دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

(۱) حضرت مولانا اشرف علی تھانوی بیان القرآن پارہ:۴، ص:۳۲ میں فرماتے ہیں کہ یہ خطاب تمام امت محمدیہ کو عام ہے جیسا کہ تفاسیر میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت مرفوعہ امام احمد بن حنبل سے منقول ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت دوسری آیت کے ابہام کی تفسیر ہے کیونکہ دوسری آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر پوری امت پر فرض ہے لیکن فرض کی دو قسمیں ہیں ایک فرضِ کفایہ ہے دوسرے فرضِ عین، فرضِ کفایہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فرض تو سب پر ہے مگر اس فرض کی ادائیگی بعض افراد کے عمل کرنے سے ہو جاتی ہے، اگر بعض لوگوں نے یہ فریضہ انجام دے دیا تو تمام افراد کے ذمے سے ساقط ہو جائے گا اور اگر کسی نے بھی یہ کام نہ کیا تو سب کے سب ترکِ فرض کی وجہ سے گنہگار اور قابلِ مواخذہ ہوں گے، اور فرضِ عین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص پر مستقلاً فرض ہے جس کی ادائیگی ہر ہر فرد کو مستقل طور پر علیحدہ علیحدہ کرنی ہوگی، بعض کے ادا کرنے سے سب کے ذمے سے ساقط نہ ہوگا جیسے کہ صلوٰۃ وصوم وغیرہ کہ یہ فرضِ عین ہوتے ہیں۔

اب سمجھئے کہ آیتِ ثانیہ اس بارے میں مبہم ہے، اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سب پر فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ ہے۔ آیتِ اولیٰ میں "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ الخ" کہہ کر اس ابہام کو دور کر دیا گیا ہے اور بتا دیا گیا کہ سب پر فرضِ عین نہیں ہے بلکہ فرضِ کفایہ ہے، تم میں سے ایک جماعت بھی اگر اس وظیفہ کو انجام دیتی رہے تو سب کی طرف سے ادائیگی ہو جائے گی، جمہور اہلِ سنت والجماعت کا متفقہ فیصلہ یہی ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرضِ کفایہ ہے۔ فرضِ عین نہیں، علامہ قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اسی کو صحیح کہا ہے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو فرضِ عین کہنے والا صرف فرقہ زراریہ[1] ہے جو شیعوں کا ایک فرقہ ہے۔ جن

(1) فرقہ زراریہ شیعوں کے فرقہ امامیہ کے ۲۳ فرقوں میں سے ایک فرقہ ہے جو ابو منصور زرارہ بن اعین کی طرف منسوب ہے، اس فرقہ کو اصحاب، تمیمیہ، مستغلیہ، مستلقیہ بھی کہتے ہیں۔ (تحفہ اثنا عشریہ فارسی ص ۳۶، ۲۳ مطبوعہ ترکی)

میں سے شیخ ابو جعفر رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ہے اس کا مسلک یہی ہے کہ یہ فرض عین ہے بہر حال تقریر مذکورہ سے معلوم ہو گیا کہ آیت اولیٰ آیت ثانیہ کے ابہام کی تفسیر ہے اور تفسیر بعد الابہام کو تعارض و تناقض نہیں کہا جاتا۔ فلا تعارض بینہما۔

(روح المعانی ص ۱۲۱،۱۲۲ ج پارہ ۲ توضیح)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف نذیر تھے یا بشیر و نذیر؟

پارہ نمبر: ۶، ۹، ۱۱، ۱۲، ۱۵، ۱۹، ۲۱، ۲۲، ۲۲، ۲۳،

۲۶، ۲۹

آیات

① ﴿فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ﴾ (پارہ: ۶ رکوع: ۷ سورۂ مائدہ جلالین ص: ۹۷)

② ﴿إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾

(پارہ: ۹ رکوع: ۱۳ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۴۶)

③ ﴿إِنَّنِي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ﴾ (پارہ: ۱۱ رکوع: ۱۵ سورۂ ہود جلالین ص: ۱۷۹)

④ ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا﴾ (پارہ: ۱۵ رکوع: ۱۲ جلالین ص: ۲۳۹)

⑤ ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا﴾ (پارہ: ۱۹ رکوع: ۳ سورۂ فرقان جلالین ص: ۳۰۷)

⑥ ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا﴾

(پارہ: ۲۲ رکوع: ۳ سورۂ احزاب جلالین ص ۳۵۵)

⑦ ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾

(پارہ: ۲۲ رکوع: ۹ سورۂ سبا جلالین ص: ۳۶۳)

⑧ ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾ (پارہ: ۲۲ رکوع: ۱۵ سورۂ فاطر جلالین ص ۳۶۶)

⑨ ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا﴾

(پارہ: ۲۶ رکوع: ۹ سورۂ فتح جلالین ص: ۴۲۳) ◆

⑩ ﴿إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ مُبِينٌ﴾ (پارہ: ۹ رکوع: ۱۳ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۴۵)

(۱۱) ﴿ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ﴾ (پارہ:۱۲ رکوع:۲ سورۂ ہود جلالین ص:۱۸۰)

(۱۲) ﴿ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾ (پارہ:۱۳ رکوع:۷ سورۂ رعد جلالین ص:۲۰۱)

(۱۳) ﴿ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ (پارہ:۲۱ رکوع:۱ سورۂ عنکبوت جلالین ص:۳۳۹)

(۱۴) ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴾

(پارہ:۲۲ رکوع:۱۲ سورۂ سبا جلالین ص:۳۶۳)

(۱۵) ﴿ اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ﴾ (پارہ:۲۲ رکوع:۱۵ سورۂ فاطر جلالین ص:۳۶۶)

(۱۶) ﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ﴾ (پارہ:۲۳ رکوع:۱۳ سورۂ ص جلالین ص:۳۸۳)

(۱۷) ﴿ اِنْ يُّوْحٰۤى اِلَيَّ اِلَّاۤ اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ (پارہ:۲۳ رکوع:۱۳ سورۂ ص جلالین ص:۳۸۴)

(۱۸) ﴿ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ (پارہ:۲۶ رکوع:۱ سورۂ احقاف جلالین ص:۴۱۶)

(۱۹) ﴿ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾

(پارہ:۲۹ رکوع:۲ سورۂ ملک جلالین ص:۴۶۸)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے بشیر و نذیر (جنت اور ثواب کی خوشخبری دینے والا اور جہنم و عذاب سے ڈرانے والا) بنا کر مبعوث فرمایا اور اخیر کی دس آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صرف نذیر بن کر تشریف لائے، اس لئے کہ ان آیات میں نفی اور استثناء یا کلمہ انما کے ذریعہ نذیر ہونے میں حصر کیا گیا ہے جس سے بشیر کی نفی ہو جاتی ہے پس ان دونوں قسم کی آیتوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ پہلی نو آیتوں میں بشیر و نذیر ہونا کفار و مؤمنین دونوں کے حق میں ہے کہ

مسلمانوں کے لئے آپ بشیر بن کر اور کفار کے لئے نذیر بن کر تشریف لائے اور آخر کی دس آیتوں میں نذیر کا حصر اور بشیر کی نفی کفار کے حق میں ہے کہ آپ کفار کے حق میں فقط نذیر بن کر مبعوث ہوئے نہ کہ بشیر بن کر اور جب دونوں قسم کی آیتوں کا محمل جدا جدا ہے تو کوئی تعارض نہیں۔ (بیان القرآن ج ۹ ص: ۹۷ پ: ۲۲)

❷ نذیر کی آیات میں حصر کرنے سے بشیر کی نفی مقصود نہیں ہے بلکہ دیگر امور کی نفی مقصود ہے مثلاً آیت نمبر ۱۵ میں آپ کے مسئول عنہ ہونے کی نفی مقصود ہے کہ آپ تو صرف نذیر بن کر تشریف لائے ہیں، آپ سے یہ سوال نہیں ہوگا کہ یہ کافر لوگ ایمان کیوں نہیں لائے؟ اسی طرح آیت نمبر ۱۹ میں تعیین وقت قیامت کے علم کی نفی مقصود ہے یعنی میں تو صرف ڈرانے والا ہوں مجھے یہ معلوم نہیں کہ قیامت کب آئے گی، اس کا تعیین وقت تو حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس دیگر آیات میں سے بعض یا سب آیات میں سیاق وسباق پر نظر کر کے امر منفی کو متعین کیا جا سکتا ہے۔

(بیان القرآن ج ۹ ص: ۹۷ پارہ: ۲۲ مع زیادۃ توضیح وتشریح)

کفار دلائل کو دیکھ کر ایمان لائیں گے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۷، ۱۹

آیات

① ﴿وَاِنْ یَّرَوْا كُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا﴾ (پ ۷، ع ۸، سورۃ الانعام، آیت ۲۵)

② ﴿اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰیَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِیْنَ﴾ (پ ۱۹، ع ۵، سورۃ الشعراء، آیت ۴)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ اگر یہ کفار (آپ کی نبوت کے) تمام دلائل کو بھی دیکھ لیں تو ان پر بھی ایمان نہیں لائیں گے اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے ایک بڑی نشانی نازل کردیں تو ان کی گردنیں اس نشانی کے سامنے پست ہوجائیں (اور یہ لوگ ایمان لے آئیں)۔ پس پہلی آیت سے تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ کسی بھی دلیل پر ایمان نہیں لائیں گے اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نشانیوں پر ایمان ضرور لائیں گے لہٰذا ان دونوں قسم کی آیتوں میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے۔

دفعِ تعارض

پہلی آیت میں نفی ایمان اختیاری کی ہے اور دوسری آیت میں اثبات ایمان اضطراری کا ہے۔ یعنی یہ لوگ تمام دلائل کو دیکھ کر بھی اپنے اختیار سے ایمان نہیں لائیں گے حالانکہ شریعت میں ایمان اختیاری ہی مطلوب ہوتا ہے لیکن اگر ہم چاہیں تو ایسی

نشانی نازل کردیں کہ ان کو اضطراراً اور مجبوراً ایمان لانا پڑے گا مگر ایمان اضطراری شریعت میں معتبر نہیں ہے اس لئے ایسی نشانی نازل نہیں کی جاتی، پس جس چیز کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں اور جس چیز کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں ہے اور ایسی صورت میں کوئی تعارض نہیں ہوتا ہے۔ (بیان القرآن پارہ: ۷ ج ۳، ص ۸۶)

حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام سے اکل من الشجرۃ کا صدور عمداً ہوا یا نسیاناً؟

پارۂ مطابق: ۸، ۱۶

آیات

① ﴿وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ﴾ (پارہ: ۸، رکوع: ۹، سورۂ اعراف، جلالین ص: ۱۳۰)

② ﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾
(پارہ: ۱۶، رکوع: ۱۵، سورۂ طٰہٰ، جلالین ص: ۲۶۸)

تشریحِ تعارض

آیت اولیٰ میں ہے کہ ابلیس نے اکل من الشجرۃ سے متعلق حق تعالیٰ کی طرف سے کی جانے والی ممانعت اور نہی حضرت آدم علیہ السلام کو یاد دلا دی تھی اور اس نہی کی ایک جھوٹی حکمت اپنی جانب سے گھڑ کر بیان کر دی تھی، چنانچہ اس نے یہ کہا تھا کہ حق تعالیٰ نے جو تم کو اکل من الشجرۃ سے منع فرمایا ہے وہ صرف اس لئے کہ کہیں تم اس کو کھا کر فرشتہ صفت نہ بن جاؤ، یا کہیں تم کو خلود فی الجنۃ نصیب نہ ہو جائے، کیونکہ اس درخت کا خاصہ یہ ہے کہ جو اس کا پھل کھا لیتا ہے وہ فرشتہ صفت بن جاتا ہے اور ہمیشہ جنت میں رہنا اس کو نصیب ہو جاتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اس نہی کے یاد ہوتے ہوئے قصداً و عمداً اس درخت کا پھل کھایا تھا نسیاناً نہیں، اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فعل کا صدور ان سے نسیاناً ہوا تھا عمداً نہیں کیونکہ آیت ثانیہ میں فنسی فرمایا گیا ہے، اس لئے بظاہر

ان دونوں آیتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ جس وقت ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکایا اور نہی یاد دلا کر اپنی طرف سے اس کی حکمت بیان کی۔ اس وقت حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی بات کی بالکل تصدیق نہیں کی اور اس فعل کا قطعاً ارتکاب نہیں کیا کیونکہ اس وقت تو ان کو نہی یاد تھی، اللہ کی طرف سے صریح ممانعت کے ذہن میں ہوتے ہوئے شیطان کے بہکانے سے حضرت آدم علیہ السلام اس فعل کا ارتکاب کیسے کر سکتے تھے؟ ہاں ایک مدت گزر جانے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام اس نہی کو بھول گئے، قطعاً یاد نہیں رہا کہ اللہ نے اکل من الشجرۃ سے منع فرمایا ہے۔ البتہ شیطان کی وہ بیان کردہ حکمت یاد رہی کہ اس کے کھانے سے آدمی فرشتہ صفت بن جاتا ہے اور ہمیشہ جنت میں رہنا نصیب ہو جاتا ہے تو حضرت آدم علیہ السلام نے فرشتہ صفت بن جانے اور خلود فی الجنۃ کے شوق میں نسیاناً اس درخت سے تناول فرما لیا، پس تذکر اور نسیان کا زمانہ مختلف ہے۔ تذکر تو صدور فعل سے بہت پہلے تھا اور نسیان ایک مدت کے بعد صدور فعل کے وقت ہوا۔ ولا تعارض بعد اختلاف الازمنۃ۔

(ملخص من شیخ زادہ ج ۱ ص ۲۰۸)

انسان و جنات کو عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے یا ترکِ عبادت کے لئے؟

پارہ نمبر ۹، ۲۷

آیات

① ﴿وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ﴾

(پارہ: ۹ رکوع: ۱۳ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۴۵)

② ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۳ سورۂ ذاریات جلالین ص: ۴۳۳)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ ہم نے بہت سے جن و انسان کو جہنم کے لئے پیدا کیا ہے اور دخولِ جہنم کا سبب ترکِ عبادت ہے، پس اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے بہت سوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ عبادت نہ کریں اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کو عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے، پس دونوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

آیتِ اولیٰ میں تخلیق کے مقصدِ تکوینی کا بیان ہے اور آیتِ ثانیہ میں مقصدِ تشریعی کا ذکر ہے، یعنی تمام جن و انس کی تخلیق کا تشریعی مقصد تو یہی ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں لیکن ان حکمتوں اور مصلحتوں کی وجہ سے جن کو حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں بہت سے جن و انس کی پیدائش کی تکوینی غایت یہ ہے کہ وہ عبادت نہ کریں اور جہنم میں داخل ہوں، پس جب دونوں مقصدوں کی نوعیت جدا جدا ہے تو کوئی تعارض نہیں۔

(بیان القرآن ۲/۵۴، پارہ ۹، مع تشریح)

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں نہ جانے کی اجازت طلب کرتے تھے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱۰، ۱۸

آیات

① ﴿لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ﴾ (پارہ: ۱۰، رکوع: ۱۳، سورۂ توبہ، جلالین ص: ۱۶۰) ✦

② ﴿وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَمْ يَذْهَبُوا حَتّٰى يَسْتَأْذِنُوهُ﴾ (پارہ ۱۸، رکوع: ۱۵، سورۂ نور، جلالین ص ۳۰۲)

تشریحِ تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ لوگ اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے کے بارے میں (جہاد میں شریک نہ ہونے کے بارے میں) کبھی آپ سے اجازت طلب نہیں کرتے۔ اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ یہ لوگ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی ایسے کام پر ہوتے ہیں جس کے لئے ان کو جمع کیا گیا ہے (جیسے جہاد،[1] صلوۃ جمعہ، صلوۃ عیدین وغیرہ) تو وہاں سے نکل جائے یہاں تک کہ آپ سے اجازت لے لیتے ہیں، اجازت لے کر چلے جاتے ہیں، پس آیت اولیٰ میں تو جہاد میں عدم شرکت کی اجازت طلب کرنے کی

(۱) جہاد: الکی زیدؒ رحمہ اللہ تعالیٰ نے امر جامع کی تفسیر جہاد کے ساتھ اور ابن جبیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے جہاد، صلوۃ جمعہ اور عیدین کے ساتھ کی ہے۔ (روح المعانی ۱۸/۲۲۳)

نفی کی گئی ہے اور آیت ثانیہ میں اجازت کا اثبات ہے جس سے ان دونوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ میں جو استیذان کی نفی ہے وہ استیذان بلا عذر ہے اور آیت نمبر ۲ میں جو استیذان کا اثبات ہے وہ بالعذر کا ہے، مطلب یہ ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بلا عذر تو کبھی جہاد میں عدم شرکت کی اجازت نہیں لیتے ہیں، البتہ اگر کوئی عذر ہوتا ہے تو اجازت لے کر جہاد وغیرہ کی مجلس سے چلے جاتے ہیں، جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں، جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں۔ فلا تعارض۔

(بیان القرآن ج ۳ ص ۱۰۴، پ ۱۰)

❷ پہلی آیت میں جو استیذان کی نفی ہے وہ جہاد میں بالکل نہ جانے کے بارے میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی اجازت کبھی نہیں لیتے تھے کہ ہم جہاد میں بالکل نہ جائیں، اور آیت ثانیہ میں جو استیذان کا اثبات ہے دراصل اس کی صورت یہ ہے کہ جہاد وغیرہ کے لئے مشورہ کی مجلس سے کبھی اتفاقاً کسی ضرورت کی وجہ سے اجازت لے کر چلے جاتے تھے، یہ مطلب نہیں کہ جہاد میں بالکل عدم شرکت کی اجازت لے لیا کرتے تھے، پس استیذان منفی اور استیذان مثبت دونوں کی نوعیت الگ الگ ہے۔ فلا تعارض۔ (بیان القرآن پ ۱۸، ج ۸ ص ۲۹)

مشاہدۂ عذاب کے بعد ایمان لانا نافع ہوتا ہے یا نہیں؟

پارہ ۱۱، ۲۴

آیات

(۱) ﴿فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَاۤ اِيْمَانُهَاۤ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۚ لَمَّاۤ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ﴾ (پ۱۱، سورۂ یونس: ۹۸)

(۲) ﴿فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ﴾ (پ۲۴، سورۂ مؤمن: ۸۵)

تشریحِ تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ عذابِ الٰہی کے مشاہدہ کے بعد ایمان لانا کسی بستی کے لئے نافع نہیں ہوا سوائے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے کہ عذاب کے آثار دیکھ کر وہ لوگ ایمان لائے تھے اور ان کا ایمان معتبر اور نافع ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو مشاہدۂ عذاب کے بعد بھی ایمان لانے سے نفع ہوتا ہے اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو ان کو ان کا یہ ایمان لانا نافع نہیں ہوا۔ اللہ نے اپنا یہی معمول مقرر کیا ہے جو اس کے بندوں میں پہلے سے ہوتا چلا آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشاہدہ عذاب کے بعد ایمان لانا کسی کو بھی نافع نہیں ہوتا۔ پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ پہلی آیت میں جو ایمان کے نافع ہونے کا ذکر ہے وہ عذاب کے آثار ابتدائیہ کے مشاہدہ کرنے کے حالت میں ہے کہ اگر کوئی شخص ملائکہ عذاب و آخرت کی ہولناکیوں کا مشاہدہ کرنے سے قبل محض عذاب کے آثار ابتدائیہ کو دیکھ کر ایمان لے آئے تو اس کا ایمان معتبر اور نافع ہو جاتا ہے اور دوسری آیت میں جو ایمان کے نافع ہونے کی نفی ہے وہ ملائکہ عذاب اور اہوال آخرت کے مشاہدہ کے بعد ہے کہ اس کی صورت میں ایمان لانا مقبول اور نافع نہیں ہوتا۔ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم عذاب کے ابتدائی آثار کو دیکھ کر ہی ایمان لے آئی تھی اس لئے اس قوم کا ایمان نافع اور معتبر ہوا تھا۔ پس جب دونوں آیتیں علیحدہ علیحدہ صورت پر محمول ہیں تو کوئی تعارض نہیں۔

(ماخوذ من بیان القرآن ص: ۳۱تا۳۲ ج: ۵ پارہ ۱۰)

❷ اللہ تعالیٰ کا قانون تو یہی ہے کہ مشاہدۂ عذاب کے بعد کسی کا ایمان نافع نہیں ہوتا مگر بعض لوگ قانون سے مستثنیٰ ہوتے ہیں، حضرت یونس علیہ السلام کی قوم اس قانون سے مستثنیٰ اور مخصوص تھی اس لئے ان کا ایمان لانا مشاہدۂ عذاب کے بعد بھی نافع اور معتبر ہو گیا، پس اس چیز کو حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی خصوصیات میں سے شمار کیا جائے گا۔ ولا تعارض بعد الاستثناء والخصوصیۃ۔

(ماخوذ من بیان القرآن ج: ۵ ص ۳۱ پارہ ۱۰)

وحی سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کو اقوامِ سابقہ کے واقعات کا علم تھا یا نہیں؟

پارہ نمبر ۱۲، ۱۳

آیات

① ﴿تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا﴾ (پارہ:۱۲ رکوع:۴ سورۂ ہود جلالین ص:۱۸۴)

② ﴿لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (پارہ:۱۳ رکوع:۱۳ سورۂ ابراہیم جلالین ص:۲۰۶) ◆

③ ﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ﴾ (پارہ:۱۳ رکوع:۱۳ سورۂ ابراہیم جلالین ص:۲۰۶)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ یہ واقعہ (حضرت نوح علیہ السلام کا جو اوپر مذکور ہوا ہے) غیب کی خبروں میں سے ہے جس کو ہم وحی کے ذریعہ آپ تک پہنچا دیتے ہیں، وحی سے قبل نہ تو آپ کو اس کا علم تھا اور نہ آپ کی قوم کو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل الوحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کی قوم یعنی کفارِ مکہ کو اقوامِ سابقہ کے واقعات کا علم نہیں تھا، اسی طرح دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ ان لوگوں کے حالات و واقعات کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ اور آپ کی قوم کے لوگ اقوامِ سابقہ کے واقعات سے بے خبر تھے اور تیسری آیت میں ارشاد ہے کہ کیا تمہارے پاس (اے کفارِ مکہ) ان لوگوں کو خبر نہیں آئی جو تم سے پہلے گزرے ہیں، یعنی قومِ نوح اور عاد اور ثمود اور ان لوگوں کی خبر جو ان کے بعد ہوئے ہیں۔

آیت میں استفہام انکاری ہے جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ اقوام سابقہ کی خبریں تمہارے پاس آئی ہیں تم کو ان کے واقعات کا علم ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی سے پہلے ہی کفار مکہ اقوام سابقہ کے واقعات کو جانتے تھے، پس یہ آیت پہلی دونوں آیتوں کے بظاہر معارض ہے کہ پہلی دو آیتوں میں علم کی نفی ہے اور تیسری آیت میں علم کا اثبات ہے۔

دفع تعارض

پہلی دو آیتوں میں جو علم کی نفی ہے اس سے مراد علم تفصیلی ہے اور تیسری آیت میں جو اثبات ہے وہ علم اجمالی کا ہے، مطلب یہ ہے کہ اقوام سابقہ کے حالات و واقعات اجمالی طور پر تو تم کو وحی سے قبل بھی معلوم تھے مگر واقعات کی تفصیل وحی سے قبل تم نہیں جانتے تھے۔ تفصیلی واقعات حق تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا، اللہ تعالیٰ ہی نے تم کو وحی کے ذریعہ ان واقعات سے باخبر کیا ہے، پس اثبات علم اجمالی کا ہے اور نفی علم تفصیلی کی، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔

(ماخوذ از تبیان القرآن ج ۶ ص ۳، پارہ: ۱۲ سورۃ ہود آیت ۴۹)

ہر امت کے لئے رسول آیا ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱۴، ۲۰، ۲۱، ۲۲

آیات

① ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ﴾

(پارہ: ۱۴، رکوع: ۱۱، سورۂ نحل جلالین ص: ۲۱۸)

② ﴿وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ﴾

(پارہ: ۲۲، رکوع: ۱۵، سورۂ فاطر جلالین ص: ۳۶۶)

③ ﴿لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَاهُمْ مِّنْ نَّذِيرٍ مِّنْ قَبْلِكَ﴾

(پارہ: ۲۰، رکوع: ۸، سورۂ قصص جلالین: ۳۳۶)

④ ﴿لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَاهُمْ مِّنْ نَّذِيرٍ مِّنْ قَبْلِكَ﴾

(پارہ: ۲۱، رکوع: ۱۴، سورۂ الم سجدہ جلالین ص: ۳۴۹)

⑤ ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيرٍ﴾ (پارہ ۲۲، رکوع: ۱۱، سورۂ سبا جلالین ص: ۳۶۲)

تشریح تعارض

پہلی دو آیتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ہر امت میں ایک رسول مبعوث فرمایا ہے اور آیت ۳ و ۴ و ۵ میں ارشاد ہے کہ آپ ایسی قوم کو ڈرانے والے ہیں جن میں آپ سے قبل کوئی ڈرانے والا رسول نہیں آیا۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اقوام ایسی بھی ہیں جن میں کوئی رسول مبعوث نہیں ہوا، پس دونوں قسم کی آیات میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

● آیت اولیٰ میں لفظ کل تکثیر کے لئے ہے یعنی ہم نے اکثر امتوں میں اپنے رسولوں کو بھیجا ہے، پس بعض اقوام و امم میں رسول کا مبعوث نہ ہونا اس کے معارض نہیں ہے۔[1] (بیان القرآن پارہ ۲۲ ج ۱۰ ص ۳۴)

● یہی دونوں آیتیں ہیں سے براہِ راست عمل رسول کا مبعوث ہونا جو سمجھ میں آ رہا ہے وہ اوائل زمانہ کے اعتبار سے ہے اور اخیر کی تین آیات سے جو بعض اقوام میں رسول کا نہ آنا معلوم ہوتا ہے، وہ اواخر کے اعتبار سے ہے یعنی براہِ راست کے ابتدائی زمانہ میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور آیا ہے، البتہ بعض اوقات اس کی شریعت کا سلسلہ اخیر تک باقی نہیں رہا جیسے قوم عرب کے ابتدائی دور میں حضرت اسماعیل علیہ السلام مبعوث ہوئے مگر ان کی شریعت عرب میں اخیر تک باقی نہیں رہی یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ (بیان القرآن پارہ ۲۲ ج ۱۰ ص ۱۵۵ مع زیادۃ توضیح)

---

(۱) آیت ثانیہ کو بھی اکثر و غلبہ پر محمول کر لیا جائے گا۔

جنت کی حوروں کا رنگ سفید مائل بزردی ہے یا سرخ مائل بسفیدی؟

پارہ نمبر: ۲۳، ۲۷

آیات

① ﴿ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴾ (پارہ: ۲۳ رکوع: ٦ سورۂ صافات جلالین ص: ۳۷۵)

② ﴿ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۱۳ سورۂ رحمن جلالین ص: ۴۴۵)

تشریحِ تعارض

آیت اول میں جنت کی حوروں کو رنگت اور صفائی نیز شفافیت میں چھپے ہوئے انڈوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح انڈوں کا رنگ سفید مائل بزردی و چمکدار اور پرندے کے پروں میں چھپے ہوئے ہونے کی وجہ سے صاف شفاف ہوتا ہے کہ نہ تو گرد و غبار ان تک پہنچتا ہے اور نہ کسی کا ہاتھ ان پر لگتا ہے جس سے کچھ میلا پن آ جائے ایسے ہی جنت کی حوروں کا رنگ سفید مائل بزردی، چمکدار اور صاف شفاف ہے، بہت زیادہ خالص سفید رنگ کے ساتھ ہلکے زرد رنگ کی ملاوٹ والا رنگ عورتوں میں بڑا مرغوب اور پسندیدہ نظر ہوتا ہے، بہرحال اس آیت سے معلوم ہوا کہ جنت کی حوروں کا رنگ سفید مائل بزردی ہے اور آیت ثانیہ میں حوروں کو یاقوت اور مرجان کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، یاقوت سرخ رنگ کا قیمتی موتی ہوتا ہے اور مرجان سفید رنگ کے چھوٹے چھوٹے موتیوں کو کہا جاتا ہے، یاقوت و مرجان دونوں کے ساتھ تشبیہ دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ حوروں کا رنگ سرخ و سفید ہے، لہٰذا ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت میں حوروں کا رنگ زرد و سفید اور

دوسری آیت میں سرخ وسفید بتایا گیا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے پانچ جوابات ہیں:

❶ آیت اولیٰ میں انڈوں کے ساتھ تشبیہ رنگ میں نہیں ہے بلکہ نعومت وطراوت یعنی ملائم اور تروتازہ ہونے میں ہے اور انڈے سے مراد پکایا ہوا اور ابالا ہوا انڈا ہے، ابالے جانے کے بعد چھلکے کے اندر جو چھپا ہوا انڈا ہوتا ہے بڑا نرم و نازک ملائم اور تروتازہ ہوتا ہے جس کا مشاہدہ چھلکا اتارنے کے بعد ہوتا ہے، اسی لئے عوام الناس عورت کی تعریف کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ فلاں عورت تو چھلے ہوئے انڈے کی مانند ہے، ایسے ہی جنت کی حوروں کے ابدان واجسام نہایت ہی نرم و نازک ملائم اور شاداب ہوں گے، اس کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے ہوتی ہے "عن ابن عباس رضی الله عنهما قال: ان البيض المكنون ما تحت القشر الصلب بينه وبين اللباب الاصفر"[1] کہ بیض مکنون سے مراد انڈے کا وہ حصہ ہے جو سخت چھلکے کے نیچے زردی کے درمیان ہے۔ اب کوئی تعارض نہیں کیونکہ آیت اولیٰ میں تشبیہ نعومت وطراوت میں ہے نہ کہ رنگت میں اور آیت ثانیہ میں رنگ میں تشبیہ ہے، جس سے معلوم یہ ہوا کہ حوریں جسم کے اعتبار سے تو نہایت نرم و نازک اور تروتازہ وشاداب ہوں گی، اور رنگ کے اعتبار سے سفید مائل بسرخی ہوں گی، یعنی گلابی رنگ ہوگا، عورتوں میں گلابی رنگ بھی بڑا مرغوب وپسندیدہ ہوتا ہے۔

(روح المعانی ۹۰/۲۳)

❷ پہلی آیت میں انڈوں کے ساتھ تشبیہ تناسب اعضاء میں ہے نہ کہ رنگت میں، انڈا تناسب اجزاء میں مشہور اور ضرب المثل ہوتا ہے، تشبیہ کا مطلب یہ ہے کہ جس

---

(۱) رواه ابن المنذر عن ابن عباس رضی الله تعالى عنه وابن ابی حاتم وابن جرير عن الامام السدی۔ (روح المعانی ۹۰/۲۳)

طرح انداز متناسب الاجزاء ہوتا ہے اسی طرح جنت کی حوریں بھی متناسب الاعضاء ہیں اور تناسب اعضاء نہایت ممدوح اور مرغوب چیز ہے حتیٰ کہ حسن کا مدار ہی تناسب اعضاء پر ہے، پس جب آیت اولیٰ میں تشبیہ رنگت کے اعتبار سے ہے ہی نہیں تو اس کا دوسری آیت سے کوئی تعارض نہیں کیونکہ دونوں آیتوں کے مجموعہ سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ حوروں کا جسم متناسب[1] الاعضاء اور رنگ سفید مائل بسرخی ہے۔ فلا تعارض بینھما۔ (روح المعانی ۲۳/۱۰۰)

۳ یا یوں کہا جائے کہ آیت ثانیہ میں یاقوت و مرجان کے ساتھ تشبیہ رنگت میں نہیں ہے بلکہ یاقوت کے ساتھ تشبیہ صفائی کے اعتبار سے ہے اور مرجان کے ساتھ چکناہٹ اور خوبصورتی کے اعتبار سے ہے کہ جس طرح یاقوت موتی صاف و شفاف اور مرجان موتی چکنا اور خوبصورت ہوتا ہے اسی طرح حوریں صاف شفاف چکنی اور خوبصورت ہیں، پس کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ آیت اولیٰ میں تشبیہ بیض مکنون کے ساتھ رنگت میں ہوئی اور دوسری آیت میں یاقوت و مرجان کے ساتھ تشبیہ صفائی وشفافیت اور ملاست و جمال میں ہوئی، جس سے معلوم ہوا کہ جنت کی حوریں سفید مائل بزردی، صاف وشفاف چکنی اور خوبصورت ہیں۔ (روح المعانی ۲۳/۱۰۰)

۴ تشبیہ تو دونوں آیتوں میں رنگ ہی میں ہے مگر یہ اختلاف اشخاص پر محمول ہے مطلب یہ ہے کہ بعض حوروں کا رنگ تو سفید مائل بزردی ہے، ان کو بیض مکنون کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور بعض کا رنگ سفید مائل بسرخی ہے، ان کو یاقوت و مرجان کے ساتھ تشبیہ دی گئی اور عورتوں کے دونوں قسم کے رنگ ہی مرغوب اور حسین ہوتے ہیں، یہ کہنا کہ سب سے اچھا رنگ سفید مائل بزردی ہی ہوتا ہے درست نہیں ہے کیونکہ

(۱) مگر تناسب اعضاء والی تشبیہ کی صورت میں مکنون کی قید بے فائدہ ہو کر رہ جاتی ہے اس قید کا تشبیہ میں کوئی دخل نہیں رہتا، کیونکہ انڈا تو ہر حال میں متناسب الاجزاء ہے خواہ مکنون ہو یا غیر مکنون، اس لئے یہ توجیہ کمزور ہے۔ (روح المعانی ۲۳/۱۰۰)

اصلیت تو لوگوں کی طبیعتوں اور مزاجوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے، کسی کو سفید مائل بزردی رنگ پسند ہوتا ہے کسی کو سفید مائل بسرخی، غرض کہ جنت میں اہل جنت کو ان کی پسند اور خواہش کے مطابق حوریں ملیں گی۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

"وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ" بہر حال جب دونوں آیتوں میں حوروں کا مصداق جدا جدا ہے تو تعارض نہیں ہے۔

(روح المعانی ۲۳/۹۰)

٥ یا یوں کہا جائے کہ چہروں کا رنگ تو یاقوت و مرجان کی طرح سفید مائل بسرخی یعنی گلابی ہے اور باقی بدن کا رنگ بیض مکنون کی طرح سفید مائل بزردی ہے، پس دوسری آیت تو چہرہ کی رنگت کے بیان پر محمول ہے اور پہلی آیت میں باقی بدن کی رنگت کا بیان ہے اس لئے کوئی تعارض نہیں۔ (روح المعانی ۲۳/۹۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ضلال کی نفی اور اثبات

پارہ نمبر: ۲۷، ۳۰

آیات

① ﴿مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى﴾ (پارہ: ۲۷، رکوع: ۵، سورۂ نجم، جلالین ص: ۴۳۷) ◆

② ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾ (پارہ: ۳۰، رکوع: ۱۸، سورۂ والضحیٰ، جلالین ص: ۵۰۲)

تشریحِ تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ تمہارے ساتھی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نہ تو ضلال کے ساتھ متصف ہیں اور نہ غوایت[1] کے ساتھ، یعنی نہ تو راہِ حق سے بھٹکے اور نہ غلط راستے پر چل دیئے۔ اور آیت ثانیہ میں ارشاد ہے کہ اللہ نے آپ کو ضال پایا، پس آپ کی رہنمائی فرمائی، یعنی آپ ضلال کے ساتھ متصف تھے اللہ نے آپ کو ہدایت عطا فرمائی، پس پہلی آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ضلال کی نفی ہے اور آیت ثانیہ میں اس کا اثبات ہے، اس لئے ان دونوں میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

① ضلال کی دو قسمیں ہیں ایک عدول عن الطریق بعد العلم، یعنی جاننے کے بعد راستے سے ہٹ جانا، جس کو گمراہی اور کفر سے تعبیر کیا جاتا ہے، دوسرے عدول

(۱) ضلال اور غوایت میں فرق یہ ہے کہ ضلال تو اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص بالکل راستہ بھول کر گم ہو جائے اور غوایت یہ ہے کہ غیر راہ کو راہ سمجھ کر چلتا رہے کما فی الکشاف، بیان القرآن ص: ۲۰ ج: ۱۱

عن الطریق "قبل العلم یعنی جاننے سے قبل راستہ سے ہٹا ہوا ہونا جس کو ناواقفیت اور بے خبری سے تعبیر کیا جاتا ہے، آیت اولیٰ میں جو نفی ہے وہ قسم اول کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم علم اور وحی کے آجانے کے بعد پھر راہ حق سے ہٹ گئے ہوں (العیاذ باللہ) ہرگز کبھی ایسا نہیں ہوا اور آیت ثانیہ میں جو ضلال کا اثبات ہے وہ قسم ثانی کا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی سے قبل شرائع واحکام سے ناواقف اور بے خبر تھے، حق تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ آپ کو باخبر کیا جیسا کہ حق تعالیٰ نے ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے "مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتَابُ وَلَا الْاِيْمَانُ"[1] اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ آپ وحی سے قبل نہ تو کتاب (قرآن) کو جانتے تھے کہ وہ کیا چیز ہے اور نہ ہی ایمان کی تفاصیل اور اس کے شرائع واحکام سے واقف تھے ایک اور جگہ ارشاد ہے "وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغَافِلِيْنَ" اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ آپ وحی سے قبل شرائع دین سے بے خبر اور ناواقف تھے، اور وحی سے قبل شرائع واحکام سے ناواقف ہونا یہ کوئی نقص اور عیب نہیں ہے۔[2] بہر حال جب دونوں آیتوں میں ضلال کی علیحدہ علیحدہ قسم مراد ہے تو کوئی تعارض نہیں۔

(ماخوذ من معارف القرآن ۸/۷۹ و روح المعانی ۳۰/۱۶۲)

۲ دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت ثانیہ میں ضلال سے مراد راہ حق سے گمراہ ہو جانا نہیں بلکہ کہیں سفر وغیرہ میں جاتے ہوئے راستہ بھول جانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ایک بار سفر میں راستہ بھول گئے تھے، گم ہو گئے تھے تو حق تعالیٰ نے آپ کو راستہ بتا دیا

---

(۱) ایمان سے مراد نفس ایمان نہیں ہے کیونکہ ہر نبی وحی سے قبل بھی نفس ایمان سے واقف اور اس کے ساتھ متصف ہوتا ہے بلکہ مراد شرائع ایمان ہے جن کا علم بغیر وحی کے محض عقل کے ذریعہ نہیں ہو سکتا ہے کما قال الامام محی السنۃ البغوی رحمہ اللہ تعالیٰ۔ (روح المعانی ۲۵/۵۸)

(۲) ضلال کی جو یہ تفسیر کی گئی ہے کہ وحی سے قبل شرائع ایمان سے ناواقف مراد ہے یہی امام رازی اور اکثر مفسرین نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے، امام زجاج بھی اسی تفسیر کو اختیار کرتے ہیں۔ (روح المعانی ۳۰/۱۶۲)

تھا، چنانچہ حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ ملک شام کا سفر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک اونٹنی پر سوار تھے، اندھیری رات تھی، آپ کو نیند آ رہی تھی، ابلیس لعین آیا اور آپ کی اونٹنی کی نکیل پکڑ کر اس کو صحیح راستے سے ہٹا کر دوسرے راستے پر کر دیا، اس طرح آپ قافلہ سے بچھڑ گئے، فوراً حضرت جبرئیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور ابلیس پر ایک زور کی پھونک ماری جس سے وہ کمبخت حبشہ میں جا کر گرا اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صحیح راستے سے قافلہ تک پہنچا دیا، ایک اور روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بچپن میں مکہ کی گھاٹیوں میں راستہ بھول جانے کی وجہ سے گم ہو گئے اور دادا جان سے جدا ہو گئے، ابوجہل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ راستہ بھول گئے اور بکریوں سے علیحدہ ہو گئے ہیں، اس نے آپ کو آپ کے دادا جان کے پاس پہنچا دیا، دادا جان اس وقت کعبہ کے پردوں کو پکڑ کر نہایت تضرع و زاری کے ساتھ اللہ سے دعا کر رہے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے پاس واپس پہنچا دے۔ ابوجہل نے ان سے بیان کیا کہ جب میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پیچھے سوار کرنے کے لئے اپنی اونٹنی کو بٹھایا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پیچھے سوار کیا اور اونٹنی کو اٹھایا تو اونٹنی اٹھی نہیں، پھر آپ کو آگے سوار کیا تو اونٹنی فوراً اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی "یا احمق هو الامام فكيف يقوم خلف المقتدي؟" اے بیوقوف! یہ بچہ تو امام ہے یہ مقتدی کے پیچھے کیسے رہ سکتا ہے؟ اس قسم کے اور بھی واقعات روح القرآن روح المعانی میں مذکور ہیں، بہرحال اس تفسیر پر آیت ثانیہ میں ضلال سے مراد راستہ بھول جانا ہے، دین حق سے گمراہ ہونا نہیں ہے لہٰذا آیت اولیٰ میں نفی ہے ضلال بمعنی دین حق سے گمراہ ہو جانے کی اور آیت ثانیہ میں اثبات ہے ضلال بمعنی راستہ بھول جانے کا۔ فلا تعارض بینهما۔ (روح المعانی ۳۰/۱۶۳)

ولقد وقع الفراغ من تسويد هذه الاوراق بحمدالله وفضله بعد صلوة الظهر من يوم الخميس في الثامن من شهر جمادي الاخرة سنة احدى عشرة بعد الالف واربع مائة من الهجرة النبوية على صاحبها الف الف تسليم وتحية الموافق السابع والعشرين من شهر دسمبر سنة تسعين بعد الالف وتسع مائة من المسيحية.

وقد شرعت فيه يوم الاحد في التاسع والعشرين من شهر ربيع الاخر سنة احدى عشرة بعد الالف واربع مائة من الهجرة النبوية الموافق الثامن عشر من شهر نونمبر سنة تسعين بعد الالف وتسع مائة من المسيحية.

فتم وكمل هذا المجموع في مدة قد رميعاد التكليم اى اربعين يوما بعون الله وتوفيقه جعله الله سبحانه وتعالى نافعا للناظرين من الطلبة والمدرسين وغير هم من علماء الدين الطالبين دفع التعارض بين آيات القرآن المبين.

يارب تقبله مني بقبول حسن واجعله لي وسيلة الى التجاوز المغفرة وسببًا لرضوانك ورحمتك يا ارحم الراحمين. آمين يا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ.

احقر العباد

محمد انور گنگوہی مظاہری

خادم الحدیث والتفسیر

جامعہ اشرف العلوم گنگوہ ضلع سہارنپور (یوپی)

۸؍جمادی الآخرہ ۱۴۱۱ھ یوم پنجشنبہ

اعتذار

بندہ اپنی تقصیر و کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ اگر تعارض کے کسی مضمون سے متعلق کوئی آیت ایسی نظر آئے جو احاطہ شمار میں نہ آئی ہو تو اس کو اسی مضمون کے تحت مذکورہ آیات کے ساتھ لاحق فرمالیں، نیز اگر تعارض کا کوئی مضمون سرے ہی سے کتاب میں آنے سے رہ گیا ہو تو نقص فی التتبع پر محمول فرمائیں۔ اور اس اشاعت میں ضمیمہ کے بھی ۱۹ مضامین شامل کردیے گئے ہیں جس کے ساتھ کتاب کے کل مضامین ۱۲۵ ہوگئے ہیں۔

سبحانك لا علم لنا إلا ما علمتنا إنك أنت العليم الحكيم.

وتب علينا إنك أنت التواب الرحيم.

مؤلف

محمد انور عفا اللہ عنہ

وہ کتب جن سے اصل کتاب کی تالیف میں استفادہ کیا گیا

قرآن کریم

اسمائے کتب	مؤلفین کرام	تاریخ وفات
(۱) الاتقان فی علوم القرآن	علامہ جلال الدین سیوطیؒ	۹۱۱ھ
(۲) امداد الفتاوٰی	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ...	۱۳۶۲ھ
(۳) بیان القرآن	ایضاً	ایضاً
(۴) بیضاوی شریف	علامہ ناصر الدین عبد اللہ بیضاویؒ	۶۹۲ھ
(۵) تحفۂ اثنا عشریہ	شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ	۱۲۳۹ھ
(۶) تفسیر ابن کثیر	علامہ ابو الفداء اسماعیل بن عمرؒ	۷۷۴ھ
(۷) تفسیر ابو السعود	محمد بن محمد العمادیؒ	۹۵۱ھ
(۸) تفسیر خازن	علامہ علی بن محمد بن ابراہیم الخازنؒ	۷۲۵ھ
(۹) تفسیر قرطبی	امام ابو عبد اللہ محمد بن احمدؒ	۶۷۱ھ
(۱۰) تفسیر کبیر	امام ابو عبد اللہ محمد بن عمر رازیؒ	۶۰۶ھ
(۱۱) تفسیر کشاف	علامہ جار اللہ محمود بن عمر زمخشریؒ	۵۳۸ھ
(۱۲) تفسیر مدارک	علامہ عبد اللہ بن احمد النسفیؒ	۷۱۰ھ
(۱۳) تفسیر مظہری	علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ	۱۲۲۵ھ
(۱۴) جلالین شریف	علامہ جلال الدین محلیؒ و سیوطیؒ	۹۱۱ھ
(۱۵) جمل علی الجلالین	سلیمان بن عمر العجیلی الشافعیؒ	۱۲۰۴ھ
(۱۶) روح المعانی	علامہ ابو الفضل سید محمود آلوسی بغدادیؒ ...	۱۲۷۰ھ
(۱۷) روشن تفسیر	علامہ محمد حنیف گنگوہی مدظلہ العالی	

(۱۸) شیخ زادہ .... علامہ محمد بن مصلح الدینؒ ۹۵۱ھ

(۱۹) صاوی علی الجلالین ..... علامہ احمد بن محمد صاویؒ ۱۲۴۱ھ

(۲۰) الفوز الکبیر .... شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ۱۱۹۱ھ

(۲۱) مصباح اللغات ...... علامہ عبدالحفیظ بلیاویؒ ....

(۲۲) معارف القرآن ...... مفتی اعظم محمد شفیع صاحبؒ ۱۳۹۶ھ

(۲۳) النبراس .... علامہ عبدالعزیز بن احمدؒ .... ۱۲۳۰ھ تا

جدید نظر ثانی شدہ ایڈیشن

اگر تم اللہ تبارک و تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کرسکتے۔ (القرآن)

اللہ تبارک و تعالیٰ کی نعمتیں اور اُن کا شکر

تالیف

حضرت مولانا عبد العزیز صاحب دامت برکاتہم

زمزم پبلشرز

نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی

فون ۷۷۲۵۹۷۳

مقبول دعاؤں کے بارے میں احادیث شریف کا نادر مجموعہ

آدابِ دعا اور قبولیت کے اوقات و مقامات

ترجمہ

سہام الاصابۃ فی الدعوات المجابۃ

تالیف

حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ
المتوفی سنۃ ۹۱۱ ہجریۃ

ترجمہ و تشریح
مولوی سعد محمد راشد مدنی
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی نمبر ۱۴

زمزم پبلشرز

قرآن کریم اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں

دخولِ جنت کے تئیس اسباب

تالیف

نصیب الرحمٰن علوی

فاضل جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

خطیب مسجد عمر ہڈرسفیلڈ یارکشائر انگلینڈ

زمزم پبلشرز

نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی

فون ۷۷۲۵۹۴۳

جدید نظر ثانی شدہ ایڈیشن

اخلاقِ سلف

اُردو ترجمہ

تَنْبِیْہُ الْمُغْتَرِّیْن

للقطب الربانی ابی المواھب الشیخ عبدالوہاب بن احمد الشعرانی رحمۃ اللہ

ترجمہ و تلخیص

حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی رحمۃ اللہ

کتاب کی نمایاں خصوصیات

مناقب صالحین کے روح پرور واقعات کا ذخیرہ
نیکی کا راستہ تلاش کرنے والوں کیلئے بہترین زادِ راہ
خدا تعالیٰ کی محبت کے حصول کے آسان طریقوں کا انتخاب
نفس و شیطان کے مکر سے بچنے کی مفید تدابیر
معاملات و معاشرت سے متعلق زریں اصول
دل کی سختی کو دور کرنے کے لئے مجرب

زمزم پبلشرز
نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی
فون ۷۷۲۵۶۷۳